بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

اکتوبر 2013

عید مبارک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

پہلی شعاع، حمد، نعت، نبیؐ کی باتیں — رضیہ جمیل 10
انوار فیروز 11
ڈاکٹر محمد افتخار الحق ارقم 11
ادارہ 12

انٹرویو
دستک بندھن، شعاع کے ساتھ — شاہین رشید 274
ایاز احمد 21
ادارہ 272

ناولٹ
دیمک زدہ محبت — صائمہ اکرم 70
مدیرے ہم سفر — رخسانہ نگار 208

افسانے
بارہ رنگوں کا سوٹ — سلویٰ علی بیٹ 54
رات کا رنگ — مصباح علی 60
کاہے کو بیاہی — صوفیہ سرور 238
در اور دیوار — ثریا انجم 248
اک لمحہ — صبیحہ اقبال 137

ناول
ایک تھی مثال — رخسانہ نگار عدنان 140
رقص بسمل — نبیلہ عزیز 36

نظمیں، غزلیں
غزل — پروین شاکر 270
غزل — عظمیٰ افتخار غزال 271
نظم — نذیر قیصر 271
غزل — انور شعود 270

مکمل ناول
محبت میں محرم — سمیرا حمید 158
محبت حبیت کی صورت — خالدہ نثار 100

مستقل سلسلے
خط آپ کے — رضیہ جمیل 27
مسکراہٹیں — صبا سحر 262
آئینہ خانے میں — تبصیر نشاط 279
بالوں سے خوشبوئے — شگفتہ جاہ 265
تاریخ کے جھروکے سے — امت الصبور 284
سیر دو جہاں — آمنہ زرین 17
مہندی کے ڈیزائن — ادارہ 282
کھلتا کسی پہ — خالدہ جیلانی 208
موسم کے پیکان — خالدہ جیلانی 287
خوبصورت بنئے — ادارہ 290

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

آئینہ ویل پبلک لائبریری
MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

اکتوبر 2013
جلد 28 شمارہ 2
قیمت 50 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اُردو بازار، کراچی۔
رضیہ جمیل فاروق حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰/بی/۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دگھیر جیلانی

اداریہ

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

خواب، خواہشیں، امیدیں، مایوسی کی دُھند میں ڈوبتی جارہی ہیں۔ ہر لمحے کے ساتھ بڑھتا عدم تحفظ کا احساس زندگی کو بے رنگ کررہا ہے۔ دو عشروں سے مقتل گاہ بنا عروس البلاد نہ جانے کتنے قیمتی انسان یہاں نامعلوم افراد کا نشانہ بن چکے ہیں اور یہ سلسلہ کہیں رُکنے میں نہیں آتا۔ جس معاشرے میں دولت اور طاقت کو اچھائی کا معیار بنالیا جائے، جہاں جبر وظلم کے سامنے سر ہی نہیں دل بھی جھکتے ہوں، وہاں خواب بھی مرجاتے ہیں اور قدرت بھی مہربان نہیں ہوتی۔ ایمان کا سب سے کمزور درجہ یہ ہے کہ ہم برائی کے خلاف احتجاج نہ کرسکیں آواز نہ اٹھاسکیں تو دل میں تو بُرا سمجھیں لیکن یہاں تو اس کے حق میں جواز دیے جاتے ہیں اور اس کارِ خیر میں میڈیا اپنے حصّے کا کام بخوبی انجام دے رہا ہے۔

صاحبِ اقتدار اور اہلِ فکر کی عاقبت نااندیشی نے اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ بیرونی دشمنوں سے زیادہ ہمیں اندرونی دشمنوں سے خطرہ ہے۔

تبدیلی آسکتی ہے۔ زندگی آسان اور خوش رنگ ہوسکتی ہے لیکن اس کے لیے شفاف ذہنوں، نفرت، کدورت کینہ، لالچ اور تعصب سے پاک دِلوں کی ضرورت ہے۔

امید کی ایک کرن نظر آتی ہے کہ آج بھی ہمارے درمیان کچھ لوگ ہیں جو ظلم وجبر کی اس فضا میں چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ محبتوں کے چراغ۔ انسانیت اور انسان دوستی کے چراغ۔ دُعا کریں کہ یہ چراغ بجھنے نہ پائیں۔

عیدالاضحیٰ کا تہوار بھی اکتوبر کے مہینے میں آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی بندگی، اس کی رضا کے سامنے پوری آمادگی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرنا اور اپنی عزیز ترین شے بھی قربان کردینا اس تہوار کا مقصد اور روح ہے۔

ادارہ شعاع کی جانب سے آپ کو پیشگی عید مبارک۔ ہماری دُعا ہے کہ عید کا یہ تہوار آپ کے لیے حقیقی خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- محبت من محرم۔ سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- محبت جیت کی صورت۔ خالدہ نثار کا مکمل ناول،
- صائمہ اکرم اور مہوش افتخار کے ناولٹ،
- سلویٰ علی بٹ، ثریا انجم، صوفیہ سرور، مصباح علی اور صبیحہ اقبال کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- FM 100 کے آر جے ایاز احمد اور کنول ایاز کا بندھن،
- بیٹھ کر سیرِ دوجہاں کرنا۔ آمنہ زریں کا تبصرہ،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری سچ بولتی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع آپ کو کیسا لگا۔؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔ خط ضرور لکھیے گا۔

باری تعالیٰ

حمد

غموں کے بحر سے ہم کو نکالنے والا
وہی ہے سارے جہانوں کو پالنے والا

گواہی دیتے ہیں سارے اسی کی ماہ ونجوم
وہ اپنے نور سے جگ کو اُجالنے والا

ہر اک جہاں کی محافظ ہے ذاتِ پاک اس کی
وہ جان قطرۂ خوں میں ہے ڈالنے والا

اسی کے ہاتھ میں عزت ہے اور ذلت بھی
وہی کریم، کرم سے نوازنے والا!!

نصیب سب کے بنائے الگ الگ اس نے
وہی ہے سوکھے شجر کو سنبھالنے والا

اسی کا نُور ہے انوارؔ میری سانسوں میں
وہی ہے راست کی راہوں پہ ڈالنے والا

انوار فیروز

رسولِ مقبولؐ

نعت

تاریکیوں سے چاند نکالے حضورؐ نے
پھیلا کے ظلمتوں میں اُجالے حضورؐ نے

روتے ہوئے تمام گلے سے لگا لیے
گرتے ہوئے تمام سنبھالے حضورؐ نے

واللہ ان کے لُطف وکرم کی یہ بارشیں
سائل کبھی بھی در سے نہ ٹالے حضورؐ نے

کتنے بُتوں کو پُوجنے والے بنادیے
صرف اک اِلٰہ کے چاہنے والے حضورؐ نے

دے کر پیامِ حرکت ودرسِ عمل ہمیں
توڑے جمودِ ذات کے تالے حضورؐ نے

ارقمؔ بھٹک رہے تھے جو دشتِ حیات میں
وہ لوگ راہِ راست پہ ڈالے حضورؐ نے

ڈاکٹر محمد افتخار الحق ارقمؔ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ادارہ

اے روشنی کے متلاشیو آؤ میری باتیں

کلمہ طیبہ

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لا الہ الا اللہ سے بڑھ کر (افضل) کوئی عمل نہیں اور یہ کسی گناہ کو باقی نہیں چھوڑتا۔"

بہترین عمل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس نے ایک دن میں سو بار یہ الفاظ کہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

"اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ بادشاہی اسی کی ہے اور تعریف بھی اس کی ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔" اسے دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ہو گا اور اس کے لیے (نامہ اعمال میں) سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے سو گناہ مٹا دیے جائیں گے اور ان کی وجہ سے سارا دن' رات تک وہ شیطان سے محفوظ رہے گا اور کسی کا عمل اس کے عمل سے افضل نہیں ہو گا۔ سوائے اس شخص کے جو اس سے زیادہ ذکر کرے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ کا ذکر ثواب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

2۔ بعض اذکار مالی صدقات و خیرات سے زیادہ ثواب کا باعث ہوتے ہیں۔

3۔ مسنون ذکر شیطان سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

4۔ مسنون اذکار میں اس قدر برکات و فوائد موجود ہیں کہ ان کے ساتھ مزید اذکار ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں اور اپنے بنائے ہوئے اذکار ثواب کا باعث بھی نہیں۔

غلام آزاد کرنا

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص صبح کی نماز کے بعد یہ دعا پڑھے۔ اسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ہو گا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' بادشاہی اسی کی ہے اور تعریف بھی اسی کی ہے۔ اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔"

اللہ کی تعریف کرنے والوں کی فضیلت

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

فوائد و مسائل :

1۔ تمام مسنون اذکار رحمت و برکت کا باعث ہیں' لیکن لا الہ الا اللہ کا ثواب اور اس کی برکات سب سے زیادہ ہیں۔

2۔ اللہ کی تعریف بھی ایک دعا ہے۔ کیونکہ انسان ثواب کی نیت سے نیکی اور ذکر کرتا ہے۔ اس طرح اسے مطلوب (ثواب) حاصل ہو جاتا ہے۔

3۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ سب سے افضل دعا سورہ فاتحہ ہے۔ جسے حدیث میں الحمد اللہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ کی تعریف بھی ہے اور اس سے ہدایت' انعام اور مدد کی دعا بھی۔

اللہ کی تعریف

حضرت قدامہ بن ابراہیم جمحی رحمتہ اللہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے جب کہ وہ لڑکے تھے اور انہوں نے عصفر کے رنگے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ (ایک بار) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔

"اللہ کے ایک بندے نے کہا

يَا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِي لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَلِعَظِيْمِ سُلْطَانِكَ

اے میرے رب! میں تیری تعریف کرتا ہوں۔ جیسے تیری ذات کی جلالت شان اور تیری عظیم سلطنت کے لائق ہے۔"

یہ کلام (اعمال لکھنے والے) دونوں فرشتوں کے لیے مشکل ہو گا۔ انہیں پتا نہ چلا کہ اسے کس طرح لکھیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت اور اس کی سلطنت و اقتدار کی شوکت کی پیمائش ممکن نہیں کہ اتنی تعریف لکھ دیتے۔) وہ اوپر آسمانوں میں گئے اور عرض کیا۔

"یا رب! تیرے بندے نے ایک بات کہی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کس طرح لکھیں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "حالانکہ اسے زیادہ معلوم تھا' جو اس کے بندے نے کہا۔ میرے بندے نے کیا کہا؟"

انہوں نے کہا "یا رب! اس نے کہا ہے۔ اے میرے رب! میں تیری تعریف کرتا ہوں۔ جیسے تیری ذات کی جلالت شان اور تیری عظیم سلطنت کے شایان ہے۔"

اللہ عزوجل نے ان (فرشتوں) سے فرمایا۔

"اسے ایسے ہی لکھ دو۔ جیسے میرے بندے نے کہا ہے۔ حتی کہ جب وہ مجھے ملے گا تو میں خود اسے اس کا ثواب دوں گا۔"

اللہ کا شکر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ

"ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ اے اللہ! اہل جنم کے حال سے تیری پناہ کا طالب ہوں۔"

نعمت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب اللہ بندے کو کوئی نعمت دیتا ہے اور بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو بندے نے جو (شکر) ادا کیا' وہ ملنے والی نعمت سے افضل ہوتا ہے۔"

فائدہ : بندہ دنیا کی ظاہری نعمت کو اہمیت دیتا ہے۔ حالانکہ اس نعمت پر جو شکر کی توفیق ملی اور شکر کے نتیجے میں ملنے والی اخروی نعمتیں وہ اس دنیوی نعمت سے بدرجہا بہتر اور افضل ہیں۔ لہٰذا نعمت حاصل کرتے ہی شکر ادا کرنا ضروری ہے اور بندے کے لیے مفید بھی۔

اللہ کی تسبیحات پڑھنے کا ثواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو کلمات ایسے ہیں' جو زبان پر ہلکے ہیں' (اعمال کے) میزان میں بھاری ہیں' رحمان کو پیارے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ،
سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

"میں اللہ کی پاکیزگی بیان کرتا ہوں اور اس کی تعریف کرتا ہوں' پاک ہے اللہ عظمتوں والا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا۔

2۔ اللہ کا ذکر بھی ایک نیک عمل ہے۔ اس کا بھی وزن ہوگا۔

3۔ اعمال کے وزن کا دارومدار خلوص نیت اور اتباع سنت پر ہے۔ سنت کے مطابق خلوص سے کیا ہوا تھوڑا سا عمل بھی زیادہ وزنی ہوگا۔ لیکن خلوص کے بغیر یا سنت کے خلاف کیا ہوا زیادہ عمل بھی بے وزن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور انہوں نے جو (بظاہر نیک) اعمال کیے ہوں گے' ہم ان کی طرف متوجہ ہو کر انہیں پراگندہ غبار کی طرح کردیں گے۔" (الفرقان 25-23)۔

4۔ مذکورہ بالا ذکر زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے۔

بہتر پودے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ پودا لگا رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے اور فرمایا۔

"ابوہریرہ! کیا لگا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "پودا لگا رہا ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں اس سے بہتر پودے نہ بتاؤں؟"

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "جی ہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ

"ان میں سے ہر ہر کلمے کے عوض جنت میں تمہارے لیے ایک ایک درخت لگا دیا جائے گا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ کی تعریف کے کلمات اللہ کو بہت پیارے ہیں۔

2۔ جنت میں نعمتیں دنیا میں کی ہوئی نیکیوں کے مطابق ملیں گی۔

3۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کو پہلے سے پیدا کیا ہوا ہے۔ لیکن اب بھی ان میں نئی نئی نعمتوں اور نئے نئے عذابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

4۔ ہر مومن کے لیے جنت میں جگہ مخصوص ہے' جہاں اس کے اعمال کے مطابق باغات' محلات اور دوسری نعمتیں تیار ہو رہی ہیں۔

اللہ کے دربار میں

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ اللہ کی عظمت کا جو ذکر کرتے ہو' یعنی تسبیح (سبحان اللہ) تہلیل (لا الہ الا اللہ) اور تحمید (الحمدللہ) کے الفاظ کہتے ہو' وہ عرش کے اردگرد چکر لگاتے ہیں۔ ان کی ایسی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ وہ اپنے کہنے والے کا اللہ کے دربار میں) ذکر کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ (اللہ کے دربار میں) تمہارا ذکر ہوتا رہے؟"

فوائد و مسائل :

1۔ ایک مومن کے لیے یہ بہت بڑے شرف اور خوشی کی بات ہے کہ اللہ عزوجل کے دربار میں اس کا ذکر ہو۔ اس بلند مقام کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ مومن اللہ کا ذکر کرے۔

2۔ عرش اللہ کی ایک مخلوق ہے۔ جس کی اصل حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔ قیامت کو میدان حشر میں عرش الٰہی رکھا جائے گا اور کچھ خاص نیک اعمال کرنے والے افراد کو اس کے سائے میں جگہ ملے گی۔ (اللھم

اجعلنا منھم) یا اللہ! ہمیں بھی اپنے ان برگزیدہ بندوں میں شامل فرما۔ آمین

افضل کلمات

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"چار کلمات سب سے افضل ہیں۔ جس کلمہ سے بھی شروع کرو۔ کوئی حرج نہیں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ

گناہوں کی معافی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص سو بار (سبحان اللہ وبحمدہ) کہے' اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اگرچہ سمندر کے جھاگ کی طرح (بے شمار) ہوں۔"

فائدہ : اس قسم کی نیکیوں سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں' بڑے گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

درخت کے پتوں کی طرح

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا (سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر) پڑھتے رہا کرو۔ ان کلمات کی وجہ سے گناہ اس طرح ختم ہو جاتے ہیں۔ جس طرح درخت سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔"

استغفار (اللہ سے گناہوں کی معافی کے لیے دعا کرنا)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مجلس میں سو مرتبہ (یہ استغفار کہتے ہوئے) شمار کرتے تھے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

"اے میرے رب! مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ توبہ و استغفار بہت بڑی نیکی ہے۔

2۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے پاک تھے۔ اس کے باوجود کثرت سے استغفار کرتے تھے۔ کیونکہ استغفار بھی عبودیت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے' جو اللہ کو بہت پسند ہے۔

3۔ مجلسوں میں فضول باتیں کرنے اور غیبت اور گناہ میں مشغول ہونے کی بجائے اللہ کا ذکر اور استغفار کرنا بہتر ہے۔ تاکہ گناہوں میں اضافہ ہونے کی بجائے معافی اور رحمت ملے۔

سو مرتبہ استغفار

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں ایک دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے بخشش کی درخواست اور توبہ کرتا ہوں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ سو یا ستر مرتبہ سے مراد ایک تو اس مقدار کا تعین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سو مرتبہ استغفار فرماتے اور کبھی ستر مرتبہ۔ نیز ان احادیث سے کثرت سے استغفار کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

3۔ استغفار کے لیے کوئی مناسب الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً "(استغفر اللہ واتوب الیہ)۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

غصہ آنا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میں اپنے گھر والوں سے درشت زبان استعمال کرتا تھا۔ (معمولی بات پر ان پر غصہ آجاتا اور انہیں ڈانٹ جھڑک دیتا) ان کے سوا کسی سے یہ رویّہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم استغفار کیوں نہیں کرتے؟ ایک دن میں ستر بار استغفار کیا کرو۔"

استغفار

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مبارک ہو اس شخص کو' جسے اپنے نامہ اعمال میں زیادہ استغفار ملا۔"

فائدہ : استغفار زیادہ ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ گناہ معاف ہوتے رہیں گے اور یہ کلمات اللہ کا ذکر ہونے کی وجہ سے نیکیوں میں شمار ہوتے رہیں گے' یعنی استغفار سے قیامت کے دن معافی ملنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

غم سے نجات

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص استغفار کی پابندی کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ہر غم سے نجات دیتا ہے۔ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے' جہاں سے اس کو گمان نہیں ہوتا۔"

فائدہ : مذکورہ روایت سنداً "ضعیف ہے' تاہم توبہ و استغفار کی اہمیت و فضیلت دیگر احادیث سے مسلم ہے۔ علاوہ ازیں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو استغفار کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ترجمہ "اپنے رب سے بخشش مانگو (اور توبہ کرو) ۔وہ یقیناً" بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا اور تمہیں مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہیں باغات دے گا اور تمہارے لیے دریا جاری کر دے گا (سورۃ نوح 10 تا 12)۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار گناہوں کی معافی کے ساتھ ساتھ دنیوی مشکلات کے حل اور دنیوی نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔

(نیک) عمل کی فضیلت

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے۔ "جو شخص نیکی کرتا ہے' اسے دس گنا (اجر) ملے گا اور میں (اس سے) زیادہ بھی دے دیتا ہوں اور جو شخص گناہ کرتا ہے تو گناہ کا بدلہ اس کے برابر ہے (زیادہ نہیں) یا میں (وہ گناہ بھی) معاف کر دیتا ہوں اور جو شخص ایک بالشت میرے قریب آتا ہے' میں اس سے ایک ہاتھ قریب آتا ہوں اور جو شخص مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے' میں اس سے دو ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے' میں اس کی طرف بھاگ کر آتا ہوں۔ جو شخص مجھ سے زمین بھر گناہ لے کر ملے' لیکن میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرتا ہو' میں اسے اتنی ہی مغفرت لے کر ملتا ہوں۔"

فوائد و مسائل :

1- اس حدیث میں اللہ کی عظیم رحمت کا بیان ہے' اس لیے بندے کو نیکیاں زیادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور گناہوں سے توبہ کرتے رہنا چاہیے۔

2- جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے توفیق بخشتا ہے۔

3- شرک کی موجودگی میں گناہ معاف نہیں ہوتے۔

ایک پاگل کی ڈائری

مُصنف: فیودر دوستوفسکی
مُترجم: ابوالفرح ہمایوں
تبصرہ: آمنہ ریاض

تنہا ہو جانے کا احساس' تنہا ہونے سے زیادہ مہلک ہے اور اس احساس کی بڑھتی ہوئی شدت فرد کو ماحول' حقیقت سے فرار اور قنوطیت اختیار کرنے کے خود ساختہ جواز فراہم کرتی ہے۔۔۔ خارجی سطح پر کم ہی لوگ اس کی نوعیت' اسباب اور نتائج کی سنگینی سے واقف ہو پاتے ہیں۔ کیونکہ یہ فرد کی داخلی حسیات سے متعلق ہے۔

ایک تخلیق کار اپنے احساس' مشاہدے اور تخیل کے بل بوتے پر اپنی پسند کے موضوع کے انتخاب کا اختیار رکھتا ہے اور پھر اس کے ساتھ انصاف کرنا اظہار کمال ہے۔

انسانی نفسیات' احساسات کی نفاست' سلاست اور خوب صورتی کو بیان عطا کرنا بھی کار ہنر ہے۔۔۔ مگر اس کی کمی' پیچیدگیوں اور گڑبڑ کو بیان عطا کرنا۔۔۔ کار داد بھی ہے!

روسی ادب عالمی سطح پر قابل قدر شناخت اور عالمی ادب میں بے مثل مقام رکھتا ہے۔۔۔ اور دوستوفسکی کے ناول دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے خود اس کا کہنا ہے "اس روزنامچے کا ہیرو ایک خیالی فرد ہے اور جو کچھ اس نے لکھا ہے' وہ ایک بیمار ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ ہمارا معاشرہ طرح طرح کے بے ہودہ اور حیوانی ریت اور رسوم سے بھرا پڑا ہے۔ قدم قدم پر ایسے واقعات دیکھنے اور سننے میں آجاتے ہیں' جن کو دیکھ کر اور سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ہنسی بھی آجاتی ہے۔ یہاں ایک ایسے ہی نفسیاتی مریض کے کردار کو میں نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شخصیت کا نام میں نے "چھپا رستم" رکھا ہے۔ اپنے اردگرد دیکھیے۔۔۔ کہیں کوئی رستم چھپا ہوا تو نہیں ہے؟"

ہم میں سے ہر کوئی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا شکار ہوتا ہے۔۔۔ ہماری ذہنی حالت ایک ہی خط پر استوار نہیں رہتی۔۔۔ فرق صرف اس حالت میں سے نکل آنے یا اسی میں گرفتار رہنے سے پیدا ہوتا ہے۔ زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جب آپ بے ساختہ ہنس دیتے ہیں۔ تب دراصل آپ کو اپنی ذہنی ابتری کی کوئی نہ کوئی حالت بھی یاد آتی ہے۔۔۔ اور آپ کی ہنسی میں چھپا اعتراف اس منفی یاد کو بھی بہالے جاتا ہے۔۔۔ بشرطیکہ آپ میں بھی تسلیم اور اعتراف کی خو پہلے سے موجود ہو۔"

"اب آپ یہ بتائیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب میں کسی نیک خیال کی جانب راغب ہوتا ہوں تو عین اسی لمحے کوئی نہ کوئی اڑچن میری راہ میں آجاتی ہے۔ شاید میرا خیال غلط ہو اور اس حادثے کو ٹھیک اسی وقت واقع ہونا ہو۔ یہ سب تو تقدیر کا کھیل ہے' مگر پھر ہوتا یوں ہے کہ میرے تمام سنہرے سپنے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میرا اعتقاد ہے کہ یہ منفی خیالات مجھے سیدھے راستے پر نہیں آنے دیتے۔"

"میری فطرت کچھ عجیب و غریب سی بن کر رہ گئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ میری زندگی کسی ایک سانچے میں نہ ڈھل سکی۔ نہ ہی میں مکمل شیطان بن سکا اور نہ ہی ایک ہمدرد اور دردمند انسان۔ نہ ہی دیوتا اور نہ کوئی حشرات الارض۔"

اپنے متعلق رائے کا اظہار دیکھیے.... اور خیالات کا بہاؤ ملاحظہ فرمائیے۔

"اگر کوئی اپنی بے عزتی اور بے حرمتی میں بھی لطف و انبساط محسوس کرتا ہو اور اس کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہو تو اسے آپ کیا کہیں گے۔ یہ میں آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کوئی ندامت نہیں ہے۔ میں کبھی آپ کے آگے نہیں گڑگڑاؤں گا کہ جناب من! مجھے معاف کردیجیے۔ میں آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ ایسا بھی نہیں کہ مجھے کبھی اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہو۔"

"رضاکارانہ طور پر میں نے مصیبتوں کو قبول کرلیا تھا' مگر میں نے ان سے فرار کا بھی ایک طریقہ سوچ لیا تھا اور وہ یہ تھا کہ ہر وقت سامنے تصورات اور خوابوں میں گم رہا جائے۔ میں ایک گوشے میں سوتے سوتے اور خواب دیکھتے دیکھتے تین ماہ تک گزار سکتا ہوں۔"

جیسے جیسے آپ کردار کی تہہ در تہہ پرتوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں.... آپ پر یہ کھلتا ہے کہ اس "میں" کے مسائل کی جڑ خود اعتمادی کی شدید کمی' خود مذمتی کی انتہا' بے بسی اور خود ترسی کا مستقل پڑاؤ' سماجی تعلقات میں عدم دلچسپی اور رفتہ رفتہ دیوار سے لگا دینے والی تنہائی ہے.... لیکن ان تمام تر مسائل کی نشان دہی کے باوجود دلیل' سوال و جواب اور زمانے کی حقیقتوں تک اس کی رسائی قابل داد ہے.... مگر منطق کا اطلاق اپنی ذات پر کیے بغیر ناکامی فہم کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

دیکھیے.... ایک اعترافی بیان۔

"لیکن ہر بات کا الزام قسمت پر نہیں دھرنا چاہیے سب سے زیادہ کسر شان تو یہ بات ہے کہ اپنا قصور کسی دوسرے کے سر تھوپ دیا جائے۔ قدرت کا قانون یہی کہتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس خوش فہمی پر قائم رہنا کہ میں دنیا کا عقل مند ترین آدمی ہوں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی حماقت کو تسلیم کرتا ہوں۔"

ایک خودذمتی بیان....

"اگرچہ مجھے اپنے بارے میں خوش فہمی ہے کہ میں ایک ہونہار شخص ہوں۔ کیونکہ میں نے جب بھی کوئی کام شروع کیا' اسے انجام تک نہیں پہنچا سکا۔ مجھ میں ایک خوبی یا صلاحیت اور بھی ہے کہ میں پیٹ کا بے حد ہلکا واقع ہوا ہوں۔ بالکل کمینہ۔ بلکہ کم ظرف۔ لیکن سب سے ضروری بات یہ ہے کہ رجحان ایک ہی سمت میں ہونا چاہیے۔ ورنہ تمام صلاحیت غارت ہو کر رہ جائے گی۔"

دیکھیے.... خود فہمی کا ایک مرحلہ....

"میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے اپنے دفتر کے ساتھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ چنانچہ میں ہر ایک سے دور بھاگنے لگا۔ ان کا منحوس چہرہ میرے دل و دماغ پر اس قدر سوار ہو گیا کہ میں خود اپنے آپ کو بھول گیا اور اپنے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ میں اپنے آپ کو کمترین اور ان کو بہترین حیثیت کا درجہ دے بیٹھا ایک مہذب اور نیک خصلت آدمی اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ اپنے دل و دماغ سے دہشت اور خوف کے جذبے کو زائل نہ کر دے اور اپنے آپ کو خوش اخلاق' نیک دل اور اعلا ظرف نہ بنالے۔"

یہ عین انسانی فطرت ہے کہ بعض اوقات غیر اہم کو اہم کا درجہ دینے سے اپنی ذات' اعتماد اور وقار مجروح ہونے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے.... اگر اسی کیفیت کا غلبہ رہے تو خدشات بدترین نتائج ظاہر کردیتے ہیں۔

اب دیکھیے.... متضاد خیال کی بہتی رو۔

"انسان کو اپنے حقوق سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ پست حوصلگی اور بزدلی کا مادہ جڑ پکڑنے لگتا ہے۔ دماغی صلاحیت متاثر ہونے لگتی ہے۔ مجھے

کافی عرصے سے اندازہ ہے کہ حاضر دماغی کا زوال انسان کے لیے بد قسمتی ہے۔"

دیکھیے.... کچھ آفاقی حقیقتوں کا ادراک۔

"آپ قدرت کی مرضی سے اتفاق کریں یا نہ کریں آپ کو ہر حال میں اسے برداشت کرنا ہے اور اس کے تمام قوانین کی پیروی کرنی ہے۔ ایک حد آپ پر لاد دی گئی ہے اور آپ کو اس کے اندر ہی اندر چلنا ہے۔"

حضرات! ہم فرض کرلیتے ہیں کہ انسان نادان اور ناسمجھ نہیں ہے۔ (بس ایک نکتہ مدنظر رہے کہ اگر انسان عقل مند نہیں ہے تو پھر وہ کون ہے جو عقل اور خرد کا دعوا کر سکے؟) ہاں! یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ درحقیقت' میرے خیال کے مطابق' اس کی صحیح تشریح یہ ہے کہ یہ ناشکر گزار دوپایہ ہے۔"

کچھ حقائق زمانے گزر جانے پر بھی وہی تلخی رکھتے ہیں۔ گو کہ جدت طرازی کا زعم ہر زمانے کو لاحق رہتا ہے.... تحریر میں موجود مواد گہری فکر اور مشاہدے کی بدولت ہی ڈیڑھ صدی گزر جانے پر بھی تر و تازہ محسوس ہوتا ہے۔

"بات کچھ یوں ہے کہ کچھ نہ کرنا ہی بہترین بات ہے۔ علم فلکیات کی رو سے باخبری اور آگاہی مصیبت ہے۔ ایک گوشے میں پڑے رہنا ان تمام باتوں سے آدمی کو نجات دیتا ہے۔ مجھے تنک مزاج افراد پر رشک آتا ہے۔ لیکن پھر بھی میری یہ خواہش نہیں ہے کہ میں ان کی جگہ لے لوں۔ (لیکن پھر بھی رشک کرنا میری مجبوری ہے) میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اندھیری کوٹھری میں پڑے رہنا کوئی دلچسپ بات ہے۔ لیکن میں ہر قیمت پر یہیں رہنا پسند کروں گا۔"

عافیت کی طلب' بے عملی کے محرک سے پیدا ہو تو وہ میدان عمل میں اترنے سے گریزاں حقیقت سے ہراساں طبیعت کا پتا دیتی ہے۔ بعض اوقات انسان بہتری اور بڑھوتری سے صرف اسی لیے محروم رہ جاتا ہے کہ وہ گوشۂ عافیت کو ترک کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتا۔

اور ایک چیز جو بار بار' لیکن بالواسطہ طور پر محسوس ہوتی ہے کہ انسان کے رہنے کی جگہ اگر گھٹن اور تاریکی میں لپٹی ہو تو اثرات اس کے ذہنی میلان پر براہ راست مرتب ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کا کیا.... کہ وہ خود اس جگہ کو نہ صرف پسند کرتا ہو۔ بلکہ نہ چھوڑنے کا مصمم ارادہ بھی رکھتا ہو۔

کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے اور نہایت مختصر ہے۔ مگر موضوع کی حساسیت توجہ کی طالب ہے۔ پہلے باب میں آپ مرکزی کردار کے خیالات اور رائے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ جس میں فلسفہ' بحث' دلیل' ہٹ دھرمی' خودشناسی پر مشتمل خیال کا اتار چڑھاؤ دیکھنے میں آتا ہے۔ دوسرے باب میں کچھ ایسے واقعات کا تسلسل ہے' جہاں ان کے خوابوں میں رہنے کی کیفیت حقیقت کا روپ کچھ اس طرح ڈھالتی ہے کہ آپ پریشان بھی ہوتے ہیں.... ہنستے بھی ہیں اور حیران تو ہوتے ہی ہیں۔

"وہ مجھے سمجھا بجھا کر بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے جو حرکت کی' وہ ناقابل معافی تھی۔ اس نے مجھے ایک مکھی کی طرح جھٹک کر پھینک دیا تھا۔ میں شدید غصے کی آگ میں جھلس رہا تھا اور میری سمجھ میں یہی نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح اس کا دماغ درست کر کے رکھ دوں۔ وہ چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا ایک تندرست و توانا جوان تھا۔ جب کہ میں ایک دھان پان سا پستہ قد نوجوان ہوں۔

یہ اس افسر سے کدورت رکھنے کا نقطۂ آغاز تھا اور اس نقطے سے کیسی مکمل تصویر.... اور وہ بھی اسی طرح فرضی بنائی گئی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خیال اور وہ بھی اتنا حقیقی۔

"میرے اس احتجاج پر شاید معاملہ ختم ہو جائے۔ میری ملازمت ختم ہو جائے گی اور مجھے قید تنہائی کاٹنے کے لیے سائبیریا بھیج دیا جائے گا۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے سب کچھ منظور ہے۔ پندرہ سال قید کاٹنے کے بعد جب میں بالکل مفلوج ہو چکا ہوں گا اور سڑکوں پر بھیک

WWW.PAKSOCIETY.COM

مانگ رہا ہوں گا' تو ایک شاہراہ پر وہ مجھے نظر آئے گا۔ اس کی شادی ہو گئی ہو گی اور اب اس کی بیٹی بھی جوان ہو گی۔ اس وقت میں اسے مخاطب کروں گا اور شکایتی انداز میں کہوں گا "ادھر دیکھو شیطان کے بچے! دیکھو میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ میرے گال اندر کو دھنس گئے ہیں اور میرے سر کے بال اڑ چکے ہیں۔ میری زندگی ایک تماشا بن گئی ہے۔ میری تمام امنگیں' محبت غرض کہ تمام مسرتیں دم توڑ چکی ہیں۔ تو ان سب بربادیوں کے ذمہ دار تم ہو۔ صرف تم ہو۔ اب میں جی کر کیا کروں گا۔ یہ پستول پکڑو اور میرا کام تمام کر دو۔"

یاد رہے! یہ سب خیالی معرکہ آرائی ہے اور ابھی اسے اور رنگ پکڑنا ہے۔ لیکن کتاب اختتامی مراحل میں داخل ہو چکی ہے اور معرکہ آرائی کا یہ خواب ایک ایسے واقعے کی تعبیر میں بدل گیا۔۔۔ جو خود اذیتی کے شکار مریض کے لیے دائمی کسک کا سبب بھی بن گیا۔

لیزا۔۔۔ جس کو پہلی ہی ملاقات میں خواب دکھلا دیے' امید دلادی۔۔۔ اور خود ہمیشہ کی طرح سرمائی خواب میں مبتلا۔

"اپنے تاریک کمرے میں اکثر یہی سوچا کرتا تھا کہ محبت ایک مصیبت کا نام ہے۔ میرے ذہن میں یہی بات رچ بس گئی تھی کہ محبت ایک محکومی اور تابعداری کا نام ہے۔ چنانچہ میں نے ہمیشہ اس نام سے نفرت کی اور جب مجھے محبت سے نفرت ہو گئی تو پھر یہ نفرت' محبت بن کر میرے گلے میں آن پڑی۔ وہ بھی فیصلہ کر کے ہی آئی تھی کہ میرے تمام تر تضحیک آمیز رویے کے باوجود میری زندگی میں محبت کے پھول کھلا کر رہے گی۔"

لیکن لیزا۔۔۔ جو درد کا درماں بن سکتی تھی۔۔۔ وہ بھی بدمزاجی' عجلت اور اضطرابی کیفیت کی نذر ہو گئی۔

"میری ملاقات لیزا سے دوبارہ نہیں ہوئی اور نہ میں نے اس کے بارے میں کچھ سنا۔ یہاں میں آپ کو مطلع کر دوں کہ میں بے حد مطمئن اور خوش و خرم ہوں اور مجھے اس بات کا کوئی پچھتاوا نہیں ہے کہ میں نے اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا۔"

"میری یادداشت جواب دیتی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود چند یادیں اب بھی دل کو تڑپاتی ہیں۔ میری یہ تحریر ادب کا کوئی شاہکار بھی نہیں۔ بلکہ مجھے تو اس بات کی سزا ملنی چاہیے کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں لکھا۔ کیا میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کیوں خود اپنے ہاتھوں برباد کی؟

یقیناً" یہ داستان آپ کو ذرا بھی متاثر نہیں کرے گی۔ میں نے اس ناول میں ہیرو کے بجائے ولن کا کردار ادا کیا ہے۔۔۔ یا شاید دونوں کا۔ بہرحال اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم سب بے بس ہیں اور اسی طرف چلتے ہیں' جدھر حالات کا دھارا لے جاتا ہے۔ ایسے میں زندگی ایک عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ اصل زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے بے پناہ محنت اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور ہم سب کاہل اور سست ہو گئے ہیں۔ بعض اوقات ہم کسی تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ کیا اور کیوں؟"

مثبت اور منفی' متضاد خیالات' منطقی حقیقت اور غیر حقیقی خیالوں پر مشتمل اس کتاب کا توجہ طلب نکتہ یہی چیز ہے۔

ہمیں یہ دیکھنے اور سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ ہم جو ہر الزام قسمت پر دھرنے کے عادی ہیں' جان سکیں کہ خود انسان اپنا کس قدر دشمن ہو سکتا ہے۔۔۔ اور دوسروں سے ہمدردی کا طالب' گلہ گزاری اور نفرت کا شکوہ کرنے والا خود اپنے آپ سے کتنی نفرت کر سکتا ہے؟ اور یہ رویہ۔۔۔ قسمت کی مہربانیوں کا لطف کیسے کرکرا کرتا ہے؟

زندگی کو قابل رشک بنانے کی خواہش تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔۔۔ مگر اس کے لیے آرام طلبی' کم ہمتی اور اندیشوں کو خیرباد کہنے کا حوصلہ کوئی کوئی ہی کرتا ہے۔ ایسے میں' ناکامیوں کا الزام قسمت' حالات' افراد پر ڈالنے سے پہلے ایک نظر۔۔۔ ایمان داری اور غیر جانب داری سے۔۔۔ اپنی طرف!!!

بندھن

ایف ایم 100 کے معروف آر جے اور آرٹسٹ

ایاز احمد عرف مسٹر کنول ایاز

ریاض احمد

جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ سب کے نہیں مگر اکثریت کے بنتے ہیں۔ اور اگر جوڑے بنے ہوتے ہیں تو شادی ہو کے رہتی ہے خواہ کسی بھی عمر میں ہو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو نہیں پتا ہوتا کہ اس کا جوڑ لکھا ہے یا نہیں بس تو پھر جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی خود بھی پریشان ہوتا ہے اور لوگوں کے طعنے بھی سنتا رہتا ہے کہ "ارے" ابھی تک آپ کی شادی نہیں ہوئی۔

خیر اس بار "بندھن" میں معروف آر جے ایف ایم 100 کے 'ایاز احمد سے ملاقات کیجیے ان کی شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے اور ماشاءاللہ ایک بیٹی کے والد بھی بن گئے ہیں۔

"کیسے ہیں؟ شکر ہے کہ آپ کو بھی فرصت مل گئی مجھ سے بات کرنے کی؟"

"کیا کروں مزدور آدمی ہوں' دن رات مزدوری میں لگا رہتا ہوں آج کل۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"او۔۔۔ ہو کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

"اصل میں میں پروڈکشن کی طرف آرہا ہوں اس لیے آج کل زیادہ مصروف رہتا ہوں۔ ہمارے پروڈکشن ہاؤس سے ڈرامے بھی ہوں گے اور مختلف شوز بھی۔ پروڈکشن ہاؤس کا نام "بلیک کیپ" ہے۔"

"کچھ کام کیا یا ابھی سیٹنگ ہو رہی ہے؟ اور ریڈیو چل رہا ہے کیا؟"

"کام کیا ہے۔ دو تین ٹیلی فلمز بھی بنائی ہیں جو کہ آن ایئر بھی ہو گئی ہیں آج کل سیریل اور سوپ پہ کام ہو رہا ہے اور ریڈیو بھی ماشاءاللہ چل رہا ہے۔"

"پروڈکشن ہاؤس کا خیال کیسے آیا؟"

"بس جب پیسوں کی کمی محسوس ہوئی تو سوچا کہ کچھ اور بھی کام کرنا چاہیے صرف ایک ہی کام سے تو گزارا نہیں ہوتا۔ جب شادی ہوتی ہے بال بچے ہوتے ہیں تو اخراجات بھی بڑھتے ہیں تو پھر ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ پلاننگ تو کب سے تھی۔ مگر اب شکر ہے کہ پلاننگ پہ کام ہو رہا ہے۔ کیونکہ وقت بہت کم ہے ہر کام کے لیے۔ ویسے ڈائریکشن کی طرف آنے کا بھی پلان ہے۔"

"ہوں۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ اچھا جی شادی ہو گئی آپ کی بہت مبارک ہو۔ آپ کی شادی تھوڑی دیر سے ہوئی تو یہ محاورہ درست ہے کہ دیر آید درست آید یا پھر جلدی ہو جانی چاہیے تھی۔"

"یہ محاورہ بالکل درست ہے کیونکہ ہر کام کا وقت مقرر ہے ہم اور آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ ویسے بہت شکریہ مبارک باد کا۔ میری شادی 31 اگست 2012ء کو ہوئی۔"

"کنول سے کہاں ملاقات ہوئی اور پہلی ملاقات میں کیسی لگیں اور کب خیال آیا کہ اب شادی کر لینی چاہیے؟"

"اصل میں دونوں فیملیز ایک دوسرے کو جانتی تھیں تو گھر میں سب نے کہا کہ لڑکی اچھی ہے۔ میری ایک بہن اسلام آباد میں رہتی ہیں انہوں نے ہی کنول کو دیکھا ہوا تھا تو گھر والوں سے بات کی۔ انہوں نے مجھے کنول کی تصویر دکھائی پھر میں ملنے اسلام آباد۔ وہاں ان کے گھر گیا۔ مجھے فیملی اچھی لگی، بہن تو پہلے سے ہی جانتی تھیں۔ میں ایک بات پر بہت یقین رکھتا ہوں کہ جب نصب میں ہونا لکھا ہو تو پھر ہر بات درست ہو جاتی ہے۔ تو جب گیا پسند آئی تو کہا گیا کہ اب آئے ہوئے ہو تو بات بھی ڈال دیتے ہیں اور منظور ہو جائے تو منگنی کروا کے جانا۔ تو دیکھتے ہی دیکھتے سب کام ہوتے چلے گئے۔"

"کنول کو پہلی بار دیکھا تو کیا بات اچھی لگی؟"

"میں نے اپنی فیلڈ میں بہت ماڈلز اور ماڈرن لڑکیاں دیکھی ہیں تو جب میں نے کنول کو دیکھا تو مجھے اس کی سادگی بہت پسند آئی اور میں خود بھی بہت سادہ زندگی گزارتا ہوں۔ چالاک اور فیشن ایبل لڑکیاں مجھے ویسے ہی پسند نہیں ہیں۔"

"منگنی سے پہلے سوچا کہ دو چار ملاقاتیں کر لوں یا فون پر بات کر لوں؟"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا، بہن نے دیکھا ہوا تھا، وہ سب جانتی تھیں۔ میں نے ان پر اعتبار کیا۔ نہ ملاقات کی نہ بات۔ مکمل طور پر ارینج میرج ہے میری۔"

"یہ نہیں سوچا کہ اپنی فیلڈ سے لڑکی پسند کروں تاکہ وہ میرے کام کو سمجھے اور کبھی دیر سویر ہو تو کوئی مسئلہ نہ کھڑا کرے؟"

"نہیں، فیلڈ کی تو مجھے چاہیے ہی نہیں تھی۔ ہاں جب منگنی ہو گئی تو میں نے اس کو بتایا کہ میرا کام ایسا ہے کہ مجھے دیر سویر ہو جاتی ہے اور آپ سوچ لیں۔۔۔ کہ یہ فیلڈ کس ٹائپ کی ہے۔ اگر آپ کا ذہن کشادہ ہے تو ٹھیک ہے۔ شک کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ بعد میں اختلافات جنم لیتے ہیں، باتیں پہلے دن سے ہی گوش گزار کر دی تھیں اور اللہ کا شکر ہے زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ ماشاءاللہ سے ایک بیٹی ہے جس کا نام "علیزے" ہے۔"

"بیگم کو شادی کے بعد کیسا پایا؟ امیدوں پر پورا

اترتیں؟"

"بالکل جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی پایا لڑائی جھگڑا نہیں ہوئی شک نہیں تو زندگی اس طرح اچھی گزرتی ہے۔ بس بیوی کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ کیسا ہے اور جب میں گھر آتا ہوں تو یہ بھول کر آتا ہوں کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں یا آرجے ہوں۔ گھر میں بچی کا باپ اور بیوی کا شوہر ہوتا ہوں۔ میں بیوی کو بھی آزادی دینے کا قائل ہوں مگر اس آزادی کا غلط استعمال کرنے کا قائل نہیں۔"

"آپ چاہیں گے کہ بیوی بھی اس فیلڈ میں آپ کے شانہ بشانہ کام کرے؟"

"میرے ساتھ کام کرے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر اکیلے نہیں کیونکہ فیلڈ کوئی بھی ہو اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، مگر شوبز کی فیلڈ میں پبلک بھی انوالو ہو جاتی ہے جبکہ دیگر فیلڈز میں ایسا نہیں ہوتا پھر میری بیگم میں شوبز والے جراثیم بھی نہیں ہیں۔۔۔ شادی کے بعد مختلف چینلز پہ ہمارے انٹرویوز ہوئے، بس اس حد تک ٹھیک ہے۔"

"شوبز کی تقریبات میں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں؟"

"میں خود تقریبات میں نہیں جاتا تو بیگم کو کیا لے جاؤں گا۔ شوبز کا ہو کے بھی شوبز سے دور رہتا ہوں۔ بس کام ختم کیا اور گھر کی راہ لی۔ میری اس طرح کی طبیعت نہیں ہے کہ ہر پارٹی میں پہنچ جاؤں۔"

"شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

"میرے کچھ دوست ہیں جنہوں نے بڑی خوب صورت لڑکیوں سے شادیاں کیں مگر کچھ ہی ماہ بعد طلاق بھی ہو گئی۔ خوب صورت لڑکی کے ساتھ مسائل بھی بہت ہوتے ہیں۔ بس قبول صورت ہو جو آپ کے ساتھ اچھی لگے، آپ کا خیال رکھے، آپ کا اندر خوب صورت ہونا چاہیے۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ خواہ شوبز ہو یا کوئی اور فیلڈ۔ لو ہو یا ارینج، طلاقیں بہت ہو رہی ہیں آج کل۔۔۔ آپ کے خیال میں وجہ؟"

"مین بچپن سے ایک بات سنتا چلا آرہا ہوں کہ جب لڑکی رخصت ہوتی تھی تو گھر والے کہتے تھے کہ اب اس گھر سے تمہارا "جنازہ" آنا چاہیے۔ مگر اب معاملہ الٹا ہو گیا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں بڑے پیسے والے تو کسی نے اپنی بیٹی پیسے کے لالچ میں ان سے بیاہ دی، دو چار مہینے کے بعد ہی ڈیمانڈ شروع ہو گئی کہ ہماری بیٹی کو علیحدہ گھر لے کر دو، لڑکے نے کہا کہ میں اپنے گھر والوں کو نہیں چھوڑ سکتا تو بس گھر والوں نے طلاق دلوا دی بیٹی کو۔"

"مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ جب لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی تو والدین پریشان ہوتے ہیں اور جب ہو جاتی ہے تو الٹی سیدھی باتیں سکھاتے ہیں اور مداخلت کرتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، یہ مداخلت ہی تو لڑائی کا سبب بنتی ہے میاں بیوی کو اپنے مسائل خود سلجھانے چاہئیں، کیونکہ وہ ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ دوسرے لوگ میاں بیوی کو ٹھیک طرح سے جانتے تو ہیں نہیں پھر الٹا سیدھا مشورہ دیتے ہیں جس سے گھر برباد ہی ہوتے ہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"سسرال دور ہونا چاہیے یا نزدیک؟"

"میرا خیال ہے کہ سسرال دور ہی ہونا چاہیے' کیونکہ زیادہ گھلنا ملنا اور آنا جانا بھی مسائل کو ہی جنم دیتے ہیں۔ آپ کیا کہیں گی؟"

"میں تو یہی کہوں گی کہ لڑکی کو اپنے میکے سے دور رہنا چاہیے۔ کیونکہ جب وہ بار بار جائے گی تو گھر والے ضرور پوچھیں گے کہ تمہاری ساس کیسی ہے۔ نندیں کیسی ہیں اور پھر کوئی نہ کوئی بات منہ سے نکل جاتی ہے جو پکڑ میں آجاتی ہے' گھر والے کرتے تو ہمدردی ہیں مگر یہ ہمدردی گھر کو بگاڑ دیتی ہے اور داماد کو بھی سسرال سے دور رہنا چاہیے۔"

"بالکل صحیح بات کی شاہین آپ نے۔ آنے والی کو بھی تھوڑا ٹائم لگتا ہے ایڈجسٹ ہونے میں۔"

"اور لڑکی کو ہی کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ تبدیل کرنے نہیں آتی بلکہ تبدیل ہونے آتی ہے۔ خیر بتاؤ منہ دکھائی میں کیا دیا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"

"منہ دکھائی میں "ایاز احمد" دیا تھا۔ مجھ سے روایتی باتیں نہیں ہوتیں اور چونکہ اسلام آباد میں شادی ہوئی تھی تو وہیں سے آگے نکل گئے تھے۔ اب انشاء اللہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہنی مون منانے جائیں گے۔"

"غصہ کس کا تیز ہے اور کس طرح بلاتے ہیں ایک دوسرے کو؟"

"غصہ میرا تیز ہے۔ جب مجھے غصہ آتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتی ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے کیونکہ ایسے موقع پر جو بیویاں خاموش ہو جاتی ہیں وہ بہت آگے کی لڑائی سے بچ جاتی ہیں اور نام لے کر ہی بلاتے ہیں۔"

"اور آپ سے یہ آخری سوال کہ شادی کو نبھانے کے لیے کس حد تک آگے جائیں گے؟"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی بندہ صبر کے گھونٹ پی لیتا ہے تو بس انا کو مارنا پڑتا ہے تو بس آخری حد تک جاؤں گا انشاء اللہ اور چلتے چلتے ایک بات بتاؤں کہ چونکہ میری شادی اسلام آباد میں ہوئی تو ہم سب مل کر ٹرین میں گئے ڈبے بک کرا لیے تھے پہلے لاہور گئے پھر وہاں سے سب مل کر اسلام آباد آئے تو بہت انجوائے کیا ہم سب نے۔"

مسز کنول ایاز احمد

"ہیلو مسز کنول ایاز کیسی ہیں؟ مجھے جانتی ہیں آپ؟"

(ہنستے ہوئے) "جی بالکل جانتی ہوں۔ بہت ڈائجسٹ پڑھے آپ کے بس آج کل نہیں پڑھ پا رہی ماشاء اللہ جب سے بیٹی ہوئی ہے تب سے ٹائم ہی نہیں ملتا۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"جی ہمارا تعلق سرگودھا سے ہے۔ مگر ہم رہتے اسلام آباد میں ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میری دو بہنیں ہیں اور دو بھائی ہیں اور میں گھر میں سب سے بڑی ہوں مگر سسرال میں سب سے چھوٹی بہو بن کے آئی ہوں ہم اردو اسپیکنگ بھی ہیں اور پنجابی بھی اور میری تعلیم بی اے ہے۔"

"شادی کے بعد زندگی کیسی لگ رہی ہے؟ رسم و رواج میں کوئی فرق ہے؟"

"بہت اچھی لگ رہی ہے۔ نئے رشتوں کے ساتھ سب کو سمجھ رہی ہوں۔ پیار محبت لے رہی ہوں سب سے تو اچھا لگ رہا ہے۔ رسم و رواج کا اور مزاجوں کا بھی کوئی خاص فرق نہیں ہے۔"

"شادی تو کہتے ہیں بور کے لڈو ہیں؟"

"میں تو کہتی ہوں کہ بور کے لڈو ضرور کھانے چاہئیں۔"

"جب آپ کو یہ پتا چلا کہ ایک مشہور بندے سے شادی ہونے والی ہے تو کیسا لگا تھا اور پہلے سے دیکھا ہوا تھا؟"

"ریڈیو پہ میں نے انہیں اتنا نہیں سنا تھا البتہ ٹی وی پہ کافی بار دیکھ چکی تھی۔ تو جب ایاز کی آپی رشتہ لے کر آئیں تو میں بہت حیران ہوئی تھی کہ ان کا رشتہ؟ اچھا

بھی بہت لگا تھا۔ اور جب دوستوں کو بتایا تو کچھ حیران ہوئیں اور کچھ کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے پھر جب ہماری منگنی ہوئی تو ہماری فیملی میں کئی لوگوں کو پتا نہیں تھا تو جب سب نے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ سب ان کو پہچان کر ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔"

"ٹائم دیتے ہیں آپ کو یا مصروف رہتے ہیں اور جب آپ دونوں ساتھ ہوتے ہیں تو لوگ ایاز کو ہی دیکھتے ہوں گے؟"

"جب اپنے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو پھر گھر ہی آتے ہیں اور پھر گھر میں ہی رہتے ہیں اور جب ہم کہیں جاتے ہیں تو واقعی لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو مجھے تو بہت اچھا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی کتنی عزت ہے۔"

"کھانا گھر پہ ہی کھاتے ہیں آپ دونوں یا گھر سے باہر؟ اور جوائنٹ فیملی ہونی چاہیے یا نہیں؟"

"زیادہ تر گھر پر ہی مل کر کھاتے ہیں۔ ہاں کبھی انہیں دیر ہونی ہو تو پھر یہ بتا دیتے ہیں کہ کھانا کھا لینا..... اور مجھے تو جوائنٹ فیملی ہی اچھی لگتی ہے لیکن میری بہت سی دوستوں کو پتا چلا کہ میں جوائنٹ فیملی میں نہیں رہوں گی تو انہوں نے بڑے رشک کے انداز میں کہا کہ تم تو بہت لکی ہو۔ شروع شروع میں ضرور جوائنٹ فیملی ہونی چاہیے تاکہ آپ سب رشتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔"

"ایاز کو مزاج کا کیسا پایا؟ اچھی زندگی کے لیے محبت ضروری ہے یا پیسہ؟"

"بہت اچھے مزاج کے ہیں' کبھی کبھار غصہ بھی آجاتا ہے مگر پھر اپنے آپ کو سنبھال لیتے ہیں اور عموماً غصہ بھی اس وقت آتا ہے جب کہیں جانا ہو اور میں تیار ہونے میں لیٹ ہو جاؤں۔ اور اچھی زندگی کے لیے میرا خیال ہے کہ دونوں ہی چیزیں بہت ضروری ہیں۔"

"اگر کبھی ایاز دوسری شادی کی اجازت مانگیں تو کیا ردعمل ہوگا آپ کا؟"

"کبھی بھی اجازت نہیں دوں گی بہت خطرناک

سوال ہے میں تو رونا شروع ہو جاؤں گی کہ اچھی خاصی تو زندگی گزر رہی ہے۔ پھر کیوں آپ ایسا کر رہے ہیں۔"

"میکہ چھوڑتے وقت کیا کیفیت تھی اور رسمیں کون سی انجوائے کیں؟"

"بہت دکھی تھی' بہت روئی تھی۔ والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایک لمبی زندگی گزاری ہوتی ہے تو رونا تو آتا ہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں تیار ہو رہی تھی تو میری دونوں بہنوں نے کہا کہ کنول باجی آپ روئیے گا مت تو میں نے کہا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے میرا دل ویسے ہی بہت حساس ہے۔ تو رخصتی کے وقت تو میں نے میک اپ کی بالکل بھی پروا نہیں کی۔ اور رسمیں تو ساری ہی انجوائے کیں۔"

"ایاز کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟ موبائل چیک کرتی ہیں؟"

"بہت سی اچھی عادتیں ہیں بری تو کم ہی ہوں گی۔ ان کی اچھی عادت تو یہ ہے کہ ہر بات جلدی مان لیتے ہیں۔ خیال بہت رکھتے ہیں۔ بری یہ ہے کہ جب کہیں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اتنے بجے آجاؤں گا لیکن اس وقت یہ آتے نہیں ہیں ہمیشہ لیٹ آتے ہیں اور میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تبھی ان کا موبائل چیک نہیں کرتی کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کیونکہ ایاز ہر بات خود ہی بتا دیتے ہیں۔ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتے۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ اور دھوم دھام سے ہونی چاہیے یا سادگی کے ساتھ ہونی چاہیے؟"

"جی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی شادی سادگی سے ہی ہونی چاہیے مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب تک تمام رسمیں ادا نہ کی جائیں شادی مکمل بھی تو نہیں لگتی اور پھر ایک ہی بار ہونی ہوتی ہے تو دھوم دھام اچھی لگتی ہے۔ مگر اخراجات پر قابو رکھنا چاہیے۔"

"ایاز بیوی کے معاملے میں فیشن ایبل ہیں یا سادگی پسند ہیں؟"

"انہیں ہر وقت میرا میک اپ میں رہنا پسند نہیں ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ تم سادگی میں زیادہ اچھی لگتی ہو۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور کس طرح بلاتی ہیں ایاز کو؟"

"منہ دکھائی میں انہوں نے مجھے رنگ دی تھی اور میں انہیں ایاز بھی کہتی ہوں اور "اے وی" بھی کہتی ہوں۔"

"روایتی بیوی کی طرح خدمت کرتی ہیں یا اپنی باتیں شروع کر دیتی ہیں؟"

"یہ رات کو ایف ایم سے ہی آتے ہیں اور کافی تھکے ہوئے اور بول بول کر آتے ہیں تو آتے ہی لیٹ جاتے ہیں، آرام کرتے ہیں۔ بس پھر میں بولتی ہوں اور یہ سنتے ہیں اور گھر میں یہ بالکل بھی اس طرح نہیں رہتے کہ جیسے بڑی سیلیبریٹی ہوں بلکہ ایک عام انسان لگتے ہیں۔ گھر میں تو زیادہ بولتے بھی نہیں ہیں۔"

"فضول خرچ ہیں؟ اور بچت کی عادت کس کو ہے؟"

"یہ فضول خرچ ہیں جب شاپنگ پہ جاتے ہیں تو ہاتھ نہیں روکتے۔ میں بچت کی قائل ہوں۔"

"اور جناب اب اس انٹرویو کا آخری سوال کہ کمرے میں آکر پہلا جملہ انہوں نے کیا بولا تھا؟"

(قہقہہ ....) "کمرے میں تو آتے ہی فوٹو سیشن شروع ہو گیا تھا اور جب فوٹو سیشن ختم ہوا تو بے ساختہ بولے کہ شکر ہے کہ فوٹو سیشن ختم ہوا اور سارے کام بخوبی انجام پا گئے۔"

☆

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Emale: id@khawateendigest.com

اکتوبر 2013 کے شمارے کی ایک جھلک

شہاب الدین شاہجہان

اس ماہ کی کہانی میں آپ کو یہاں بھگوں کا احوال لے کر یورپ کی لاڈوال داستان بھی نظر آئے گی۔ حروف مصنف اسلم راہی کے قلم سے۔

جادوگر

ایک پریشان حال نوجوان کی داستان جو اسے طلسماتی دنیا سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ پراسرار واقعات سے بھری دلچسپ سنسنی دار داستان ایم اے راحت کے قلم سے۔

تم سے دور نہیں

میں ہم ہوں کہ کائنات کی ہر شے فانی ہے لیکن مالک کائنات نے مجھے محبت دار مطا فرمائی ہے۔ مجھے اس کائنات سے شناسائی کی خدمت سونپی گئی ہے۔۔۔ غزالہ جلیل راہ کے قلم سے۔

توازنِ جرم

ایم الیاس کے قلم سے۔

لا حاصل

سعدیہ لیاقت کے قلم سے۔

گواہ

سلیم علی ہاشمی کے قلم سے۔

خزاں کے بعد

محمد سلیم اختر کے قلم سے۔

مہم

محمد صدیق طاہر کے قلم سے۔

سحرِ حیات

آخری صفحات پر ایم اے راحت کی دلچسپ معلوماتی تحریر۔

کرنیں صفحہ صفحات پر چٹکلے، لطیفے، تحریریں، اقوال، سنسنی خیزیاں۔ قارئین کے لیے جملہ تفاصیل، قارئین کی ارسال کردہ طرحی غزلیں، پھلجھڑیاں وغیرہ۔

اکتوبر 2013 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

شعاع

دگھنیر حجیل

خود آگہی

خط بھجوانے کے لیے پتا

ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ دہشت گردوں، بھتہ خوروں اور پاکستان دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے۔ آمین اس ماہ خطوط کے سلسلے میں ہماری دو مصنفین نے بھی شرکت کی ہے۔

پہلا خط ڈیرہ اسمٰعیل خان سے حیا بخاری کا ہے۔ حیا بخاری کی تحریریں شعاع اور خواتین میں شائع ہو چکی ہیں۔ لکھتی ہیں۔

میرے خط لکھنے کی پہلی وجہ سمیرا حمید کا "محبت من محرم" ہے کیا منظر نگاری کی ہے سمیرا نے اور مجھے قوی امید ہے کہ بہت ہی دلکش ناول ثابت ہو گا یہ دوسری وجہ ہے سمیرا گل کا اجالوں کا سفر۔

میرے شوہر بھی کافی شوق سے پڑھتے ہیں یہ دونوں رسالے "اسپیشلی خواتین۔ ان ہی کی نکالی گئی غلطیاں ان ہی کے الفاظ میں لکھ رہی ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ شاہ اپنی بیوی کو جبکہ وہ پریگننٹ بھی ہو اور غیر مسلم بھی۔ ایسے کبھی نہیں چھوڑتے۔ اور اپنی بیٹیوں کے بارے میں ان کے اصول بہت سخت ہیں۔ تب رحمت کمال شاہ کا الزبتھ کو اس حالت میں یوں چھوڑنا قطعی جھوٹ لگا۔

دوسری بات، سمیرا نے شادی جیسے مقدس بندھن کو بالکل مذاق بنا کے رکھ دیا۔ ہیلا یہ جانتے ہوئے بھی کہ مسلمان مرد کی بیٹی ہے اور عیسائی عقائد سے اختلاف رکھنے کی عقل رکھتی ہے۔ مگر ایک عیسائی سے شادی رچا لیتی ہے۔ اور پھر خاندانی دباؤ اتنی جلدی اس کی دوسری شادی کے لیے، جس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر زریاب کا فیصلہ وہ بھی سید مرد کا اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے لیے۔ سمیرا آپ کی تحریر سے میرے شوہر کو کم از کم بہت دکھ ہوا کہ ان کے مطابق یہ شمارے تو ہمارے ملک کے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی کثرت سے پڑھے جاتے ہیں، بلکہ ہماری بچیاں تو (گاؤں کی) اپنا جیب خرچ تک خرچ کر دیتی ہیں ان کو پڑھنے میں۔ (گاؤں میں ایک دن کا کرایہ 5 روپے ہے ایک شمارے کا) اس تمام مطالعے کے شوقین افراد میں کچے ذہن کے لڑکے، لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ تو کم از کم رائٹرز کو سنت رسول یعنی نکاح جیسی اعلا چیز کا یوں مذاق بنانا زیب نہیں دیتا۔ پھر ہیلا کے بچے کی یوں پیدائش اور ڈیتھ۔ یوں لگا سمیرا لکھنا کچھ اور چاہتی تھی اور لکھا کچھ اور۔

صدف آصف نے اچھا لکھا۔ عنیقہ کا افسانہ متاثر نہ کر سکا۔ اگر عظمیٰ محبت آزما کے اس کو چھوڑتی ہے تو پھر سچی محبت تو وہ خود بھی نہیں کرتی۔ امایہ خان نے زبردست لکھا۔ صلۂ رحمی کا موضوع بھی اچھا چنا۔ دیمک زدہ محبت بھی اچھا نہیں لگا۔

باقی تمام سلسلے اچھے تھے۔ خصوصاً "نبی کی باتیں" ہر دفعہ ہی روح تک میں سکون بھر دیتا ہے یہ سلسلہ۔

خط آپ کے میں پوچھا تھا ثمینہ اکرم، لیاری، کراچی غائب ہیں آج کل۔ عجیب سی دلی وابستگی سی ہے ان کے ساتھ۔

آخر میں فرمائش، عائشہ فیاض کو بہت مس کر رہے ہیں۔ کوئی افسانہ لکھوائیں ان سے۔

ج: پیاری حیا! سوائے انبیا علیہ السلام کے دنیا میں کوئی بھی انسان گناہوں اور غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان سے خطا اور غلطی ممکن ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ سید

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی بیوی اور بیٹی کو نہیں چھوڑتے غلط ہے۔ غلطی اور خطا کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ جہاں تک عیسائی سے شادی کا تعلق ہے تو بیلا اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئی تھی اور اپنے باپ کے لیے اس کے ذہن میں کوئی اچھا تاثر نہیں تھا۔ جو شخص اپنی بیوی اور اولاد کو اس طرح چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کی اولاد کے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہوں گے' اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ اعتراض درست ہے کہ اس نے دوسری شادی میں بہت جلدی کی اور زریاب کا فیصلہ بھی غیر حقیقی تھا لیکن حقیقت اور افسانے میں فرق تو ہوتا ہے نا۔

دوسرا خط گجرات سے مصباح نوشین نے لکھا ہے' لکھتی ہیں

مجھے بوند بوند تمنا شمارہ ایک قاری بہن کا تبصرہ بہت دکھی کر گیا۔ قارئین کہانی کو سمجھ کر غور سے کیوں نہیں پڑھتے؟ سمیرا حمید کا دل کتنا دکھی ہوا ہو گا۔ آپ کا جواب اچھا لگا۔ آپ نے انجانے میں میرے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

ج : پیاری مصباح! آپ خود کہانی کار ہیں' سمیرا حمید کے جذبات سمجھ سکتی ہیں۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ ہمارا دل بھی واقعی بہت دکھا ہے۔ خصوصاً" اس لیے کہ وہ خط لکھنے والی خود بھی عورت ہیں اور اعلا تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ آپ یقین کریں ہم نے اس خط کو بار بار پڑھا کیونکہ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کہانی پر ایسا تبصرہ بھی آ سکتا ہے۔

زر انصاری نے 100 کوارٹر کراچی سے لکھا ہے

میں آٹھویں کلاس میں تھی جب شعاع پڑھا۔ لیکن گھر والوں نے منع کر دیا۔ پھر میٹرک کے پیپر دینے کے بعد نمرہ احمد کے ناول سے باقاعدہ پڑھنا شروع کیا۔ ام مریم اور سائرہ رضا بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سائرہ رضا کا برف کا موسم بہت اچھا تھا۔

ج : پیاری زر! ام مریم اور سائرہ رضا تک تمہاری پسندیدگی آن سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثمینہ احمد' شہناز گل' شاہانہ رفیق' تحصیل علی پور بستی نرالی والا سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

آپی آپ کو اندازہ نہیں ہے ہمیں لیٹر پوسٹ کرانے کے لیے کن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ چھوٹے بھائی دانش کی منتیں کرنا پڑتی ہیں خط پوسٹ کرانے کے لیے۔ وہ کہتا ہے شائع تو ہوتے نہیں پھر کیا فائدہ۔

پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہونے کے بعد پہنچے۔ دیمک زدہ محبت کی طرف۔ علی کتنا بے وقوف ہے جو اس کی چالاکی کو سمجھ ہی نہیں رہا۔ "محبت من محرم" میں مجھے افق کا کردار بہت پسند آیا ماریہ کا ذکر نہیں کریں گی کیونکہ ہمیں اس کا کردار بالکل پسند نہیں۔ رقص بسمل۔ فارہ میری طرح بے وقوف ہے۔

ایک تھی مثال یہ کیا کتنی مشکلوں سے تو بشریٰ گھر آئی تھی۔ عدیل نے پھر اسے دھتکار دیا۔ اجالوں کا سفر بہت پیاری تحریر تھی۔ بڑے بھیا کراچی گئے ہیں تو انہوں نے کہا ہے کہ دیکھتے ہیں شعاع کی تم لوگوں سے محبت بھی کہ وہ تم سے اتنی محبت کرتا ہے۔

ج : ثمینہ! شہناز اور شاہانہ! ہمیں احساس ہے کہ چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں میں رہنے والی ہماری پیاری قارئین کو خط بھجوانے کے لیے کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ہم خطوط کو ایڈٹ کر دیتے ہیں تاکہ زیادہ خطوط شامل ہو سکیں۔

چھوٹے بھائی دانش کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں اور اسے یہ خط ضرور دکھائیں اور بڑے بھائی کو بتا دیں کہ ہمیں قارئین سے اتنی ہی محبت ہے' جتنی وہ شعاع سے کرتی ہیں۔

2010ء کی تحریر اتنی جلد دوبارہ شائع کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے معذرت۔

صبا عزیز' فوزیہ تشکیل سسٹرز سیٹلائٹ ٹاؤن میرپور خاص سندھ سے لکھتی ہیں

"دیمک زدہ محبت" بہت اچھا جا رہا ہے لیکن ماہم پر دل کھول کر غصہ آتا ہے۔ پلیز "ایک تھی مثال" میں عاصمہ کے ساتھ اب برا مت کیجیے گا۔ "رقص بسمل" میں تیمور کا کردار بہت اچھا ہے۔ نمرہ احمد کا انٹرویو شائع کریں ضرور' ضرور' پلیز' پلیز اور بندھن میں "فواد خان عاطف اسلم اور کرکٹر محمد حفیظ کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج : صبا اور فوزیہ! آپ کی تمام فرمائشیں نوٹ کر لی گئی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فوزیہ ثمرین اور طیبہ عمران گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

کون کہتا ہے نفرتوں میں درد ہے محسن
کچھ محبتیں بھی بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں

فرح ناز اور رخسانہ بشیر گجرات ہی میرا پیارا شہر ہے۔ میں کسی گاؤں میں نہیں رہتی۔ شعاع کا ٹائٹل اس بار ففٹی ففٹی رہا۔ پیاری نبی کی پیاری سی باتیں ہمیشہ ہی پرسکون اور پراثر ہوتی ہیں۔ انسان چاہے کتنا بھی گمراہ ہو جائے۔ اس کی فلاح اور بقا صرف اور صرف اسلام میں ہے۔ خدا اور اس کے رسول پاک سے محبت میں ہے۔

سب سے پہلے خط پڑھے۔ حرا قریشی کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے شعاع کی بیسٹ تحریر' دیمک زدہ محبت کو پڑھا۔

"ایک تھی مثال" کچھ رکا ہوا سا محسوس ہوا۔ ساری کہانی مزیدار تھی۔ کہانی میں دو پراسرار کردار۔ میرے خیال میں اب تو آٹھویں قسط ہو گئی۔ ان کی دونوں کرداروں کی اب پردہ داری ختم کریں۔

سمیرا حمید کا ناول "محبت من محرم" بہت اچھی تحریر تھی۔ صدف آصف پیا من بھائے۔ ہمارے معاشرے کی عکاس کرتی تحریر۔

افسانے اس بار سب ہی اچھے تھے۔ امتحان اچھا افسانہ تھا۔

ج : فوزیہ اور طیبہ! ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ پچھلے دو خط شامل نہ کر سکے۔ اس کا ہمیں بھی افسوس ہے۔ آپ کے خط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہیں ہو پاتے پچھلے ماہ آپ کا خط لیٹ ملا تھا اس لیے شامل نہ ہو سکا۔ اس ماہ لیٹ ملنے کے باوجود آپ کا خط شامل کیا جا رہا ہے۔ شعاع کی تحریروں پر تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

حنا سلیم اعوان گاؤں آخون بانڈی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

ستمبر کا شمارہ ہاتھ میں لیتے ہی ذہن میں پرانی یادوں کے دریچے کھل گئے تو بے اختیار وہ دور یاد آ گیا۔ جب اگست 2004ء کا سالگرہ نمبر اپنی کزن کے پاس دیکھ کر میرا دل مچل گیا۔ تب ہم پر بڑا کڑا وقت تھا۔ ابو جان شدید بیمار تھے۔ بلکہ بیڈ پر تھے۔ ابو ہی واحد کمانے والے ہیں تو جب وہ ہی بیمار ہو گئے تو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ میٹرک میں تھی میں۔ بھائی تینوں مجھ سے بہت زیادہ چھوٹے اور ابتدائی کلاسوں میں زیر تعلیم۔ بھلا ہو ابو جان کے دوستوں کا' جنہوں نے ہمارے برے وقت میں ہمارا بہت ساتھ دیا۔ اس وقت کو خوش اسلوبی سے گزارنے کے لیے میرے پیارے ابو جان نے مجھے شعاع کی طرف راغب کیا۔ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس جاتے تو واپسی میں میرے لیے شعاع لاتے۔ پھر اس میں میرا نام دیکھ کر بے انتہا خوش ہوتے۔ شعاع نے ہی مجھے جینا سکھایا' لوگوں کو فیس کرنا' رشتہ داروں کے بدصورت رویوں' جملوں کو سہنا اور برداشت کرنا۔ لوگوں سے بات کرنے کا سلیقہ' یہ سب مجھے شعاع کی بدولت ہی تو ملا۔ شعاع کے ذریعے میں اپنے ابو جان کو سلیوٹ پیش کرتی ہوں۔ (کیونکہ شکریہ تو غیروں کا ادا کیا جاتا ہے) پیارے ابو جان' آپ جیسا اس پوری دنیا میں کوئی نہیں۔ مجھے آپ کی بیٹی ہونے پر فخر ہے۔ ہمارے خاندان میں' میں پہلی لڑکی ہوں جس نے پرائمری کراس کی ہے۔ اس کے لیے بھی ابو نے اسٹینڈ لیا۔ خاندان والوں کی زد میں الگ آئے لیکن آج ان ہی لوگوں کی بیٹیاں ہائی اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے سب لڑکیوں کے لیے تعلیم کے بند دروازے کھول دیے ہیں۔

دعائے مغفرت

نفیسہ خان کے بھائی محمد کلیم قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ نفیسہ خان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور محمد کلیم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین۔
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اجالوں کا سفر" بیلا کی خوب صورتی نے انسپائر کیا۔ زریاب اور مہک کی کھٹی میٹھی نوک جھونک نے مزا دیا۔ "محبت من محرم" سمیرا حمید کی اسٹوری، سچ کہوں تو شروع میں بہت بور لگی۔ عدن اور ماریہ کے رویوں نے سخت بد دل کیا لیکن پھر افق کا کردار ہوا کے جھونکے کی طرح خوشگوار لگا۔ یہیں سے کہانی میں دلچسپی بڑھی۔ اگلی قسط یقیناً "بہت اچھی ہونے والی ہے۔ افسانے تمام ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔

ج : پیاری حنا! اپنے ابو کو ہمارا اسلام پیش کیجیے۔ وہ واقعی قابل تعریف ہیں۔ انہوں نے محبت سے آپ کی پرورش کی اور آپ کو مخالفت کے باوجود تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نثار حسین نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

جب بھی خط لکھنا چاہا طبیعت کی سستی آڑے آئی۔ نہ وقت کی قلت ہمیشہ وجہ بنی تو میرے لفظوں کی کم مائیگی۔ دل بسمل کا مہک مہک جانا اس آدھی ملاقات کو مکمل دماغ اس خواہش کو سرزنش کرنا کہ محبوب (شعاع) کے سامنے تھوڑا سج سنور کر جانا۔ تھوڑا لفظوں کا استعمال سیکھو تاکہ اک نظر پڑھی جائے۔

اس دفعہ کا پرچہ ہمیشہ کی طرح اچھا رہا۔ پرچہ کھولا، پہلی شعاع اندر آئی۔

سائرہ رضا کو نہ پاکر تشنگی محسوس ہوئی۔ مگر سمیرا حمید نے سیراب کر دیا۔ "محبت من محرم" پڑھ کر نجانے کیوں سفال گر" کی پہلی قسط یاد آ گئی۔ سمیرا حمید کی "بوند بوند تماشا" نے ایک سمندر کر دیا تھا آنکھوں میں سمیرا حمید کا قلم وقت کی گود میں نکھرتا جا رہا ہے۔

سمیرا اگل کا مکمل ناول عمیرہ احمد کے ناول ایمان اور محبت کا تھوڑا بہت عکس لیے تھا۔

"امایہ خان" اک شام کہیں آباد ہوئی پڑھتے ہوئے کئی بار آنکھیں نم ہوئیں۔ دیمک زدہ محبت بھی اچھی جا رہی ہے۔ بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا بہت اچھا سلسلہ ہے۔

ج : پیاری ثنا! بہت خوب صورت لفظوں میں خوش خط تحریر میں لکھا آپ کا خط بہت اچھا لگا لیکن ایک بات آپ کو بتا دیں۔ محبوب کے دل کو چھونے کے لیے خوب صورت الفاظ کی نہیں جذبوں کی صداقت درکار ہوتی ہے شعاع آپ کو پسند ہے۔ آپ اسے پڑھتی ہیں۔ ہمارے لیے سچائی سب سے انمول اور قیمتی احساس ہے۔ خواہ اسے کتنے ہی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں تحریر کیا جائے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سبین اجمل نے روہڑی سکھر سے لکھا ہے

میں پچھلے 18 سال سے آپ کے ادارے کی خاموش قاری ہوں۔ میری امی کسی زمانے میں لکھا کرتی تھیں جو اب انہوں نے کافی عرصے بعد لکھا ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ زندگی میں کبھی ضرور وہ تمام کہانیاں اور غزلیں شائع کرواؤں گی۔

"اجالوں کا سفر بھی سمیرا اگل نے اچھا لکھا۔ افسانوں میں امایہ خان نے "اک شام کہیں آباد ہوئی" میں تو ہلا کر رکھ دیا۔ ابھی مجھے میری بہن فرحین نے میسج کے ذریعے کہا ہے کہ آپ سے کہوں کہ آپ نمرہ احمد کا شکریہ ضرور ادا کر دیں ہماری طرف سے کہ انہوں نے اتنی اچھی تحریر لکھی۔ دوسرا یہ کہ رومانوی کہانیاں کم رکھیں کیونکہ ان سے بوریت ہوتی ہے اور پلیز رائٹرز کہانیوں کے کرداروں کے آسان نام لکھا کریں جو ہم آسانی سے پڑھ سکیں اور دنیا میں اس نام کے انسان بھی پائے جاتے ہوں۔ کچھ نام بہت ہی عجیب ہوتے ہیں۔

آپ کے رسالے لڑکیوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ اسے پڑھنا خرافات سمجھتے ہیں اور اپنے گھر کی خواتین پر سختی کرتے ہیں۔ اگر آپ کم از کم ماڈلز کو ڈوپٹا ہی اوڑھا دیا کریں اور کم میک اپ اور جیولری دکھائیں تو سادگی نمایاں ہو گی۔ (ہم نے بھی وہ کڑا وقت دیکھا ہے لیکن دیکھ لیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑا)۔

جو خط یا ای میل کے ذریعے تبصرہ نہیں کر سکتے تو کیا وہ msgs کے ذریعے اپنا تبصرہ آپ کو بھیج سکتے ہیں؟ پلیز.....

ج : سبین! آپ نے یاد کیا، بہت شکریہ۔ اپنی امی کی کہانیاں بھجوا دیں۔ اچھی ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ سروے کے سوالات ہر ماہ شائع کریں ... کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔ خط اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 18 تاریخ تک موصول ہو جائیں۔ آپ نے بہت اچھے مشورے دیے ہیں۔ عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اقراء نفیسہ اور صبا بکھر والی کلاں گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

آمنہ زریں سے ایک درخواست ہے اپنے ادب سے

بھی کچھ چرائیں نا۔ پلیز نانو تدبیہ کے "راجہ کدھ" پر ایک شاندار سا تبصرہ ایک افسانہ سوری ہم نے صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھا ہے تو اس کا حجم بہت بڑھ گیا ہے۔

ج : اقراء نفیسہ اور صبا۔ شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ نمرہ نے جنت کے پتے کا دوسرا حصہ لکھا تو ان شاء اللہ شعاع میں ہی شائع ہو گا۔ نمرہ احمد کا تعلق اسلام آباد سے ہے۔

آمنہ زریں تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

مسودہ آپ کسی بھی سادہ کاغذ میں پیک کر کے اس پر ایڈریس لکھیں اور ڈاک خانہ لے جائیں۔ وہ مطلوبہ ڈاک خرچ لے کر ہمیں بھجوا دیں گے۔ افسانہ یا ناولٹ کے متعلق معلوم کرنے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کر لیں۔ 32721666

یہ کراچی کا نمبر ہے۔ کراچی سے باہر رہنے والی بہنیں کراچی کا کوڈ 021 لگائیں۔

صفیہ عباس کروڑ لعل عیسن (لیہ) سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سمیرا حمید کا ناول "محبت من محرم" میں ایسی کھوئی کہ نیند بھی غائب ہو گئی۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ شام چھ بجے جب آخری صفحے پر پہنچی تو "باقی آئندہ ماہ" پڑھ کے دل بیٹھ گیا۔

سمیرا حمید کو خوب صورت ناول لکھنے پر مبارک باد۔ امید ہے عدن کے ساتھ انصاف ہو گا اور ماریہ کو اس کے کیے کی سزا ملے گی۔ عدن کی برداشت پر حیرت و دکھ ہوا۔

"دیمک زدہ محبت" بھی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے "ایک تھی مثال" میں عدیل کو ہر بار کیا ہو جاتا ہے؟ "اجالوں کا سفر" بھی بہت زبردست ناول تھا۔ محبت کا خوب صورت انجام دیکھ کر اچھا لگا۔ اس کے علاوہ ناولٹ پیا من بھائے اور افسانوں میں "امتحان" "اک شام کہیں آباد ہوئی" اور "بھرم" پسند آیا۔

ستمبر کے شعاع میں "نجمہ انور" نے سیالکوٹ سے کہانی کے بارے میں پوچھا۔

میں ان کو بتانا چاہوں گی کہ جس ناول کا انہوں نے پوچھا ہے اس کا نام "میں کی کریار مناواں" تھا۔ رائٹر کا نام نبیلہ ابر راجہ اس میں ہیروئن کا نام پروا اوزگل تھا اور ناول شعاع میں جنوری 2011ء میں شائع ہوا تھا۔

ج : پیاری صفیہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے اتنے ڈھیر سارے خط لکھے اور ایک بھی خط شامل نہ ہو سکا۔ آپ نے اتنا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ تحریر بھی صاف اور خوش خط ہے۔ ممکن ہے آپ کے خط ہمیں موصول نہ ہوئے ہوں یا تاخیر سے موصول ہوئے ہوں۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ شکریہ۔

ثمرین اکرام نے میرپور خاص سے لکھا ہے

ستمبر کے شمارے نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا پیارے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی پیاری باتیں ایمان تازہ کر گئیں "دیمک زدہ محبت" صائمہ اکرم کی خوب صورت تحریر ہے ماہم کی فطرت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ علی اور رامس بھائی ہیں۔ عائشہ کی غلط فہمی سمجھ میں نہیں آئی بغیر ملے اور بات چیت کیے ہی دل میں غلط فہمیاں پال لی ہیں اس نے۔ اب آتے ہیں اس شمارے کی سب سے خوب صورت تحریر کی طرف۔ مکمل ناول (اجالوں کا سفر) سمیرا اگل کی خوب صورت تحریر۔ یہ غالباً" نئی مصنفہ ہیں لیکن انداز تحریر غضب کا ہے۔ ناول نے شروع سے آخر تک اپنے حصار میں لیے رکھا۔

افسانوں میں سب سے اچھا اور سبق آموز "وہ جو نصیب ہے" لگا واقعی جو بھی کام دکھاوے کی نیت سے کیا جائے۔ اس میں نقصان کا احتمال بھی رہتا ہے اور گناہ کا

دعائے صحت

شاعرہ اور مصنفہ غزالہ جلیل راؤ کا ڈان دنوں شدید علیل ہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

اللہ تعالیٰ ان کو شفائے کلی عطا فرمائے۔ آمین۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سبب بھی بنتا ہے۔ عنیقہ محمد بیگ کا امتحان بھی پسند آیا۔
ج : پیاری ثمرین! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔ آپ کا تبصرہ تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

ترنیلہ غازی سے صبا طارق لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ماڈل کے کپڑے، نیکلس، ہلکا سا میک اپ اور ہونٹوں پر آئی دھیمی سی مسکان۔ سب بہت اچھا تھا۔ حمد و نعت بھی اچھے لگے۔ نبیلہ عزیز بہت اچھا لکھتی ہیں مگر اب کے ان کے ناول میں آفاق کی فارہ سے لاتعلقی کی وجہ جاننے کے لیے بے چینی سی ہے۔ دیمک زدہ محبت میں ماہم کی دھوکے بازیوں نے بہت پریشان کر دیا اور عائشہ کا سب کلیئر نہ کرنا اور بھی غصے کا باعث بن رہا ہے۔ رخسانہ نگار ویسے تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے ان کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ مگر اب کے ان کا گھریلو سیاستوں پر مبنی ناول اچھا نہیں لگ رہا دل کو۔ افسانوں میں امتحان اور بھرم دونوں پسند نہیں آئے۔ وہی پرانے موضوعات۔ اگر پرانے موضوعات کو چھوڑ کر دونوں رائٹرز کوئی نیا موضوع لکھیں تو انداز تحریر بہت متاثر کن ہے ان کا۔

ج : پیاری صبا! گول گپوں کی ترکیب ان شاء اللہ آئندہ ماہ یعنی نومبر کے شمارے میں شامل ہو گی۔ فواد خان کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی تعریف و تنقید کے لیے شکریہ۔

عائشہ اختر بٹ نے لکھا ہے

میری بھابھی، میری سسٹر اللہ رکھی اور میں آپ کے شمارے بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ رخسانہ نگار عدنان کا ایک تھی مثال اچھا جا رہا ہے۔ رقص بسمل کا تو جواب ہی نہیں۔

پیاری عائشہ! آپ نے بہت سمجھ داری سے کام لیا۔ سمجھوتا کرنے میں ہی عافیت ہے حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی میں کہیں نہ کہیں ہر کسی کو سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ آپ ذہین ہیں۔ پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھیں، چاہے پرائیویٹ ہی سہی۔ اپنی بہن اور بھابھی کا ہماری جانب سے شکریہ ادا کریں۔ کہانی کے لیے معذرت۔ فی الحال آپ صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

رمشا عظمت، صدف مختار نے بوسال قصور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اس دفعہ ٹائٹل بس سو سو ہی لگا۔ سب سے پہلے "دیمک زدہ محبت" پڑھا معذرت کے ساتھ صائمہ جی ابتدا میں یہ ناول جتنا متاثر کن تھا اب اتنا ہی بور ہوا جا رہا ہے۔ پلیز تھوڑی تیزی لائیں تحریر میں "رقص بسمل" نبیلہ عزیز کا یہ ناول امید ہے ان کی پہلی تحریروں کی طرح اچھا ہو گا خط لکھنے کی اصل وجہ سمیرا گل کا "اجالوں کا سفر" معذرت کے ساتھ اس تحریر نے بہت الجھایا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب بیلا مانیک کے پرپوزل کے لیے انکار کر چکی تھی تو اچانک سے مانیک کی ایک ہی حرکت پر فوراً ہی شادی کے لیے راضی ہو گئی، پھر رابرٹ کو جن کی وہ بہت فرماں بردار تھی بتانا بھی ضروری نہ سمجھا۔ پھر جب بیلا مسلمان ہو گئی تھی تو اس نے یقیناً اسلام کو بھی خوب سمجھا ہو گا۔ مگر جب وہ علی (مانیک) سے ملنے گئی اسے بدلا ہوا پا کر اس نے زریاب سے طلاق مانگ لی کیا وہ بھول گئی تھی کہ سب سے ناپسندیدہ فعل ہے جس سے آسمان بھی لرز جاتا ہے۔ جس طرح مضبوطی اور اطمینان سے اس نے طلاق کا مطالبہ کیا۔ حیرت ہوتی ہے۔ زریاب کی کوئی سمجھ نہ آسکی فاطمہ کے سامنے وہ مہک کو جلانے کے لیے ڈرامے کرتا اور تنہائی میں اس کے لیے جنونی ہو جاتا۔ درنایاب کے کردار کے سوا کسی کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں۔ "اک شام کہیں آباد ہوئی" امایہ خان جتنا خوب صورت نام۔ اس سے کہیں بڑھ کر تحریر، ہم ایسی تحریریں ہی تو شعاع کی زینت بنی دیکھنا چاہتے ہیں۔ نہایت سبق آموز اور دماغ کی گرہیں کھول دینے والی تحریر، حقیقت کا عکس لگی۔

"بھرم" اچھی تحریر لگی مگر باقی سب افسانے ایویں ہی لگے۔ ملک کے حالات جس ڈگر پر چل نکلے ہیں جس طرف دیکھیں زندگی سسکتی نظر آتی ہے۔ اس لیے ہلکی پھلکی تحریریں بھی شائع کیا کریں پلیز فائزہ افتخار، نمرہ بخاری کدھر ہیں آپ؟ ہم آپ کی تحریروں کی منتظر ہیں۔

ج : رمشا اور صدف! آپ کی کہانی موصول نہیں ہوئی۔ آپ میٹرک کی طالبہ ہیں اور اتنا اچھا خط لکھا۔ بہترین تبصرہ، موتیوں جیسی تحریر۔ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں شان دار کامیابی دے۔

سونیا خان اور شبنم لکانوالہ گاؤں، ہڑپہ شہر سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

رسالہ ہمیں ہر دفعہ شہباز لا کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو اسے بہت چکر لگانے پڑتے ہیں لیکن اس بار شعاع 3 کو ہی مل گیا۔ لفافہ شہری نے لا کر دیا تھا اور خط زاہد نے پوسٹ کیا تھا۔ یہ تینوں میرے کزنز ہیں۔

پیارے نبی کی پیاری باتیں سے فیض یاب ہوئے چوسر کھیلنے کے بارے میں پڑھا اور آگہی ملی ہمارے گاؤں میں لوگ یہ کھیل کھیلتے ہیں لیکن اب ہم تو اس حدیث پر عمل کریں گے ان شاء اللہ "رقص بسمل" اچھی تحریر ہے۔ لیکن اسے زیادہ طویل نہ کیجیے گا۔ ایک تھی مثال کی رفتار بڑھائیں۔ عنیقہ بیگ نے اچھا لکھا۔ امایہ خان کی تحریر پسند آئی۔ بھرم بھی اچھی تحریر تھی "وہ جو نصیب ہے" بھی سبق آموز تحریر تھی۔

ج : سونیا اور شبنم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اپنے کزنز کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں۔ کہانی قابل اشاعت نہیں فی الحال صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔ اچھی کہانیاں پڑھیں۔

مسز سائرہ جمیل، سپر ٹاؤن والٹن روڈ لاہور کینٹ سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو کہوں گی کہ صائمہ اکرم چوہدری کی "دیمک زدہ محبت" بہت ہی خوب صورتی سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ سمیرا گل کا "اجالوں کا سفر" بہت اچھا لگا۔ محبت من محرم بہت ہی خوب صورت تخلیق ہے سمیرا حمید کی اور سچ تو یہ ہے کہ آج حقیقتاً "دولت کے لیے لوگ عزت کو بھی داؤ پر لا دیتے ہیں۔ بے چارہ طمع و حرص کا مارا انسان۔ سب سے خوب صورت افسانہ "ایک شام کہیں آباد ہوئی لگا۔ امایہ خان صاحبہ آپ نے تو حقیقتاً "رلا دیا۔ صدف آصف نے "پیا من بھائے" لکھ کر بہت سی ایسی لڑکیوں کی آنکھیں کھولی ہوں گی جو خیر سے سسرال جانے سے پہلے ہی سسرالی رشتے داروں کو دشمن تصور کر لیتی ہیں۔

ج : پیاری سائرہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ پڑھ کر رائے دے سکتے ہیں آپ ایک ماہ بعد فون کر کے پتا کر لیں۔

ماریہ ریاض، چورنڈ سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

کسی ناول یا افسانے پہ تبصرہ نہیں کروں گی اس لیے کہ یہ سب ہی بہت اچھے ہیں۔ میں نے یہ خط طاہرہ بتول کے لیے لکھا ہے طاہرہ سے میں یہ کہنا چاہوں گی۔ آپ کے شوہر جاہلوں جیسی سوچ رکھتے ہیں۔ آپ صبر کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے گا۔ آپ شعاع بالکل مت چھوڑیے گا کیونکہ یہ آپ کو حوصلہ دیتا ہے اور آپ کا دل بہلانے کا ذریعہ بھی ہے۔ جن بہنوں نے جولائی میں طاہرہ کی زندگی پہ تبصرہ کیا تھا انہیں میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ اس طرح کسی کی دل آزاری نہ کریں۔

ج : ماریہ! ہم آپ سے متفق ہیں۔ اس طرح کے تبصرے کرنے والے ساحل کے تماشائی ہوتے ہیں جنہیں سمندر کے تھپیڑوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔

"زرد موسم" اور "داسی ڈھولن یار دی" کتابی شکل میں آگیا ہے آپ اپنے شہر میں پتا کر لیں اگر وہاں نہ ملے تو 021-32214341 نمبر پر فون کر کے یہ دونوں ناول منگوا سکتی ہیں۔ کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔

سلمیٰ قمر چیچہ وطنی سے شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں

ایک ہی نشست میں رسالہ ختم۔ بھئی صفحات تھوڑے بڑھا میں ناں۔

نبیلہ عزیز کا "رقص بسمل" یقیناً ایک اچھی تحریر ہے "ایک تھی مثال" رخسانہ جی یہ تحریر آپ کے انداز سے تھوڑی ہٹ کر ہے۔ سمیرا حمید کی "محبت من محرم" کی تعریف نہ کرنا یقیناً ناانصافی ہو گی۔ تحریر کی روانی اور برجستگی سے بالکل بھی نہیں لگتا کہ یہ کوئی نو آموز رائٹر ہیں۔ بے حد خوب صورت تحریر ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ "اجالوں کا سفر" بہترین ناول تھا "پیا من بھائے" پر انا ٹاپک کوئی خاص متاثر نہ کر سکی۔ اس دفعہ شمارے میں سب سے زبردست چیز "تاریخ کے جھروکے" اور "سیر دو جہاں" تھی "زمین کے آنسو" پڑھ کر مجھے ہسٹری سے کافی دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔

مختصر تحریریں بھی اچھی تھیں اور شاعری کا ایک صفحہ غائب! بھئی اس میں ڈنڈی نہ مارا کریں یہی سے تو ہمیں SMS کے لیے اچھے اچھے اشعار ملتے ہیں۔

ج : سلمیٰ! آئندہ خیال رکھیں گے کہ اشعار کے صفحات کم نہ ہوں۔ تاریخ کے جھروکوں سے میں آپ کو قرآن

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک کی ترتیب کے بارے میں مضمون اچھا لگا۔ بہت شکریہ۔

آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی ۔ آپ 32721666 پر فون کرکے پتا کرلیں کراچی کا کوڈ 021 ہے۔

افشاں خان اور عطیہ حق نواز نے شاہ پور چاکر سے لکھا ہے

ٹائٹل سے لے کر اینڈ تک شعاع ہٹ رہا۔ خصوصاً "تاریخ کے جھروکوں سے" میں مصحف قرآنی کی تاریخ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا اور قسط وار ناول نے ہمیشہ کی طرح گرفت میں رکھا۔ اس بار بازی اسی نے ماری "اجالوں کا سفر" بیلا اور مانیک کو واقعی اجالوں کی طرف لے گیا۔ "محبت من محرم" کا سحر ابھی تک طاری ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ "پیا من بھائے" اچھا سبق دے گیا۔ افسانے تمام بہترین تھے۔ "بھرم" نمبرون رہا۔

ج : افشاں اور عطیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا تفصیلی تبصرہ شائع نہ ہو سکا۔ خط شائع نہ ہونے کی ایک وجہ تاخیر سے موصول ہونا ہوتی ہے پھر صفحات کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم تمام خطوط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں اور برجہ ترتیب دیتے ہوئے آپ کی پسند' ناپسند کو سامنے رکھتے ہیں۔

حیا بلوچ نے شوالہ خوشاب سے شرکت کی ہے لکھا ہے

اس بار واقعی شعاع نے دل خوش کر دیا۔ حمد' نعت پڑھنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں پڑھیں جو بہت زیادہ پسند آئیں اس کے بعد اپنے پسندیدہ ناول پڑھے "ایک تھی مثال" بہت اچھی جا رہی ہے۔ نبیلہ عزیز کی "رقص بسمل" تو مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔ اس بار "دیمک زدہ محبت" میں خاص روانی نہیں تھی۔ سائرہ یوسف کا انٹرویو ضرور شامل کیجیے گا۔

ج : پیاری حیا! آپ کے پچھلے خط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہو سکے۔ اگست کے شمارے کا اس بار شامل کر رہے ہیں کہ آپ کی شکایت دور ہو جائے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکر۔

ساجی عاصم نے ٹنڈو آدم سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ماڈل کا جدید تراش خراش کا لباس نظر انداز کرتے ہوئے بھاگم بھاگ بشریٰ کے کمرے میں گئے کہ دیکھیں ایسی عورتیں مرد کی بھی مانتی ہیں یا فقط گھر اجاڑتی ہیں وہ بھی ہنستے بستے۔ "محبت من محرم" ہائے سمیرا جی..... یہ تو ہمیشہ دریا کو کوزے اور سمندر کو مٹھی میں بند کر لیتی ہیں۔ واہ مکمل ناول آیا..... ان کا تو ناولٹ یا افسانہ پڑھ کر ہی ذہن جسم و جاں تھک سا جاتا ہے۔ لفظوں کو سمجھ سمجھ کر' کرداروں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر۔ منظر نگاری کو خود تراش تراش کر ہلکان ہوتے ہوئے جب "باقی آئندہ" دیکھا تو یقین جانیے منہ کا ذائقہ ایسا بد مزہ ہوا جیسے نیم کا شربت یا کریلوں کا جوس پی لیا ہو۔ سمیرا جی اسے لکھنا تو نہیں کہتے۔ اسے تو حصار باندھنا کہتے ہیں۔ آپ تو ساحرہ ہیں۔ جادوگر ہیں۔ جادو بھی وہ جس کا توڑ نہ جوڑ۔ ماریہ جیسی عورت تو عورت کے نام پر بدنما دھبہ ہے۔ سمیرا جی سے یہ کہنا ہے کہ بس کچے ذہن متاثر نہ ہوں۔ کچھ ایسا انجام کیجیے گا ماریہ کا۔ مجھے نہیں پتا سمیرا جی کو کھینچ کھانچ کر "روبرو" میں لائیں۔ باقی سارا شمارہ زبردست ہے مستقل سلسلے بھی اے ون رہے۔ باجی پلیز پلیز بلوچستان کے مایہ ناز مصنف "ہاشم ندیم کا فیملی انٹرویو کریں۔

ج : پیاری ساجی! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ سمیرا حمید کے سلسلے میں آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کے جوابات کے لیے تھوڑا سا انتظار کریں۔ سمیرا آپ کو خود ان سوالات کے جواب دیں گی۔ ہاشم ندیم کا انٹرویو ضرور شامل کریں گے۔ تھوڑا انتظار کریں۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نبیلہ عزیز

تصویر ادھوری

ماورا مرتضیٰ، عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایرپورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا کو جانا پڑتا ہے۔

منزہ ثمینہ تیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ منزہ رحیم، آفاق کی بدتہذیبی پر اس سے خفا ہو کر واپس لوٹ آتی ہیں۔ آفاق مسلسل شش و پنج کا شکار ہے۔ وہ فارہ کو فون کر کے اس سے شادی کرنے سے معذرت کر لیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔

تیمور کو پتا چلتا ہے کہ ولید کرائم رپورٹر بن گیا ہے تو وہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ عزت، ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے۔ عافیہ بیگم، ماورا کو موبائل خریدنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ تیمور ایک میٹنگ کے سلسلے میں فیصل آباد جاتا ہے۔ واپسی میں ٹریفک جام میں اس کی نظر بس میں بیٹھی ماورا پر پڑ جاتی ہے۔ وہ اسے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

چوتھی قسط

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتنے ہنگامہ خیز ماحول میں اتنا پرسکون منظر تیمور حیدر کے لیے اچنبھے کا باعث تھا۔
بس کے تمام شیشے اتنی شدید گرمی اور حبس کی وجہ سے اوپر چڑھا دیے گئے تھے۔ اس لیے بس کے اندر کی صورت حال بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بس لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اتنی کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔
اور وہ تھی کہ کھڑکی کے بالکل ساتھ بیٹھی انتہائی پرسکون اور آس پاس کے ماحول سے بے خبر کوئی میگزین پڑھنے میں مصروف تھی۔ یوں جیسے وہ اس ٹوٹی پھوٹی سی بس میں نہیں، بلکہ اپنی ذاتی لگژری گاڑی میں براجمان ہو۔
تیمور حیدر کو اس افراتفری کے ماحول میں حقیقتاً "اس لڑکی کے سکون اور لاپروائی نے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ متاثر تو وہ اس کی صورت سے بھی ہو چکا تھا اور اس کی نظریں اسی پہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ پہلے ناواقفتہ اور اب وہ اسے دانستہ دیکھ رہا تھا۔
بار بار دیکھ رہا تھا۔
اسے دیکھتے ہوئے تیمور حیدر کو یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اسے اس کوفت زدہ بے زار کن اور ہنگامہ خیز ماحول میں پھنسے ہوئے کتنی دیر گزر گئی ہے اور وہ کب سے اپنے آس پاس کو فراموش کیے بیٹھا ہے۔
اور شاید اسی فراموشی کے عالم میں اسے اتنی دیر اور گزر جاتی۔ اگر حماد رحیم دوبارہ کال کر کے مداخلت نہ کرتا۔
اس نے ایک دم چونکتے ہوئے کال ریسیو کی۔
"ہیلو۔!" تیمور حیدر کی بے دھیانی اس کے ایک "ہیلو" سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔
"ارے یار۔! کہاں رہ گئے؟ اتنی دیر ہو چکی ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ بس گھر پہنچ رہے ہو۔" حماد پریشان ہو رہا تھا۔
"بس یار۔! ٹریفک جام میں پھنس گیا ہوں۔ راستے میں شاید کوئی ٹرالر الٹ گیا ہے۔ اس لیے ساری سڑک بلاک ہو چکی ہے۔" تیمور نے فون پر حماد کو جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر اس بس کی کھڑکی کی سمت دیکھا۔ جس کا پرسکون منظر اب ذرا حرکت میں تھا۔
وہ ہاتھ میں پکڑا میگزین تہ کر چکی تھی اور اپنی گداز کلائی موڑ کر سرخ چین والی رسٹ واچ سے ٹائم دیکھ رہی تھی۔
گویا اب اسے بھی وقت کا احساس ہو چکا تھا۔ اس کے اس احساس پہ تیمور حیدر کو بے ساختہ اک بے چینی سی ہوئی تھی اور اس کا دھیان حماد کی کال کی طرف سے ہٹ گیا۔
"اوہ نو۔! میں آجاؤں تمہیں لینے کے لیے؟" حماد کی پریشانی بڑھ گئی۔
لیکن تیمور حیدر بھلا کب سن رہا تھا۔ اس کا تو سارا دھیان صرف اس بس کی طرف تھا۔
"تیمور! میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کہاں ہو؟ سن بھی رہے ہو یا نہیں؟" حماد اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔
"ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کہو! کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بڑی مشکل سے متوجہ ہوا تھا۔ کیونکہ اس کا سارا دھیان تو بس کی طرف تھی۔ وہ بس آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی چند انچ آگے بڑھ گئی تھی اور اس لڑکی کا چہرہ تیمور کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اب اسے اس کا سفید اور سرمئی امتزاج کا دوپٹا کھڑکی سے جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔
تیمور کی کوشش تھی کہ وہ بھی کسی طرح اپنی گاڑی کو تھوڑا آگے لے جائے۔ تاکہ وہ پھر سے اسے واضح دیکھ سکے۔
"میں کہہ رہا ہوں کہ کیا میں آجاؤں تمہیں لینے کے لیے؟" حماد کو اب غصہ آنے لگا تھا۔ وہ تیمور کی غائب دماغی اور "ہوں ہاں" سے زچ ہو چکا تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں یار۔! کوئی فائدہ نہیں ہے تمہارے آنے کا۔ میں ٹریفک کے بالکل سینٹر میں ہوں۔ نہ آگے بڑھنے کا راستہ ہے، نہ پیچھے ہٹنے کا۔ تم یہاں آ کر بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے۔" تیمور نے اسے ساری صورت حال سمجھائی۔
"گویا تم وہاں یوں پھنس گئے ہو کہ جیسے کوئی کسی کی محبت میں پھنس جاتا ہے۔ نہ آگے بڑھنے کا راستہ، نہ پیچھے ہٹنے کا۔" حماد نے قہقہہ لگا کر کافی برجستہ کہا۔
"ہاں۔۔۔! لگ تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے۔" تیمور کی نظریں پھر سے اس بس کی کھڑکی پہ جا ٹھہریں۔
"تو پھر کیا کرو گے اب؟" حماد نے اب کی بار ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"کوشش۔۔۔!" تیمور کا جواب کافی مختصر سا تھا۔
"کس چیز کی؟" حماد نے ناسمجھی سے پوچھا۔
"آگے بڑھنے کی یا پیچھے ہٹنے کی۔" تیمور حیدر کے اس وقت جواب ہی کچھ اور تھے۔ جن کو فی الحال حماد رحیم بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا۔
"مسٹر تیمور حیدر۔۔۔! مرد وہی ہوتا ہے، جو آگے بڑھے۔ پیچھے ہٹنا مردوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اس لیے جیسے بھی سہی بس جلدی گھر پہنچو۔ ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور ممی تو کافی پریشان بھی ہو رہی ہیں تمہارے لیے۔" حماد نے اسے تاکید کی۔
"اوکے۔۔۔! بس تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گا۔ ٹریفک آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ شاید راستہ کھلنے والا ہے۔" تیمور کی نظریں ٹریفک پہ ہی تھیں۔
"اوکے۔۔۔ اللہ حافظ۔" حماد نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
تیمور نے سیل فون ڈیش بورڈ پہ رکھا اور گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھا کر اس بس کے برابر لے آیا۔ اب ذرا قریب آجانے پہ وہ اسے اور بھی واضح دیکھ رہا تھا۔
اور شاید یہ تیمور حیدر کی پرشوق نظروں کی محویت کا اثر تھا کہ وہ لڑکی ذرا سا چونک گئی۔ اس نے بے ساختہ بائیں طرف کھڑی گاڑی کی سمت دیکھا۔
وہ سیاہ لینڈ کروزر تھی۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا وہ شاندار پرسنالٹی کا مالک شخص اسے ہی دیکھے جا رہا تھا اس کے اس طرح دیکھنے پہ اس لڑکی کے ماتھے پہ ناگوار سی سلوٹیں پڑ گئیں۔ جن کو دیکھ کر تیمور حیدر کو سخت شرمندگی ہوئی۔ اس نے سر جھکا کر اپنی نظریں اس کی طرف سے ہٹا لیں۔
لیکن وہ زیادہ دیر اس کی طرف سے لاتعلق نہیں رہ سکا۔
کیونکہ اچانک راستہ کھل گیا اور ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ ٹریفک کسی سمندری ریلے کی طرح آگے کو بڑھا۔
اور تیمور حیدر نے وہ حرکت کر ڈالی، جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی ایسا بھی کر سکتا ہے۔
حیدر گروپ آف انڈسٹریز کا مالک تیمور حیدر اس وقت بس میں سوار ایک لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا۔ کوئی دیکھ لیتا تو ایشو بنا دیتا۔
لیکن تیمور حیدر اس وقت اپنی ساکھ، اپنی پرسنالٹی اور اپنی عزت، سب کچھ پس پشت ڈالے بس اس لڑکی کا اتا پتا جاننے کی کوشش میں تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اب اگر اس لڑکی کے بارے میں پتا نہ چلا تو پھر کبھی پتا نہیں چلے گا اور وہ اسے ڈھونڈتا رہ جائے گا۔
لیکن اسے کیا پتا تھا کہ وہ اس کا پیچھا کرنے کے بعد بھی اسے ڈھونڈتا ہی رہ جائے گا۔
ملگجے سے اندھیرے کی وجہ سے تیمور کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ لڑکی نجانے کب اور کس بس اسٹاپ پر اتر گئی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیونکہ بس جہاں جہاں رکتی تھی، وہاں چار پانچ لوگ ضرور اترتے تھے اور وہ بھی کہیں انہی لوگوں کے ساتھ بس سے اتر گئی تھی۔

"اوہ شٹ!" تیمور حیدر کو جب اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اسٹیرنگ پہ مکا رسید کر کے رہ گیا۔ اس کی ساری کوشش رائیگاں چلی گئی

☆ ☆ ☆

ماورا اپنی بس کے ساتھ ساتھ آنے والی گاڑی کو دیکھتے ہوئے مشکوک ہو گئی۔ کیونکہ اس نے کافی دیر سے اس گاڑی میں براجمان آدمی کو اپنی سمت دیکھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ چنانچہ وہ اس آدمی کی کسی اگلی حرکت سے بچنے کے لیے اپنے مطلوبہ بس اسٹاپ پہ اترنے کی بجائے اس سے ایک اسٹاپ پہلے ہی اتر گئی اور پھر وہاں سے باقی کا راستہ پیدل چلتی ہوئی گھر تک آئی تھی، گھر آکر بھی وہ اس آدمی کی حرکت کو ذہن سے محو نہیں کر سکی۔

"السلام علیکم!" اس نے اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! کہاں رہ گئی تھیں تم؟ اتنی دیر کیوں لگادی؟" عافیہ بیگم اس کے لیٹ ہونے پر پریشان تھیں۔

"سوری امی۔۔۔! یونیورسٹی کے بعد مارکیٹ چلی گئی تھی۔ وہاں سے سیل فون اور سم کارڈ لینے میں ہی اتنا ٹائم لگ گیا تھا اور باقی کی رہی سہی کسر راستے میں پوری ہو گئی۔ روڈ پہ گندم سے لوڈڈ ٹرالر الٹ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اتنی دیر سڑک بلاک رہی۔۔۔ اور وہاں تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے پورا شہر اسی ایک روڈ پہ ہی جمع ہو گیا ہو۔" ماورا تھکے تھکے انداز میں کہتی ہوئی صحن میں بچھی چارپائی پہ ہی بیٹھ گئی۔

"اوہ! ایک تو یہ بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ روز کسی نہ کسی وجہ سے سڑکیں بلاک ہو جاتی ہیں۔" عافیہ بیگم خفگی سے کہتے ہوئے جائے نماز بچھا کر مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں۔ اتنے میں بی گل نماز سے فارغ ہو کر ماورا کے پاس ہی آبیٹھیں۔

"لے لیا تم نے سیل فون اور نمبر وغیرہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔۔۔! لے لی ہے۔ یہ دیکھیں۔" ماورا اپنے بیگ سے موبائل سیٹ کا ڈبا نکالتے ہوئے بولی۔ اس نے پیکنگ کھول کر انہیں وہ سیٹ دکھایا اور اس کے بعد وہ سم ایکٹیویٹ کروانے میں لگ گئی اور یوں تھوڑی دیر کے لیے اس آدمی کی حرکت اس کے ذہن سے محو ہو گئی۔

اس کا ذہن اپنی اس چھوٹی سی خوشی میں مگن ہو چکا تھا۔ جس پہ عافیہ بیگم بھی خوش تھیں۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے تیمور بھائی! آپ آج کچھ غیر حاضر سے لگ رہے ہیں؟"

یہ فارہ کا حوصلہ تھا کہ وہ دل پہ پتھر رکھے سب کے سامنے نارمل نظر آنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔

"غیر حاضر۔۔۔ مطلب۔۔۔؟" تیمور نے چونک کر پوچھا۔

"غیر حاضر کا مطلب ہے کہ آپ یہاں ہمارے پاس ہو کر بھی ہمارے پاس نہیں لگ رہے۔ کہیں اور ہی پہنچے ہوئے ہیں۔" فارہ کا اندازہ درست تھا۔ تیمور بے ساختہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

"ارے نہیں۔۔۔! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس تھوڑا تھک گیا ہوں آج۔" اس نے ذرا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے بیٹا۔۔۔! تم تھک گئے ہو تو آرام کرو نا۔ یہ بے وقت محفل لگانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ حماد! جاؤ بیٹا، تیمور کو بیڈ روم تک چھوڑ آؤ۔ اسے آرام کرنے دو۔ ویسے بھی کافی ٹائم ہو رہا ہے۔" منزہ رحیم، تیمور کی تھکن کا سن

کر فوراً اس کے آرام کے لیے فکر مند ہو گئیں۔

"ارے! نہیں نہیں آنٹی۔۔۔! اب ایسی بھی تھکن نہیں ہے کہ میں سر شام ہی کھانا کھا کر بستر پہ جا کے لیٹ جاؤں۔ ابھی تو مجھے فارہ کے ہاتھ کی چائے بھی پینی ہے۔" تیمور نے کہتے ہوئے فارہ کی سمت دیکھا۔ وہ اس کی فرمائش پہ مسکرا دی۔

"ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" فارہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔

"ہاں۔۔۔! ایسے مہمان روز روز نہیں آتے۔ بلکہ زبردستی لائے جاتے ہیں۔" حماد بے ساختہ جل کے بولا۔ تیمور اس کے انداز پہ بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔ آج واقعی حماد نے اسے مہمان بنانے کے لیے بڑے جتن کیے تھے۔

"ہاں۔۔۔! یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ کراچی والے نہ خود کسی کے مہمان بنتے ہیں اور نہ کسی اور کو اپنا مہمان بننے دیتے ہیں۔ بس ان کو کام کے علاوہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔" فارہ جاتے جاتے ٹھہر گئی اور پھر تیمور کی سمت دیکھتے ہوئے کافی خفگی کا اظہار کیا۔

"اف۔۔۔! یہ کس کس کا غصہ مجھ پہ نکالا جا رہا ہے آج۔۔۔ کیا مجھے اسی لیے مہمان بنایا گیا ہے کہ رات بھر شہر والوں کا نام لے لے کر طعنے دیے جائیں؟" تیمور نے مصنوعی بوکھلاہٹ کا اظہار کیا۔ جس پہ وہ تینوں ہنس پڑے۔

"جی ہاں۔۔۔! ایک ہی مچھلی سارے تالاب کو گندا کرتی ہے۔ اسی طرح ایک شخص کی حرکت پہ پورا شہر بدنام ہو جاتا ہے اور آپ جیسے اچھے لوگ بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔" فارہ کی بات تیمور کے دل کو لگی تھی۔

"بالکل۔۔۔! یہ تو تم سو فیصد درست کہہ رہی ہو۔ جیسے ایک شخص کی وجہ سے پورا شہر برا لگنے لگتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی کسی ایک شخص کی وجہ سے پورا شہر اچھا بھی لگنے لگتا ہے۔ ہر چیز اچھائی کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔" تیمور کا دھیان پھر اس لڑکی کی طرف چلا گیا اور اس کے بعد بھی وہ رات بھر اسے ہی سوچتا رہا تھا۔

اس لڑکی میں نجانے کیسی کشش تھی، جو تیمور حیدر کو پوری طرح سے اپنی سمت کھینچ چکی تھی۔ اور وہ چاہ کر بھی اس کی طرف سے دھیان نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

وہ فیصل آباد کی سڑکوں اور بسوں میں بھٹک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں سوز محبت ہوں
میں ایک قیامت ہوں
میں اشک ندامت ہوں
میں گوہر یک دانہ
میں نعرہ مستانہ
میں شوخی رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں؟
پی کر بھی کہاں جانا۔۔۔؟
میں نعرہ مستانہ۔۔۔!

اس کے بیڈ روم میں عابدہ پروین کا "نعرہ مستانہ" آج بھی اونچی آواز میں گونج رہا تھا اور وہ ٹیرس پہ کھڑی اسے سننے میں محو تھی۔ فضا میں اچھی خاصی خوشگواریت محسوس ہو رہی تھی اور اس خوشگواریت کی بڑی وجہ تھی کہ آج

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا بہت تیز تھی اور سورج کے تن پہ سرمئی بادلوں کا ملگجا سا لباس نظر آرہا تھا۔ جس کی وجہ سے سورج غروب ہونے سے پہلے ہی موسم اور ماحول ٹھنڈے اور خوشگوار سے لگنے لگے تھے۔ موسم سے لطف اٹھانے کے لیے وہ ٹیرس پہ نکل آئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پہ رکھے سر اٹھائے آسمان کی وسعتوں میں دیکھ رہی تھی' جب اچانک اس کی سماعتوں سے قدرے مانوس سی آواز ٹکرائی تھی۔

"تیمور صاحب کہاں ہیں....؟" عزت نے اس آواز پہ ایک دم چونک کر نیچے دیکھا۔ ولید رحمان گیٹ کے قریب کھڑا ملازم سے تیمور کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"صاحب....! وہ تو شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا کیا؟" ملازم کو حیرانی ہوئی۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ہمہ وقت باخبر جو رہتے تھے۔

"نہیں.... وہ دراصل میرا اس سے کانٹیکٹ نہیں ہو رہا۔ اس لیے مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہے۔ شہر میں یا شہر سے باہر۔" ولید نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوہ! اچھا اچھا.... وہ تو شاید فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ مگر امید ہے کہ آج یا کل واپس آجائیں گے۔" ملازم نے تفصیل سے بتایا۔

"اوکے....! جب وہ آئے تو اسے میرا بتا دینا کہ میں آیا تھا۔" ولید کہہ کر پلٹ گیا۔

"رئیس....!" عزت نے بے اختیار ملازم کو پکارا اس کی آواز پر گیٹ کی سمت بڑھتے ہوئے ولید کے قدم بھی رک گئے۔ اس نے ٹھٹک کر ٹیرس کی سمت دیکھا۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔

"جی.... بی بی جی....!" ملازم نے فوراً تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

"ولید صاحب کو اندر ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آرہی ہوں۔" ملازم کو حکم صادر کر کے وہ اپنے بیڈ روم کی طرف پلٹ گئی۔ ولید اس کے حکم پہ جز بز سا ہو کے رہ گیا۔

عزت نے بیڈ روم میں آکر ڈیک آف کیا۔ پھر اپنا پسندیدہ پرفیوم اسپرے کر کے نازک سے فلیٹ سینڈل پہنے اور بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ نیچے ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔ وہ سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آگئی۔

"نوری....!" اس نے کچن کی طرف جاتی ملازمہ کو آواز دی۔

"جی.... بی بی جی...." نوری فوراً اس کی طرف پلٹی۔

"ڈرائنگ روم میں کچھ ٹھنڈا وغیرہ بھجواؤ۔" اس نے اشارہ کیا۔

"جی....!" نوری سر ہلا کر پلٹ گئی۔

عزت اطمینان سے قدم اٹھاتی اندر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"السلام علیکم!" ولید اسے دیکھتے ہی صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام! تشریف رکھیے۔" عزت نے صوفے کی طرف اشارہ کیا مجبوراً ولید کو دوبارہ بیٹھنا پڑا۔ لیکن اس کا چہرہ اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

"کیسے ہیں آپ....؟" عزت نے خود ہی بات کا آغاز کیا تھا کیونکہ ولید رحمان کی طرف تو ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے....! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں' آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" مروتاً ولید کو بھی اس کا حال احوال پوچھنا ہی پڑا۔

"میری طبیعت اس روز سے سنبھلی نہیں ہے ولید صاحب....! بلکہ اور بگڑ گئی ہے۔" عزت کا لہجہ عجیب سا تھا۔ جس پہ ولید نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیوں؟ کیا ہوا آپ کو؟" ولید کا سوال بے ساختہ تھا۔
"یہی جاننے کے لیے تو آپ کو اندر بلایا ہے۔" عزت کا لہجہ ایک پل میں دھیما پڑ گیا۔
"کیا مطلب؟ کیا جاننے کے لیے۔۔۔؟" ولید کے دماغ میں ٹک ٹک سی ہونے لگی تھی۔ جیسے پھر سے کوئی بم بلاسٹ ہونے والا ہو۔
"یہی کہ کیا آپ بھی وہی محسوس کر رہے ہیں جو میں کر رہی ہوں؟"
ٹک ٹک کی آواز ایک دم تیز ہوتے ہوتے پھٹ گئی۔
بم بلاسٹ ہو چکا تھا۔
اور ولید رحمان جہاں کا تہاں دھک سا رہ گیا۔ یعنی وہی ہوا' جس کا اسے ڈر تھا۔ یہ عجب اتفاقاتِ زندگی ہیں کہ عموماً" وہی ہوتا ہے۔ جس کا ڈر ہوتا ہے۔
عزت حیدر بھی اسی حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ جس سے وہ نظریں چراتا پھر رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس حادثے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا۔
"میں سمجھا نہیں؟" ولید نے انجان بننے کی حد کر دی۔
"سمجھی تو میں بھی نہیں۔ مگر سمجھنے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں۔۔۔ پلیز! ہو سکے تو میری مدد کریں۔۔۔ میں تھک چکی ہوں۔ میں اس حادثے سے نکلنا چاہتی ہوں۔ مگر نکل نہیں پا رہی۔" عزت کے لہجے کی بے چینی اور بے بسی اب اس کے رونیں رونیں میں سرایت کر چکی تھی اور ولید ششدر سا اسے دیکھ رہا تھا۔
"آپ۔۔۔ آپ نہیں جانتے ولید صاحب۔۔۔ محبت کے ہاتھوں کا لمس میرے چہرے کا نقش بن چکا ہے۔ ایک ایسا نقش' جو صرف مجھے نظر آتا ہے اور صرف مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جسے میں دل کی آنکھ سے دیکھتی ہوں تو صرف وہ ہی وہ نظر آتا ہے۔۔۔ اور اس نقش کے سوا اپنے چہرے کا کوئی اور نقش دکھائی بھی نہیں دیتا۔ آپ کو میری بات سن کر یقیناً" معیوب بھی لگے گا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں اس احساس سے دامن نہیں چھڑا پا رہی۔۔۔ اور یہ سچ میں چھپا بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ مجھے چھپانا نہیں آتا۔" عزت حیدر ایک منہ پھٹ اور بولڈ لڑکی تھی۔ وہ کبھی بھی کچھ بھی اپنے دل میں نہیں رکھتی تھی۔ جو بھی بات اس کے دل میں ہوتی تھی' وہ صاف منہ پہ کہہ دیتی تھی۔ جیسے اس وقت کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اپنے جذبات اور احساسات بیان کر ڈالے تھے۔ یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ ولید رحمان کے ساتھ اپنے ہوش و حواس میں یہ اس کی پہلی ملاقات ہے۔ پہلے جو ان کے درمیان ہوا' وہ ملاقات نہیں تھی۔ وہ حادثہ تھا اور حادثوں میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے فائدہ نہیں۔
"ولید صاحب! کیا آپ کو بھی لگتا ہے کہ اس روز ایک حادثہ نہیں۔ بلکہ دو حادثے ہوئے تھے؟" عزت کے لہجے کی بے چینی اور تڑپ پہ ولید گڑبڑا کے ہوش میں آیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ ماتھے پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ وہ اس صورت حال پہ بوکھلا گیا۔
جس احساس کو وہ اتنے دنوں سے اپنے آپ سے بھی چھپاتا پھر رہا تھا۔ وہی احساس عزت حیدر نے کتاب کی طرح کھول کے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرا گیا۔ کیونکہ اس کے سامنے کوئی اور نہیں' تیمور حیدر کی بہن تھی۔ اس کی عزت تھی اور وہ اس کی عزت پہ غلط نگاہ ڈالنے کا تو کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ کبھی بھولے سے بھی نہیں۔
"دیکھیے مس عزت! آپ اس حادثے سے نکل ہی آئیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ اس حادثے میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ پلیز! اب مجھے اجازت دیجیے' خدا حافظ۔" ولید دوٹوک انداز میں کہتے ہوئے ایک دم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ ابھی مجھے میرے سوالوں کا جواب نہیں ملا۔" عزت بھی ایک دم اٹھ کر اس کے سامنے آ گئی۔ اس کے یوں قریب آنے اور راستے میں حائل ہونے پہ ولید کے قدم ٹھٹک گئے۔ اس کے محسوسات میں وہی دلفریب سی خوشبو دوبارہ سے کسی جادو' کسی طلسم کی طرح رچ گئی تھی۔ ولید کو اس کے قرب کی مہک مخمور کر گئی۔ وہ جہاں تھا' وہیں کھڑا رہ گیا۔
"دیکھیے مس عزت! مجھے جانے دیجیے' میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" ولید نے اپنی کنپٹی سہلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ اس کی نظریں عزت کو دیکھنے کی گستاخی نہ کریں۔
"تو پھر مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کریں۔" عزت نے جیسے ضد کی۔
"کیوں؟ دوبارہ کیوں؟" ولید لاتعلق اور انجان نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"تاکہ میں آپ سے اپنے سوالوں کا جواب لے سکوں۔" اس کا انداز ہنوز ضدی سا تھا۔
"مگر میرے خیال میں نہ آپ کے سوال اتنے ضروری ہیں اور نہ میرے جواب اتنے ضروری ہیں کہ جن کی وجہ سے مجھے دوبارہ ملنے کا وعدہ کرنا پڑے۔ پلیز! آپ یہ بات یہیں ختم کریں اور مجھے جانے دیں۔" ولید اس سرپھری لڑکی سے بہت ہی تحمل اور ٹھہراؤ سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"ٹھیک ہے! آپ جائیں' میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ کیونکہ یہ سوال' جواب آپ کے لیے نہ سہی۔ مگر میرے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس لیے میں ہی کوشش کروں گی کہ ان کو حل کر سکوں۔" عزت لاپروائی اور اطمینان سے کہتی ہوئی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ولید جز بز سا ہو کے رہ گیا۔ کیونکہ عزت حیدر سے ملنا اور نہ ملنا' دونوں ہی اسے دشوار لگ رہے تھے۔
"کس سوچ میں پڑ گئے۔۔۔ جائیے! آپ لیٹ ہو رہے ہیں۔" عزت نے اسے قدم آگے بڑھانے پہ اکسایا۔ ولید نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سر جھکا لیا۔
"اوکے۔۔۔ اللہ حافظ!" اور پھر آہستگی سے کہہ کر وہاں سے نکل گیا۔ عزت پیچھے کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تیمور حیدر کا فیصل آباد سے واپس آنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے اور اسے ڈھونڈنے کے لیے ابھی وہیں رکنا چاہتا تھا۔ لیکن آفس میں بھی کام کافی زیادہ تھا۔ اس لیے اسے واپس آنا ہی پڑا۔
یہ بھی سچ تھا کہ وہ تو واپس گیا۔ مگر اس کا دھیان فیصل آباد میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ یہاں آ کر بھی کچھ اور سوچ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں اسی شام کا وہ ہنگامہ خیز منظر ٹھہر گیا تھا اور وہ اس منظر میں قید سا ہو کے رہ گیا تھا۔ اسے اس قید سے رہائی کا کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان ہی سوچوں سے الجھتے ہوئے اس کا پورا دن گزر گیا تھا۔ لیکن یہ الجھن ابھی نہیں سلجھی تھی اور اسے سب نے نوٹ بھی کیا تھا۔ مگر اس کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے کسی نے بھی اس سے استفسار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
اس کی یہ کیفیت پہلے دو روز تک ہی رہی تھی۔ اس کے بعد وہ قدرے نارمل سا ہو گیا۔ آخر وہ کاروباری آدمی تھا۔ کام میں لگ کر دھن مصروف ہوا تو سب کچھ خود بخود معمول پر آ گیا۔ وہ اپنی روز مرہ زندگی میں دوبارہ سے مگن ہو چکا تھا۔ لیکن ولید سے ملاقات پھر سے سب کچھ تازہ کر گئی۔
وہ اپنے آفس کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے نیچے اترا اور اپنا بریف کیس اور موبائل وغیرہ لے کر اندر کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف بڑھ آیا تھا۔
"گڈ مارننگ سر!" سحرش زمان اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔
"گڈ مارننگ! مس سحرش!" تیمور مسکراتے ہوئے کہہ کر دروازہ کھول کے اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ اپنے دھیان میں اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سحرش زمان اسے کچھ بتانا چاہ رہی ہے۔
اندر آکر اس کے پانی کی طرح رواں قدم رک گئے۔ کیونکہ سامنے ہی کرسی پہ ولید رحمان براجمان تھا۔
"السلام علیکم!" ولید اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔
"وعلیکم السلام!" تیمور کے قدموں میں پھر سے روانی آگئی اور وہ اپنی کرسی کی طرف بڑھ آیا۔
"کیسے ہو؟" ولید نے بولنے میں پہل کی تھی۔
"اللہ کا شکر ہے۔ بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے اپنا بریف کیس اور موبائل ٹیبل پہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟" ولید محسوس کر چکا تھا کہ وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔
"میرے آنے سے پہلے بھی غالباً تم بیٹھے ہی ہوئے تھے۔" تیمور نے انتہا درجے کی لاتعلقی کا مظاہرہ کیا۔
"اس وقت تم نہیں تھے۔ لیکن اب تم ہو۔ اس لیے اب تمہاری اجازت ضروری ہے۔" ولید نے "اجازت" پہ زور دیا۔
"میں اب بھی نہیں ہوں ولید رحمان! اس لیے اب بھی میری اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم بیٹھ بھی سکتے ہو اور تم جا بھی سکتے ہو۔ اب یہ تمہاری مرضی پہ ڈپینڈ کرتا ہے کہ تمہیں یہاں بیٹھنا ہے یا پھر یہاں سے جانا ہے۔" تیمور خاصا سخت ہو رہا تھا۔ اس کی یہ سختی اس کی ناراضی کا اظہار تھی اور ولید اس کی اسی ناراضی کو ختم کرنے کے لیے ہی تو یہاں آیا تھا۔ اس لیے یہاں سے جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
"میں یہاں بیٹھنے کے لیے آیا ہوں۔ جانے کے لیے نہیں۔" ولید بھی اتنی جلدی برا ماننے والا نہیں تھا۔
"شیور، بیٹھو میں نے بیٹھنے سے منع تو نہیں کیا۔" تیمور نے کندھے اچکا کر کرسی کی سمت اشارہ کیا۔
"شکریہ! لیکن تم نے بیٹھنے کے لیے کہا بھی تو نہیں ہے۔" ولید شکوہ کناں لہجے میں کہتا دوبارہ بیٹھ گیا۔
"پلیز! میں اس اٹھنے اور بیٹھنے کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کس کام سے آئے ہو؟" تیمور دوٹوک بات کر رہا تھا اور ولید سکون سے اس کے غصے اور ناراضی کی گہرائی بھانپ رہا تھا۔
"میں یہاں یہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں کہ تم نے میری کالز ریسیو کیوں نہیں کیں؟ کیا اتنا برا ہو گیا ہوں میں کہ تم میری کال بھی ریسیو نہیں کر سکتے؟ کیا میری آواز سننا بھی گوارا نہیں رہا تمہیں؟" ولید کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
"میں بزی تھا۔" تیمور کا جواب انتہائی مختصر تھا۔
"وہ تو تم ہمیشہ ہوتے ہو۔" ولید نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
"ٹھیک ہے۔ پھر تم خود ہی سمجھ جاؤ تو بہتر ہے۔" تیمور کا انداز لاپروائی لیے ہوئے تھا۔
"تیمور! پلیز یار۔ مجھے زچ مت کرو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ جاب میں اپنے شوق کے لیے نہیں، بلکہ مجبوری کے لیے کر رہا ہوں۔" ولید نے ذرا سا جھنجلا کے کہا۔
"تو کرو نا! میں تمہیں کب منع کر رہا ہوں کہ نہ کرو۔ تمہاری مجبوری کو تم ہی بہتر سمجھ سکتے ہو میں نہیں۔ کیونکہ میں دوسرا ہوں اور کوئی بھی دوسرا شخص آپ کی مجبوریوں اور پرابلمز کو اتنے اچھے طریقے سے نہیں سمجھ سکتا، جتنے اچھے طریقے سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے تمہیں جو بہتر لگتا ہے، وہی کرو۔ میں کچھ کہنے والا کون ہوتا ہوں۔" تیمور کے لہجے کی تلخی ہنوز تھی۔ ولید چند ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا پھر بولا۔
"لیکن اگر تم کہو تو میں یہ جاب چھوڑ بھی سکتا ہوں۔ کیونکہ یہ جاب تم سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ جہاں پہلے اتنا

عرصہ بے روزگاری میں گزار دیا ہے۔ وہاں کچھ عرصہ اور بے روزگاری کے دھکے کھا لینے میں کیا حرج ہے بھلا۔ بس یار ناراض نہ رہے۔" ولید بڑے سکون اور بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا۔ جس پہ تیمور کو مزید تپ چڑھ گئی۔
"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں بے روزگاری کی حالت میں دھکے کھاتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں؟" اس نے خاصے غصے سے ولید کی سمت دیکھا۔
"بے شک تم مجھے بے روزگاری کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ لیکن آج کل حالات کچھ ایسے ہیں کہ جن میں یہ جاب نہ کرنا، بے روزگاری کو خود اپنے گلے لگانے کے مترادف ہے۔ میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اس جاب کے لیے ہامی بھری ہے۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ گھر کے حالات مزید خراب ہو رہے تھے۔ کہیں کوئی جاب نہیں مل رہی تھی۔ سو مجبوراً مجھے اس فیلڈ میں آنا پڑا۔ لیکن پلیز یار! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ مجھے جیسے ہی کوئی اچھی جاب ملی۔ میں یہ جاب، یہ فیلڈ چھوڑ دوں گا۔" ولید نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اسے یقین دلایا تیمور نے ذرا توقف کے بعد کہا۔
"ولید دیکھو! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ فیلڈ ایک رسک ہے اور میں کبھی کسی بھی قیمت پر یہ نہیں چاہ سکتا کہ تم یہ رسک لو۔ کیونکہ اس فیلڈ میں آنے والوں کے گھر بار، ماں، باپ، بہن، بھائی اور یہاں تک کہ ان کی عزت اور ان کی اپنی زندگی بھی داؤ پہ لگ جاتی ہے۔ ادھر تم کسی کی دم پہ پاؤں رکھو گے، ادھر لوگ تمہیں اپنے غصے اور غصے کے زہر کا نشانہ بنا ڈالیں گے اور تم اس زہر سے نیلو نیل ہو جاؤ گے اور تو اور خود اپنی شکل بھی نہیں پہچان پاؤ گے اس لیے میں اس جاب کے حق میں نہ کل تھا، نہ آج ہوں اور نہ ہی آئندہ ہوں گا۔" تیمور نے اپنے خیالات اور خدشات کا برملا اظہار کیا۔ ولید پر سوچ انداز میں سر ہلا کے رہ گیا۔
"ہوں! جانتا ہوں، یار سب جانتا ہوں۔ لیکن مجبوری انسان کو ہر رسک لینے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ اگر تمہارے پوائنٹ آف ویو سے دیکھا جائے تو کسی حد تک تم بھی ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، اس لیے ان شاء اللہ میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ یہ جاب جلد سے جلد چھوڑ دوں، کیونکہ میں خود بھی اپنی فیملی کے لیے کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔" ولید کافی حد تک تیمور کے نقطہ نظر سے متفق ہو چکا تھا۔
"یہی بات اگر تم پہلے سوچ لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔" تیمور نے ذرا خفگی سے کہا۔
"نہیں سوچ سکتا تھا۔" ولید نے نفی میں گردن ہلائی۔
"کیوں؟ کیوں نہیں سوچ سکتے تھے؟" تیمور کو اس کی بات پہ اچنبھا ہوا۔
"کیونکہ اس وقت عقل پہ حالات کی کالی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ سوائے کام کے کچھ اور نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔" ولید کے جواب پہ تیمور نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔
"ہونہہ۔ یہ کالی پٹی اس وقت بھی تو تمہاری عقل پہ بندھ سکتی تھی۔ جب میں نے تمہیں کام کی آفر دی تھی۔" تیمور نے کافی چبا کر کہا۔
"نہیں! اس وقت نہیں بندھ سکتی۔ بلکہ اس وقت تو یہ پٹی کھل جاتی ہے۔" ولید کے لہجے میں شرارت تھی۔
"انتہائی ذلیل انسان ہو تم۔" تیمور نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"اس اطلاع کے لیے بہت بہت شکریہ، مگر تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خود جانتا ہوں کہ میں ایک انتہائی ذلیل انسان ہوں۔ کیونکہ میں تیمور حیدر کا دوست ہوں۔" ولید نے سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے سامنے سر خم کیا۔
"کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ تم سے سارے تعلق ختم کر لوں اور تمہیں آزاد چھوڑ دوں۔ تم جو جی چاہے کرتے پھرو، مگر۔" تیمور کہتے کہتے چپ ہو گیا ولید اس کی چپ پہ مسکرا دیا۔ کیونکہ وہ اس "مگر" کے آگے کی مجبوری سمجھتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔
"مگر اپنی محبوبہ اور اپنے دوست سے سارے تعلق ختم کرلینا اور انہیں آزاد چھوڑ دینا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا' ہے نا؟" ولید نے الٹا تیمور سے سوال کیا تھا اور تیمور اس کے سوال پہ چونک سا گیا۔
اس کے خیال سے کسی کا سراپا گزرا اور اس کا خیال آباد ہو گیا۔
"محبوبہ؟" اس نے اس لفظ کو زیر لب دہرایا۔
"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟ کوئی یاد آگئی ہے کیا؟" ولید نے اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے تھے۔
"ہاں۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"واٹ؟" ولید ایک دم اوپر اوچھلا۔
"تم نے ابھی ابھی کسی لڑکی کو یاد کیا ہے؟ آئی مین محبوبہ کو؟" ولید نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر پوچھا۔
"آف کورس یار! مجھے تو یاد نہیں تھی۔ مگر تم نے یاد دلا دی۔" تیمور گہری سانس کھینچتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"یا اللہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں آج۔۔۔؟ تیمور حیدر کو آج کوئی یاد آئی ہے۔۔۔" ولید بے یقینی سے کہتا ہوا اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر دوبارہ کرسی پہ بیٹھ گیا۔
"یاد تو میں نے اسے دو' تین روز مسلسل کیا ہے اور اتنا کیا ہے کہ سویا ہی نہیں۔ مگر اتنے رت جگوں کے بعد بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس کی یاد' یاد ہی رہی' ملاقات نہیں بنی۔" تیمور مایوسی سے کہتا کمرے کی دیوار گیر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تھا اور پردے ہٹا دیے۔
"کیوں؟ حاصل کیوں نہیں ہوا؟ کون ہے وہ؟" ولید کو حیرانی کے ساتھ ساتھ بے چینی نے بھی آگھیرا۔
"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ کون ہے وہ؟ اگر پتا ہوتا تو میں اس وقت اسے یاد نہ کر رہا ہوتا۔ بلکہ اس سے بات کر رہا ہوتا۔" تیمور پلٹ کر چلتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ ولید نے اپنی نظریں اس کے چہرے پہ جما دی تھیں۔
"اف۔۔۔ اتنی خوش بخت ہے وہ کہ تیمور حیدر جیسا بندہ اس سے بات کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے اور اسے یاد کر کر کے راتوں کو سو نہیں پا رہا۔ رت جگے منا رہا ہے' آہیں بھر رہا ہے' امیزنگ یار! امیزنگ۔" ولید تو حیرت سے پاگل ہو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ تیمور ایسی باتیں کر رہا ہے۔ جن کا تعلق کسی لڑکی سے تھا۔
"یار۔۔۔ وہ تھی ہی ایسی کہ تیمور حیدر جیسے بندے کو بھی اس سے بات کرنے کا خواب دیکھنا پڑا اور یہ خواہش سجانا پڑی کہ کاش! وہ میرے سامنے بیٹھی ہو اور اس سے بات کر کے دیکھوں کہ وہ کیسی ہے؟ اس کا لہجہ اس کی باتیں اس کا انداز کیسا ہے۔ اس کی آواز کیسی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اگر بولے گی تو میرے دل پہ قیامت کر دے گی۔ کیونکہ میں اس کی خاموشی سے ہی اتنا گھائل ہو چکا ہوں کہ اس کے بولنے کا ستم تو سہ ہی نہیں پاؤں گا۔" تیمور کے دل و دماغ میں وہ پھر سے آن بسی تھی اور ولید تو جیسے دم سادھے' ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔
"کیا بات ہے؟ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" تیمور نے اسے ہاتھ کے اشارے سے متوجہ کیا۔
"دیکھ رہا ہوں کہ ایسی باتیں تیمور حیدر کر رہا ہے؟ خواب' خواہش اور لہجوں کی باتیں۔۔۔ حیرت کا مقام ہے یار۔" ولید حیرت سے مر جانے کو تھا۔
"مجھے پتا تھا تم یہی کہو گے۔" تیمور نے سر جھٹکا۔
"کیونکہ تمہیں یہ بھی پتا تھا کہ تم اپنی گزشتہ زندگی میں ایسی باتوں کے بارے میں کیا' کیا بیان ریکارڈ کروا چکے ہو؟" ولید کے طنزیہ انداز پہ تیمور بے ساختہ ہنس پڑا۔
"ہاں! پتا تھا۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔

"چلو! شکر ہے تم نے اعتراف تو کیا۔ خیر! اب یہ بھی بتا دو کہ یہ سارا معاملہ کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ کچھ پتا تو چلے۔" ولید نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوال کر ڈالے۔ وہ سب کچھ جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔ تیمور ہلکے سے مسکرایا۔
"یار! اب کیا بتاؤں۔ یہ سارا معاملہ محض اک نظر دیکھنے کا معاملہ ہے۔"
"وہ کون ہے؟"
"یہ میں نہیں جانتا۔"
"کہاں ہے؟"
"فیصل آباد میں۔۔۔"
"کیسی ہے؟"
"یہ بھی میرے بیان سے باہر کا سوال ہے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کیسی ہے۔۔۔ اسے دیکھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے کہ وہ کیسی ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو تب ہی سمجھ سکو گے کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ یوں میرے سمجھانے سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔
"ارے یار! وہ لڑکی ہے یا الجبرا؟" ولید نے آنکھیں پھیلائیں۔
"مجھے تو الجبرا سے بھی زیادہ مشکل لگی تھی وہ۔" تیمور اسے سوچ کے رہ گیا۔
"اوہ۔۔۔ یعنی اوکھی جگہ ہاتھ مارا ہے۔ بائی دا وے دیکھی کہاں ہے؟ کسی آفس میں؟ کسی پارٹی میں؟ یا کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں۔" ولید کا ایک اور سوال تیمور کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔
"نہ کسی آفس میں' نہ کسی پارٹی میں اور نہ ہی کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں۔" ولید کو بار بار حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔
"تو پھر کہاں؟" اس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔
"ایک بس میں۔" تیمور نے سکون سے بتایا۔
"کیا؟ بس میں؟" ولید اب کی بار تو حیرت کے جھٹکے سے اچھل بھی نہیں سکا تھا۔
"ہاں! بس میں۔۔۔ فیصل آباد کی ایک لوکل بس میں۔۔۔ میں پچھلے دنوں کام کے سلسلے میں فیصل آباد گیا تھا۔ تمہیں پتا ہو گا شاید۔" تیمور نے اپنی مختصر سی لو اسٹوری کی تمہید باندھی۔
"پھر۔۔۔؟" وہ اسے مزید بولنے پہ اکسا رہا تھا۔
"پھر کیا یار؟ اس روز میری میٹنگ تھی اور میں میٹنگ کی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے رات وہیں فیصل آباد میں ہی اپنی آنٹی کے گھر رکنا پڑ گیا تھا میٹنگ سے فری ہو کر میں اپنی آنٹی کے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں روڈ بلاک ملا جس کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ رش تھا اور اسی رش میں ایک بس ایسی بھی تھی' جو میری گاڑی کے بالکل ساتھ ہی کھڑی تھی۔ بس چند انچ کا فاصلہ تھا۔ اسی فاصلے سے میں نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ یار! میں نے سنا تھا کہ لڑکیاں لڑکوں کی پرسنالٹی پہ فدا ہوتی ہیں' لیکن میرے ساتھ تو سارا معاملہ ہی الٹ ہوا ہے۔ الٹا میں اس لڑکی کی پرسنالٹی پہ فدا ہو گیا ہوں۔ مجھے اس کی صورت سے بھی زیادہ اس کی شخصیت کی تمکنت نے متاثر کیا ہے۔ میں دیکھتا رہ گیا کہ کوئی لڑکی اتنی باوقار بھی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ میں اس سے ملا نہیں۔ اس سے بات نہیں کی' اسے قریب سے دیکھا نہیں۔ لیکن پھر بھی اسے دور سے ہی پرکھ لیا تھا اور اسی دیکھنے اور اسی پرکھنے میں میرے دل کو یقین ہو گیا تھا کہ اس لڑکی میں کچھ خاص ہے۔ کچھ ایسا جو اسے سب سے منفرد بنا رہا ہے اور میرے دل کو اپنی طرف مائل کر رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ میں نے اسے وہیں دیکھا' وہیں پرکھا اور وہیں کھو دیا۔ دوبارہ اس کی جھلک بھی دیکھنے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں ملی۔ حالانکہ میں نے اس بس کو فالو بھی کیا تھا۔" تیمور کے لہجے میں حد درجہ افسوس تھا۔ ولید اس کے جذبات سے بے نیاز ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔

"تم نے۔۔۔ تم نے۔۔۔ ایک لڑکی کو بس میں دیکھا اور۔۔۔ اور اس پہ فدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کا پیچھا کرنے لگے۔ اف! کتنی انٹرسٹنگ نیوز ہے یار! کل کے اخبار میں یہ نیوز فرنٹ پیج پہ ہونی چاہیے۔ حیدر گروپ آف انڈسٹریز کا مالک تیمور حیدر فیصل آباد کی ایک بس میں کسی لڑکی کو دیکھ کر مرمٹا۔" ولید نے اس خبر کی سرخی بھی ترتیب دے ڈالی۔ تیمور نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہارا کوئی اعتبار نہیں ہے میرے دوست! پلیز ایسا کرمت دینا۔"

"اعتبار تو تمہارا بھی نہیں رہا میرے دوست! سڑکوں پہ آتے جاتے لڑکیوں پہ فدا ہونے لگے ہو' نظرباز ہو گئے ہو' کیا بھروسا رہ گیا ہے تمہارا؟ نہ جانے کب تمہیں کوئی اچھی لگ جائے اور تم اس کا پیچھا کرنے کھڑے ہو جاؤ۔" ولید نے اس کا مذاق اڑایا۔

"یار! پہلی بار۔۔۔ زندگی میں پہلی بار مجھے کوئی لڑکی اچھی لگی ہے اور تم میری فیلنگز کا مذاق اڑا رہے ہو؟" تیمور کو افسوس ہوا۔ لیکن ولید کو کوئی پروا نہیں تھی۔ کیونکہ اب اس کا سنجیدہ ہونا ذرا مشکل ہی تھا۔

"ارے واہ۔۔۔ ایسی شان دار سی لو اسٹوری سن کر مذاق نہیں اڑاؤں گا تو اور کیا شاباش دوں گا تمہیں؟ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ لڑکی اگر پانچ منٹ اور وہاں رکتی تو تم یقیناً" اس سے کورٹ میرج کر کے اسے گھر لے آتے۔" ولید نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"آف کورس یار! آف کورس۔ میں یقیناً" لے آتا۔ مگر وہ اتنی آسانی سے آنے والی نہیں تھی۔" تیمور کا جواب بے بس سا تھا۔

"ہائیں! تو تم پانچ منٹ میں اسے اتنا جان گئے تھے کہ تمہیں اس کے مزاج کا بھی پتا چل گیا؟" ولید نے شدید تعجب کا اظہار کیا۔

"کبھی کبھی کسی کو جاننے کے لیے پانچ سیکنڈ بھی بہت ہوتے ہیں میرے دوست۔۔۔ اور یہ بات تم بھی یقیناً" اچھی طرح جانتے ہو گے کہ محبت جب دل پہ حملہ کرتی ہے تو وہ وقت' موسم' مقام اور حلیہ نہیں دیکھتی۔ وہ بس حملہ آور ہوتی ہے اور انسان کی نس نس میں اپنے پنجے گاڑھ دیتی ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور اس اندھی محبت کے شکنجے میں آکر تمہارے اور میرے جیسے بڑی بڑی باتیں اور بڑے بڑے دعوے کرنے والے لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ اتنی سی دیر میں یہ سب بھی ہو گیا۔" تیمور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے اور بے حد گہرائی سے کہا۔

اور نہ جانے کیوں ولید کے من میں چھپے چور نے اسے تیمور کے سامنے نظریں چرانے پہ مجبور کر دیا تھا اسے دل ہی دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ واقعی محبت جب دل پہ حملہ کرتی ہے تو وہ وقت' موسم' مقام اور حلیہ نہیں دیکھتی۔

بالکل ایسے جیسے اس نے ولید کے یا پھر عزت کے دل پہ حملہ کرتے ہوئے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا اور ان کی نس نس میں اپنے پنجے گاڑھ دیے تھے اور وہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

اور اب تیمور حیدر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

ولید ایک ہنگامہ خیز صبح کا شکار ہوا تھا اور تیمور ایک ہنگامہ خیز شام کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

اور اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے ولید نے دوبارہ اس کے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا۔ کیونکہ وہ خود بھی تو کچھ ایسی ہی صورت حال کا اسیر تھا۔ اس کے وجود سے' اس کے حواس سے اور اس کے ملبوس سے تو وہ خوشبو ہی نہیں

جا رہی تھی' جو عزت حیدر اپنی بے ہوشی میں ہی اس کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی خوشبو کے حصار میں مہکا ہوا پھر رہا تھا۔ حالانکہ عزت حیدر کی پیش رفت کو اس نے جھٹلا دیا تھا۔ مگر اپنے اندر کے پاگل پن کو کیسے جھٹلاتا؟

"ولید۔۔۔ کیا ہوا؟ تم کہاں کھو گئے ہو؟" تیمور اس کے خود بخود خاموش ہو جانے پہ حیران ہوا۔

"نن' نہیں۔۔۔ کہیں نہیں۔" اس نے بے ساختہ چونکتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"لگتا ہے' ادھر بھی کوئی حملہ ہوا ہے۔" تیمور نے ولید کے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے نہیں یار! ادھر تو روز کوئی نہ کوئی حملہ ہوتا ہے۔ روز کوئی نہ کوئی چہرہ اچھا لگتا ہے اور روز کسی نہ کسی کا پیچھا کرتا ہوں۔ یہ تو صرف تم ہو جس کے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ ورنہ ہم تو جناب! ازلی لوفر ہیں۔" ولید نے اپنے آپ کو سنبھالنے میں محض چند لمحوں کا وقت لیا تھا اور دوبارہ سے اپنے موڈ پہ آگیا تھا۔

"کچھ کچھ تو اب میں بھی ہو گیا ہوں۔ تمہارے جیسی لوفرانہ حرکتیں مجھ میں بھی آگئی ہیں۔" تیمور اپنے بال سہلاتے ہوئے خجل سے لہجے میں کہتا بے اختیار ہنس پڑا۔ جس پہ ولید کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اب ان دونوں کے ذہن اپنی اپنی سوچوں سے آباد ہو چکے تھے۔ اس لیے شست جلدی برخاست ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی دیر سے ایک ہی حالت میں بیٹھا مسلسل سامنے ٹی وی اسکرین کی سمت دیکھ رہا تھا اور یوں ہی دیکھتے دیکھتے اس کے دل سے نہ جانے کیا خیال گزرا تھا کہ اس کی پیشانی اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود ٹھنڈے پسینے سے شرابور ہو گئی۔

"راجو۔۔۔ راجو۔۔۔" اس نے فوراً" ملازم کو آواز دی۔

"جی صاحب جی۔" اس کے پکارنے پہ راجو جن کی طرح حاضر ہوا تھا۔

"میرے لیے پانی لے کر آؤ۔"

اس کو بڑی شدت سے پانی کی طلب محسوس ہوئی۔ راجو اپنے صاحب کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر بڑی تیزی سے الٹے قدموں کچن کی طرف بھاگا اور اگلے چند لمحوں میں وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس لیے اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ جسے اس نے ایک سانس میں ہی ختم کر دیا اور پھر ایک گہری سانس خارج کی۔

"کیا بات ہے صاحب! کیا ہوا ہے آپ کو؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" راجو کو اسے دیکھ کر تشویش ہوئی۔

"ہوں! ٹھیک ہوں میں۔" اس نے تسلی دی۔

"لیکن پھر بھی صاحب! اچانک ہوا کیا ہے آپ کو؟" راجو کو حیرانی بھی ہو رہی تھی۔

"بس یار! کسی کا خیال دل سے گزرا ہے اور دل ناتواں کا حشر ہو گیا۔" اس نے جیسے آہ بھری۔

"فارو بی بی کا خیال تھا؟" راجو بنا کہے ہی جان گیا۔ آفاق نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

تو گویا اس کے دل سے گزرنے والے خیال اس کے گھر کے ملازموں کو بھی نظر آتے تھے؟ اس کے دل کی حالت کو اور اس کے جذبات کو عام لوگ بھی جانتے تھے؟

تو پھر۔۔۔ تو پھر وہ چھپ کس سے رہا تھا؟ اپنے ماں' باپ سے؟ اپنے آپ سے یا پھر فارہ سے؟

مگر وہ کرتا بھی تو کیا کرتا۔ نہ سب سے چھپ سکتا تھا اور نہ ہی سب پہ ظاہر ہو سکتا تھا۔

اس کی حالت تو بے بسی کی سی حالت تھی اور دیکھنے والے اس سے پوچھتے تھے کہ اسے ہوا کیا ہے۔

"معافی چاہتا ہوں صاحب! میں شاید غلط بول گیا ہوں۔" راجو نے اسے یوں خاموش اور گم صم سا دیکھ کر فوراً"

WWW.PAKSOCIETY.COM

معذرت کی۔ آفاق نے چونک کر متوجہ ہوتے ہوئے نفی میں سرہلایا تھا اور صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اٹس اوکے۔" وہ کہہ کر تیزی سے لاؤنج سے نکل کر باہر لان میں آگیا۔
لان میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ کیونکہ لان سے ذرا فاصلے پہ لیمپ پوسٹ روشن تھے۔ جن کی روشنی لان کے اس حصے تک آتے آتے خاصی مدھم سی ہو رہی تھی۔ وہ اس مدھم روشنی میں ٹہلتا اپنے دل کو اور اپنے اعصاب کو سکون دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنے دل و دماغ میں اک تھکن سی اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اک ایسی تھکن جو اس کی کوشش کے باوجود بھی نہیں اتر رہی تھی اور وہ اس تھکن سے اندر ہی اندر نڈھال سا ہو رہا تھا اسی نڈھال سی کیفیت میں اسے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی کہ اچانک وہ گیٹ کھلنے کی آواز پہ چونک گیا۔ اس نے پلٹ کر گیٹ کی سمت دیکھا۔ جہاں سے اشتیاق یزدانی کی گاڑی سبک رفتاری سے چلتی اندر ڈرائیوے پر آرکی۔
اور اگلے دو منٹ میں اشتیاق یزدانی اور ثمینہ یزدانی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ آفاق لان کے جس حصے میں کھڑا تھا' وہاں قدرے اندھیرا تھا۔ اس لیے وہ مطمئن تھا کہ وہ اسے نہیں دیکھ پائیں گے اور اندر چلے جائیں گے۔ مگر ثمینہ یزدانی اندر کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئیں۔
"آفاق۔۔۔" انہوں نے ملگجے سے اندھیرے میں بھی اس کا ہیولا پہچان لیا تھا۔ ان کی آواز پہ اشتیاق یزدانی کے قدم بھی رک گئے۔ آفاق کو ان کی سمت قدم بڑھانے ہی پڑے۔
"السلام علیکم!" اس نے قریب آکر سلام کیا۔
"وعلیکم السلام! ابھی تک جاگ رہے ہو؟" اشتیاق یزدانی نے اسے سر سے پاؤں تک خاصی گہری اور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔
"ہوں۔۔۔ بس آج کل موسم ہی کچھ ایسا ہے۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ عجیب بے چینی سی ہو رہی ہے۔ اسی لیے ذرا فریش ہونے کے لیے لان میں نکل آیا تھا۔۔۔ خیر۔۔۔ آپ سنائیں' آپ لوگ کہاں گئے ہوئے تھے؟" آفاق نے ذرا نارمل طریقے سے جواب دینے کی کوشش کی۔
"ہم لوگ نیو (ساشا کی امی) کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہیں حیدر بھائی اور رابعہ بھابھی بھی آگئے تھے۔ اس لیے باتوں باتوں میں ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" اشتیاق یزدانی نے اسے تفصیل سے جواب دیا۔
"چلیں۔۔۔ اچھی بات ہے' آپ لوگوں کا ٹائم تو اچھا گزر گیا نا۔" اس نے ہلکے سے سرہلایا۔
"لیکن تمہارا ٹائم کیوں اچھا نہیں گزر رہا؟ نیند کیوں نہیں آرہی تمہیں؟" ثمینہ یزدانی نے سوال کیا۔
"بس۔۔۔ بتایا تو ہے۔ آج کل موسم ہی کچھ ایسا ہے؟" آفاق نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
"چلو۔۔۔ اگر موسم ہی کچھ ایسا ہے تو ہم بھی تھوڑی دیر باہر کے تازہ ماحول میں ذرا فریش ہو لیتے ہیں۔ آؤ بیٹھتے ہیں یہاں۔" اشتیاق یزدانی اندر جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے لان چیئرز کی طرف بڑھ گئے۔ تھے مجبوراً" آفاق کو ان کے پیچھے قدم بڑھانے پڑے۔
"بیٹھو۔" انہوں نے اپنے مقابل والی کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ ان کے اشارے پہ چپ چاپ کرسی پہ بیٹھ گیا۔
"بے وجہ کی مصروفیت انسان کو اسی طرح تھکا دیتی ہے۔ جیسے تم تھک چکے ہو۔" ان کی بات پہ آفاق نے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"میں تھک چکا ہوں؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔
"ہاں! تم تھک چکے ہو' اور اب تم ہمیں تھکا رہے ہو۔۔۔ ستا رہے ہو ہمیں۔" اشتیاق یزدانی کا شکوہ زبان پر آہی

گیا تھا۔
"ایسا مت کہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں کر رہا ہے بس جو کچھ ہو رہا ہے اس پہ میرا کوئی اختیار نہیں۔" آفاق کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔
"تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے تو پھر کس کا اختیار ہے؟" انہوں نے بے ساختہ سوال کیا۔ مگر آفاق جواباً" خاموش ہی رہا۔ کیونکہ اس کے پاس ان کے سوال کا کوئی بھی جواب نہیں تھا۔
"آفاق۔۔۔ میں تم سے مخاطب ہوں۔" انہوں نے تحمل سے کہا۔
"ایم سوری۔۔۔ میرے پاس آپ کے کسی سوال کا کوئی بھی جواب نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو یوں کہنا چاہیے کہ میرے پاس تو اپنے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔" اس نے آہستگی سے نفی میں سرہلایا وہ دونوں میاں' بیوی تڑپ اٹھے۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"
"جی ہاں۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" اس نے ان کی تڑپ کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔
"آفاق۔۔۔ آخر بات کیا ہے؟ تم ہمیں بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" ثمینہ یزدانی کہتے ہوئے روہانسی سی ہو گئیں۔
"میں نے کہا نا' میرے پاس آپ کے کسی سوال کا کوئی بھی جواب نہیں ہے۔" آفاق تو جیسے ہر طرح سے اپنے آپ کو پتھر کیے بیٹھا تھا۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تمہارے پاس نہ ہمارے سوالوں کا جواب ہے۔ نہ فارہ کے سالوں کا۔۔۔ تو پھر۔۔۔ تو پھر کس کے سوالوں کا جواب ہے تمہارے پاس؟" وہ روتے ہوئے بکھر گئیں۔
"میں فارہ کو جواب دے چکا ہوں۔" اس نے بے حد سپاٹ سے انداز میں انکشاف کیا۔
"فارہ کو جواب دے چکے ہو؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیسا جواب؟" اشتیاق یزدانی بری طرح چونکے۔
"میں نے اس سے معذرت کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ کس چیز کی معذرت۔۔۔ تو پھر میں نے اسے جواب دیا کہ تم سے شادی نہ کرنے کی معذرت۔" آفاق نے انہیں ششدر کر ڈالا تھا۔ وہ دم بخود سی اسے دیکھ رہی تھیں اور ایسا ہی کچھ حال اشتیاق یزدانی کا بھی تھا۔
"تم نے فارہ کو جواب دے دیا؟ انکار کر دیا شادی سے؟" وہ بمشکل بول پائی تھیں۔
"جی۔۔۔ میں نے اس سے معذرت کر لی۔" اس نے اعتراف کیا۔
"معذرت؟" یہ لفظ ان کی زبان پہ آکے دم توڑ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا پورا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کی غیر ہوتی حالت پہ وہ دونوں باپ' بیٹا ہی چونک گئے۔ آفاق بے ساختہ ہی انہیں تھامنے کے لیے اپنی کرسی سے اٹھا تھا۔
"خبردار! اسے ہاتھ مت لگانا۔۔۔ ہمیں تمہارے سہارے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اشتیاق یزدانی کا رنگ بدل چکا تھا۔ وہ خود ان کی طرف بڑھے اور آفاق اپنی جگہ پہ جیسے جم سا گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلویٰ علی بیٹ

یادوں کی راکھ

وہ بڑی بے دلی کے ساتھ ' ماتھے پہ پرسوچ شکنوں کا جال اور پسینہ لیے روٹیاں بنا رہی تھی۔ دوپہر میں وہ دو بہنیں ' ماں اور چھوٹا بھائی ہی ہوتے تھے۔ بڑے بھائی اور ابو رات گئے لوٹتے تھے۔ چند روٹیاں پکاتے ہوئے وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کے خوشگوار سے ٹھنڈے میٹھے ایام تھے۔ شاید اس کے اندر کی تپش تھی ' جو پسینے کی صورت بہہ رہی تھی۔

بات کوئی خاص نہیں تھی۔ لیکن اٹھارہ انیس سال کی کم عمر لڑکی کے لیے عام بھی نہیں تھی۔ ہر انسان اس عمر میں شدید جذباتی ہوتا ہے۔ معمولی سی خوشی ہی خواہش اور خواب لگتی ہے۔

"رب سوہنا نصیب کرے۔ بڑی ہی پیاری عیدی آئی ہے سدرہ کی۔" بشیراں نے گھر میں داخل ہوتے ہی با آواز بلند کہا۔

اس کی عادت تھی کہ وہ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بولنا شروع کر دیتی۔ اندر بیٹھی حرا لمحے کے ہزارویں حصے میں چوکنا ہو جاتی۔ وہ رسالہ پڑھ رہی ہو یا بے وقت ٹی وی یا ٹیپ سن رہی ہوتی ' سب چھوڑ چھاڑ ' خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کر لیتی۔ اور کچھ نہیں تو ڈولی میں دھرے برتن ہی سیدھے کرنے شروع کر دیتی یوں رشیداں پہ اس کا اچھا تاثر پڑتا۔ ورنہ وہ ماؤں کی اس نسل میں سے تھی ' جو جوان کنواری بیٹیوں کا دنیاوی خرافات (رسالے ' ٹی وی وغیرہ) میں دلچسپی لینا ' گرہستن عورت کے لیے بدشگونی سمجھتی تھی۔ اس کے تئیں ' ایسی عورت آگے جا کر گھر کیا بسائے گی ' جس کے اپنے شوق ہی ختم نہ ہوتے ہوں۔

"میرے لیے روٹی نہ پکانا۔ میں تو باجی مسرت (جیٹھانی) کی طرف سے پیٹ بھر کر کھا آئی ہوں۔" اس نے برآمدے میں آتے ہی بتا دیا۔

"روٹی پتا کے سدرہ کی عیدی دیکھ آ۔ وہ تیرا بار بار پوچھ رہی تھی۔" بشیراں نے اندر کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔

"شام میں جاؤں گی۔ ابھی سر میں درد ہو رہا ہے۔"

اس نے پہلے سے سوچا ہوا بہانہ گھڑا۔ وہ سر ہلا کر اندر چلی گئی۔ اس کے سر میں کوئی درد نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ دل میں ضرور ہو رہا تھا۔ سدرہ اس کی تایا زاد کزن اور بچپن کی سہیلی تھی۔ جس کی چھوٹی عید کو ہی منگنی ہوئی تھی۔ اور اب ڈیڑھ ماہ بعد اس کے ہونے والی ساس بڑے چاؤ سے اپنی بہو کے لیے عیدی لائی تھی حالانکہ منگنی پہ بھی اس نے کھلا خرچ کیا تھا۔ عیدی نہ بھی آتی تو خیر تھی۔

لیکن حرا کے جلنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کی عیدی کیوں آئی۔ وہ خود سوا سال سے منگنی شدہ تھی۔ پچھلے سال رمضان سے چند دن قبل اس کا منگیتر مسقط گیا تھا۔ منگنی کو تقریباً" دو ماہ ہوئے تھے۔ اس کی پہلی عید تھی اور اس کی ساس عید سے دو روز قبل پانچ سو روپیہ یہ کہہ کر ہاتھ پہ دھر گئی تھی کہ بدر منیر کا ابھی روزوں کی وجہ سے کام نہیں جڑا اور حرا نے بھی بڑی شرافت اور سمجھ داری سے صبر کر لیا تھا۔

پھر گرمیوں میں ساس کی آمد ہوئی۔ تب تک منیر خیر سے کام پہ جڑ گیا تھا اور ساس کا موڈ بھی خوشگوار تھا۔ اپنے پردیسی کماؤ پوت کی اکلوتی منگیتر حرا کے کان میں ڈال گئی کہ اس دفعہ حرا کی عیدی سب سے اچھی اور منفرد لاؤں گی۔ ہر رنگ کا سوٹ ہو گا۔ میری تو پسند ہی بڑی شاندار ہے۔"

یہ سب اس نے اپنے پردیسی بیٹے کی کمائی اور اس کمائی سے گھر میں آنے والی ضروریات زندگی کی تبدیلیاں گنوانے کے بعد یوں ہی لاڈ میں آ کر کہہ دیا

تھا۔

لیکن حرا نے تو سارے محلے اور کزنز میں منادی کروا دی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی سہیلیوں میں واحد بیرون ملک کا رہائشی منگیتر رکھنے والی تھی۔ ہر کسی کو اس کی خوش قسمتی پہ رشک آتا تھا۔ اس نے پہلے عشرے سے اپنی ساس کی آمد کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ وہ روز گھر کو بڑی محنت اور دلچسپی سے رگڑ رگڑ کر چمکاتی۔ تاکہ اچانک ساس کی آمد پہ اس پر حرا کے سلیقے کا اچھا تاثر پڑے۔

خود بھی صاف ستھری رہتی۔ روز نہا کے لان کا جوڑا پہنتی اور روزے بھی اسی لیے سارے ہی رکھتی گئی کہ شاید آج یا کل ساس کی آمد سے خود کو صوم و صلوٰۃ کا پابند ظاہر کرنے کا شاندار موقع ملے۔ دوسرا عشرہ ختم ہو رہا تھا اور اس کی ساس کی سواری تو دور ' پورے رمضان اس نے فون تک نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ پندرہ بیس دن بعد حرا کو فون کر کے خود اچھی خاصی باتیں کرتی تھی۔ اس کے دل میں کھدبد شروع ہو گئی۔ پہلے اس نے سدرہ کے ذریعے ماں سے کہلوایا کہ اس کی ساس کو فون کر کے پوچھا جائے۔ بشیراں تو یہ سنتے ہی بھتے سے اکھڑ گئی اور اس خیال کو واضح طور پر ان دونوں کا چھچھورپن اور بے شرمی قرار دے کر خوب سنائیں۔

جب تیسرا عشرہ بھی آدھا گزر گیا۔ تب بشیراں بھی پریشانی سے بڑبڑانے لگی اور اٹھائیسویں روزے کو تو حرا صبح سے چپ چپ اور دکھی صورت بنائے پھر رہی تھی۔ کیونکہ اس کے محلے میں رواج تھا کہ محلے کی تمام خواتین اور لڑکیاں بالیاں ایک جگہ جمع ہو کر عید کی نماز پڑھتی تھیں اور وہاں محلے کی تمام منگنی شدگان اپنے اپنے سسرالیوں کی طرف سے ملنے والا جوڑا پہن کر ہی آتی تھیں۔ اب عید میں بھی دو دن باقی تھے۔

بشیراں کو بیٹی پر ترس آ ہی گیا۔ اس نے خود بہانے سے ہاجرہ کو فون کر دیا۔ خود تو وہ پہلے عشرے ہی میں بازار جا کر منیر کی عیدی لے آئی تھی۔ حالانکہ وہ یہاں پر موجود بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف بڑی افسوسناک خبر تھی۔ ہاجرہ بیگم کا ٹخنہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تو چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ کجا کہ بہو کے چونچلے پورے کرنے آتی۔

ہاجرہ بی بی کے ٹخنے کی خیر تھی۔ حرا کا تو دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔ بقول اس کے وہ کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ایسے میں سدرہ نے اسے قلبی سہارا دیا اور سمجھایا کہ "وہ بڑی عید پہ تیرا ادھار چکانے ضرور آئے گی۔" حرا نے تھوڑا سا حوصلہ پکڑا لیکن عید کی نماز پڑھنے وہ بشیراں کے سات دفعہ کہنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہ بھی نہ گئی۔ سدرہ کی بات اور تھی۔ وہ تو اس کی بچپن کی پکی سہیلی تھی۔ لیکن محلے کی لڑکیوں کو وہ کیا جواب دیتی۔ ساس خود نہیں آسکتی تھی تو بڑی بیٹی اور داماد ہی کے ہاتھ عیدی بھجوا دیتی۔ اب اس نے بڑی عید پہ آس لگالی۔

اب بڑی عید میں بھی صرف چھ روز باقی تھے اور سدرہ کی ساس آبھی گئی تھی۔

اس نے ٹھنڈی سانس خارج کی اور پانی کا گلاس بھر کے پیا۔ اماں تو سو گئی تھی۔ وہ بھی بغیر کھانا کھائے لیٹنے ہی والی تھی کہ سدرہ آپہنچی۔

"چاچی نے تجھے میرا پیغام نہیں دیا؟" آتے ہی اس نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

"چلے گئے تیرے سسرال والے؟" حرا نے اس کا سوال ٹال دیا۔

پیغام تو اسے مل گیا تھا۔ لیکن وہ ابھی اس کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی۔ وہ اس سے جلتی نہیں تھی۔ بس اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا۔

"چل آ کمرے میں۔ تجھے اپنی عیدی دکھاؤں۔" سدرہ گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر لے گئی۔ ایک بڑا سا شاپر اس نے سنگل بیڈ پہ الٹا تو چیزیں جا بجا بکھر گئیں۔ جس میں ایک ریشمی سوٹ' ایک کاٹن کا شیفون کے دوپٹے والا' ساتھ میں میچنگ جیولری کا سیٹ' گولڈن اور بلیک امتزاج کی نگوں والی خوب صورت سی جوتی' ہینڈ بیگ۔

"بس یہی لائے ہیں؟" حرا کے منہ سے پھسل گیا۔

وہ اتنی بددل ہو رہی تھی کہ اس کا کچھ بھی بولنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ چپ ہی رہتی۔ سدرہ کو اتنا دکھ نہ ہوتا۔ جتنا بچپن کی سہیلی کے اس جملے نے دیا تھا۔

"ہاں! تو اور کیا لاتے۔ ساتھ میں مٹھائی کا ڈبا اور دو سو روپے بھی ہیں۔" اس نے بھینچی ہوئی مٹھی کھول کر دو سو روپے دکھائے۔

"ہوں! یہ سستے سے گہرے رنگوں کے سوٹ اور یہ اولڈ فیشن جیولری اور یہ اتنی اونچی ہیل والی تارے موتیوں سے بھری جوتی اور سب سے بڑا عجوبہ یہ بستہ نما ہینڈ بیگ اور تو یوں خوش ہو رہی ہے۔ جیسے تجھے کسی شاپنگ مال کی چابیاں تھما گئے ہوں۔" حرا نے اسے سختی سے لتاڑا۔

لاشعوری طور پر وہ اپنی ساس کا غصہ اس پہ نکالتی لال پیلی ہو رہی تھی۔

"تیری ساس کو تو جیسے بڑی رنگوں اور فیشن کی پہچان ہے ناں۔" سدرہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے چیزیں جھپٹ جھپٹ کے شاپر میں واپس ڈالنی شروع کر دیں۔

وہ تو اپنی واحد رازدار سہیلی کو بڑے چاؤ سے اپنی پہلی عیدی دکھانے آئی تھی۔ وہ بھی اسی زمانے کی لڑکی تھی۔ اسے تو ان چیزوں میں اتنے عیب نظر نہیں آئے تھے جتنے اس نے گنوا دیے تھے۔

"وہ تو شہر میں رہتی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ ہر رنگ کا سوٹ لاؤں گی۔ دیکھنا! کتنے سوٹ آتے ہیں میرے۔ ایک سے بڑھ کر ایک نفیس رنگ کا۔" حرا نے بے موقع ہی یاد دہانی کروائی۔

اسے سدرہ کے جذبات کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ سدرہ کا پھیکا پڑتا رنگ اس کے جلتے دل پہ ٹھنڈی پھوار ڈال رہا تھا۔

"رنگ تو بارہ ہوتے ہیں تو کیا تیری ساس بارہ سوٹ لائے گی؟" سدرہ بھی بھنویں اچکاتے جرح پر اتر آئی۔ اسے حرا کی باتیں دکھ میں مبتلا کر رہی تھیں۔

"ہاں! شاید لا بھی سکتی ہے۔ آخر میرا منگیتر مسقط میں ہے۔ تمہارے منگیتر کی طرح فیکٹری ورکر تھوڑی ہے۔" حرا نے بنا سوچے ہی دوسرا کاری وار کیا۔ سدرہ بلبلا کے رہ گئی۔

"شاید لا سکتی ہے۔ لیکن لائے گی نہیں۔ اتنا بڑا دل نہیں ہے اس کنجوس مکھی چوس کا۔ اور پچھلے سال تو وہ تمہیں صرف پانچ سو روپے عیدی دے کر گئی تھی۔ پانچ سو میں یہ میری ساس کا لایا ہوا شیفون کے دوپٹے والا' بقول تمہارے گہرے رنگ والا سوٹ بھی نہیں آتا۔" بپھری ہوئی سدرہ بڑی دور کی کوڑی لائی تھی۔

حالانکہ پچھلے سال وہ حرا کو تسلی دلاسے دینے والوں

میں پیش پیش تھی۔ آج اس نے بنا لحاظ رکھے موقع پہ وار کیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں! منیر بھی تو عید سے چند روز قبل ہی باہر گیا تھا۔ اسی لیے اس کا ہاتھ تنگ تھا۔ اس سال دیکھنا۔ وہ منیر کی کمائی سے میرے سارے شکوے دور کر دے گی۔ ایک سے بڑھ کر ایک مہنگا جوڑا۔" حالانکہ کچھ دیر قبل وہ اس کے متعلق سوچ سوچ کر دل برداشتہ ہو رہی تھی۔

"دیکھوں گی میں مسقط کی کمائی کے لائے' تمہاری شہرن ساس کے مہنگے اور نفیس رنگوں کے سوٹ۔" سدرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ واضح طور پر ناراض نظر آ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

عید الاضحیٰ سے دو دن قبل اس کی ساس کا فون آیا کہ وہ کل عیدی لے کر تشریف لائے گی۔

حرا کا دھڑکتا دل بھی کچھ پرسکون ہو گیا۔ جب سے سدرہ ناراض ہو کر گئی تھی۔ اسے عجیب پشیمانی نے گھیر لیا تھا۔ بعد میں فرصت سے اپنی طنزیہ باتوں پہ غور کیا تو خود پر سو بار لعنت بھیجی۔ اس نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے سدرہ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن معافی مانگنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

چاند رات والے دن وہ صبح سے صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ ہاجرہ کی آمد ساڑھے گیارہ کے قریب ہو گئی تھی۔ حرا نے کھانے میں سالن' چاول اور میٹھے میں سویاں تیار کیں۔ اس کے دل میں کھدبد لگی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی ساس ہاتھ میں چھوٹا سا شاپر اور کلو مٹھائی کا ڈبہ لائی تھی۔ شاید وہ نقد چند ہزار دے جائے۔ اس نے دل کو تسلی دی۔ کچھ دیر بعد اس نے دسترخوان پہ برتن چن کے کھانا لگا دیا۔

اس کی ساس' دیور اور نند نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور جب وہ ان کے لیے چائے بنا کر لائی تو ہاجرہ نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا اور تب سے قریب رکھے شاپر کی گرہ کھول کر اسے الٹ دیا۔

کاٹن کا رنگ برنگا' پھول' بوٹوں سے بھرے ہوئے گلے والا سوٹ' ایک میچنگ انگوٹھی' لمبے لمبے ایئر رنگز اور کچپارے والی چوڑیوں کا سیٹ۔

اس چھوٹے سے شاپر میں بس یہی کچھ سما سکتا تھا۔ نہ سدرہ جیسا کوئی نگوں والا جوتا' نہ ہی ریشمی سوٹ۔

حرا کے چہرے کی متغیر ہوتی رنگت بٹھے کی مانند سفید پڑ گئی۔

ہاجرہ پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

"تین کمرے پتھر لگوا کے تیار کروا لیے ہیں۔ اب اگلے سال لاؤنج' کچن اور ڈائننگ روم کی باری ہے۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کی وائرنگ کروا کر گیزر بھی رکھوا لیا ہے۔ اور ابھی۔۔۔"

وہ پھر سے اپنے پردیسی بیٹے کی کمائی اور زیر تعمیر گھر کی کہانی شروع کر چکی تھی۔

حرا کا تو دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک سوٹ پہ مرکوز تھیں۔ جس پہ واقعی بارہ سے بھی زیادہ رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

جیسے کسی مصور نے اپنے برش یا رنگے ہوئے ہاتھ کپڑے سے صاف کیے ہوں۔ ہر طرح کے رنگ اور سوٹ صرف ایک۔

"آپو! یہ سوٹ ہے یا گولا گنڈا؟ میں سدرہ آپو کو بلا کر لاتی ہوں۔" چھوٹی بہن اس کے کان میں پھونگ کر باہر بھاگی۔

اس کے گلے سے اسے روکنے کے لیے آواز بھی نہ نکل پائی۔ وہ خود میں سدرہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتی تھی۔

موسم کی خوشگواریت سیاہ دوڑتے بادلوں میں بدلنے لگی تو ہاجرہ کو گھر جانے کا خیال آ ہی گیا۔ حرا نے اس کے خالی ہاتھوں اور اپنے خالی دل پہ بین کرتے اسے وداع کیا۔

وہ جو ہزار دو ہزار کی موہوم سی امید تھی۔ وہ بھی گل ہوئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ ماں سے سر درد کا کہہ کر' آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹ گئی۔ سدرہ کی آمد کا خیال اسے دہلا رہا تھا۔ اس نے سدرہ سے کیا کچھ نہ کہا تھا۔ اب سدرہ کی مذاق اڑانے کی باری تھی۔

یہی سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ مختلف آوازوں نے اس کے حواس بیدار کردیے۔

"یہ کچے پارے والی چوڑیاں سدرہ آپو! وہ بھی ڈھائی انچ کی یعنی امی کے ناپ کی۔ انہیں ہاتھ میں ڈالتے ہی سارا پارہ ہاتھوں پہ لگ جائے گا اور یہ رنگ برنگا کیک پیسٹری سوٹ' ایسے جیسے کسی روغن کرنے والا کا جھاڑن....."

یہ چھوٹی تھی۔ جو پٹر پٹر کرتی خود ہی بے عزتی کیے چلے جارہی تھی۔ حرا کا دل چاہا' آنکھوں سے بازو ہٹا کے اسے تین' چار کس کے تھپڑ لگائے۔

سدرہ نے بغیر کوئی برا تبصرہ کیے' حرا پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے جان لیا کہ وہ جاگ رہی ہے۔

"چل چھوٹی! دفع ہو جا ادھر سے۔ زیادہ بڑھ بڑھ کے نا بول۔ بس جو اپنی خوشی سے دے گئے ہیں' ٹھیک ہے۔ اب ہم لڑکی والے ہو کے' نقص نکالتے اچھے لگتے ہیں۔ اب کہیں جا کے اس (ہاجرہ) بے چاری نے چار پیسوں کا منہ دیکھا ہے۔ ساتھ ہی بیٹے کی منگنی کردی۔ سال کی کمائی سے اس نے تین کمرے بھی تو ڈالے ہیں۔ اجاڑا تھوڑی ہے۔ رب کا دیا بہت کچھ ہے۔ کل کو حرا نے ہی جا کر سکھ پانا ہے۔ ہر سہولت ہو گی اسے۔" بشیراں نے کھوکھلے سے لہجے میں انہیں سمجھایا۔ اسے بیٹی کے دل کا بھی خیال تھا' جو وہ تین ماہ سے عیدی کی منتظر تھی۔ اس پہ کیا گزری ہوگی۔ اب وہ بھی بات کا بتنگڑ بنا کے' اسے مزید بدظن نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"بات تو واقعی کوئی نہیں چاچی! اور ہے بھی۔ خالہ ہاجرہ کو رب نے اتنا دیا ہے۔ بس بڑا دل نہیں دیا۔ کون سی کمی ہو جاتی' اگر وہ حرا کو حسب وعدہ عیدی دے جاتی؟ اس کا بھی دل خوش ہو جاتا۔ کتنا چاؤ ہوتا ہے ہمیں سیزن کے کپڑے' جیولری' جوتے اور میک اپ لینے کا۔ جس کی عیدی سب سے اچھی ہو' اس کی تو محلے میں ٹور بن جاتی ہے۔ شادی کے بعد تو چاچی ہمارے خوابوں پہ عقل کے پہرے بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عقل ہم لڑکیوں کو پہلا سبق صبر کا ہی پڑھاتی ہے۔ پھر یہ کچے پارے والی چوڑیاں بھی جڑاؤ کنگن سے زیادہ پیاری اور مہنگی لگتی ہیں۔ وقت اور بدلتے حالات خود بخود ہمیں راضی اور خوش رہنے کا گر سکھا جاتے ہیں۔ ہاجرہ خالہ کو دھیان رکھنا چاہیے تھا' ورنہ ساری عمر ہم ماں باپ کے گھر کا پہنتی اوڑھتی ہیں۔" اس نے بڑے مدبرانہ اور کھوئے ہوئے انداز میں ایک رخ دکھایا۔

"خیر! جو بھی ہو گیا۔ ہمیں اپنا ظرف اور حوصلہ بڑا کرنا پڑے گا۔ معمولی سی بات لے کر دل برداشتہ نہیں ہوتے اور خبردار چھوٹی! اگر تو نے حرا کے سامنے کسی بھی چیز میں نقص۔ نکالے۔ خالہ ہاجرہ اپنی عقل کے مطابق جتنا بھی لائی ہے' بہت ہے اور اچھا ہے۔ کیوں چاچی؟"

چھوٹی کے گال پہ چٹکی بھرتے اس نے بشیراں سے بھی تائید چاہی۔ اس نے بھتیجی کے اتنے اچھے دلائل پیش کرنے پہ اسے دل ہی دل میں سراہا۔ اب اسے حرا کو سمجھانے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آنے والی تھی۔ سدرہ کا دل حرا کی طرف سے پل بھر میں صاف ہو گیا تھا۔ حالانکہ آئی تو وہ بھی اس کی چیزوں کا مذاق اڑانے اور مین میخ نکالنے ہی تھی۔ لیکن وہ اتنی تنگ اور چھوٹی ذہنیت کی نہیں تھی۔ اسے دل رکھنا آتا تھا۔ اس نے پوری سچائی سے حرا کو معاف کردیا تھا۔

حرا کسل مندی سے کروٹ بدل گئی۔ سدرہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ بات معمولی تھی بھی اور نہیں بھی۔ اب اتنی سی بات پر اسے اپنا دل برا کر کے چھوٹے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا تھا۔

حرا کی آنکھوں سے دو ننھے قطرے نکل کے تکیے میں جذب ہو گئے۔ وہ سدرہ کی ممنون اور آئندہ منہ بھر کے کسی پر تنقید نہ کرنے اور تیکھیاں نہ بگھارنے کا پکا عہد کر چکی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مصباح علی

ایک رات کا ساتھ

"اوئی..." یک لخت اس کا سارا بدن کانپا۔
"ہائے میرے اللہ۔ آج بچالے۔ کیا کروں اور کتنا تیز بھاگوں۔" وہ تیز تیز چلتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی، مگر سب بے کار رہا تو اس نے باقاعدہ دوڑ لگادی۔

"منحوس میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔" منال کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی رفتار بڑھتے دیکھ کر اس کی بھی رفتار میں تیزی آگئی۔ وہ نہ صرف منال کے پیچھے بھاگ رہا تھا بلکہ آوازیں بھی کسنا شروع کردیں۔ منال پسینے سے شرابور قرآنی آیات کا ورد کرتی۔

پھولی سانسوں کے ساتھ آخر گھر کے قریب پہنچ ہی گئی۔ وہ بھی اسے رُکتا دیکھ کر رک گیا غالباً" اس نے اسے جلدی گھر پہنچانے کی ڈیوٹی ہی انجام دینا تھی۔ وہ اب رخ موڑے بھونکتا ہوا کسی اور حسینہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

پچھلی گلی کا یہ کتا خاصا فرض شناس اور دل پھینک قسم کا تھا۔ جب کسی دوشیزہ کو گزرتے دیکھتا تو فوراً" تھڑے سے چھلانگ لگاتا۔ اس کی چھلانگ کی دھمک سے دل تو تب ہی اچھل کر دوشیزاؤں کے منہ میں آجاتا پھر وہ دوڑ پڑتیں —— دل پھینک اس لیے کہا کہ صرف دوشیزاؤں کے پیچھے بھاگتا تھا (کتے کا بھی اتنا قصور نہیں تھا حسینوں کے لٹکتے پلو اسے دعوت دیتے تھے) فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ متواتر بھاگتا تھا اور اس کے اس طرح بھاگنے سے لڑکی سیدھی اپنے گھر ہی جاتی تھی دوسرے محلے کے کسی لڑکے کی ہمت نہ ہوتی لڑکی کو چھیڑنے کی مبادا کتا اس کے پیچھے لگ جائے۔

آج اس کی اسی فرض شناسی کے باعث منال ہانپتی کانپتی گھر پہنچ گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔

"کیا ہوا... باؤلی ہوئی جارہی ہے... کھول ہی رہی ہوں۔" ناظمہ تلملا کر بولیں۔

"وہ... وہ... وہ کم بخت آج پھر میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔" وہ پھولی سانسوں کو نارمل کرتے ہوئے تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی۔ ساتھ دوپٹے کے پلو سے اپنی گردن اور ماتھے پر آیا پسینہ بھی صاف کررہی تھی۔

"کون... کون کم بخت تھا؟" بیٹی کا دہکتا چہرہ کسی ناگہانی کا مژدہ سنا رہا تھا۔ ناظمہ کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"وہ... وہی منحوس۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ چند گز کی ڈیوڑھی پار کرتی صحن تک پہنچی ہی تھی کہ عذرا کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔

"کس نے ہونا ہے۔ ظاہر ہے جب بیٹی گلے میں پٹا ڈالے اڑی اڑی پھرے گی تو محلے کے آوارہ کتے تو پیچھے لگیں گے۔" (یہاں کتے سے مراد لڑکے تھا)

"کون تھا... کس نے اتنی جرات کی۔" بلال قمیص اتارے پنکھے کے نیچے بیٹھا تھا۔ سنتے ہی پرجوش ہوا اور آن کی آن قمیص چڑھاتا باہر نکل آیا۔

"تو چپ ہی رہ، اندر دفعان ہو۔" عذرا نے بلال کو دو ہتھڑ جڑے۔ "بڑا آیا، مجھے بتا۔" وہ دانت پیس کر بولیں۔

"کرتوت نہیں دیکھے اس کے، جیسی حرکتیں ہیں یہی ہونا تھا۔ جانے کیا گناہ ہوگیا تھا میرے لال سے جو بھائی جان نے آؤ دیکھا نا تاؤ میرے ہیرے کے پلے باندھ دی... ہونہہ۔" عذرا تاسف سے سر ہلاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔

"اماں! کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ عزت ہے میری، کیسے نہ بتائے مجھے۔" وہ ماں کو کہتا ہانپتی کانپتی منال کے مقابل کھڑا ہوگیا۔

"کون کمینہ تھا باہر... بتا مجھے، ٹانگیں نہ توڑ دوں اس کی تو پھر کہنا۔"

"زیادہ جذباتی نہ ہوں۔" منال اس کو ذرا پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

"تو... تو توڑے گا اس کی ٹانگیں؟ وہ چبا جائے گا تیری یہ سوکھی سوٹیاں (چھڑیاں)۔" ناظمہ کو بلال کے جوش پر غصہ آیا تو اس کی پتلی ٹانگوں پر طنز کرتے ہوئے اپنی بیٹی کو لے کر کمرے کی طرف بڑھیں، مگر بلال نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی چوڑیوں بھری کلائی

پکڑلی۔
"بتاؤنا۔۔۔ کون ذلیل تھا۔"
"او۔۔۔ کم بخت' چھوڑ میری بیٹی کا ہاتھ۔۔۔ آوارہ' لفنگا۔" ناظمہ نے اس کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔
"بڑا آیا عزت والا۔" وہ منال کو بازو سے کھینچتی اپنے کمرے میں لے جارہی تھیں۔
"کوئی نہیں تھا' تم خوامخواہ میں پریشان ہورہے ہو۔ پھپھو کا اندازہ درست تھا۔ ملکوں کا کتا پیچھے لگ گیا تھا' منحوس پچھلی گلی سے دوڑاتا لایا ہے۔" وہ گھسٹتے وجود کے ساتھ ساری روداد سنا گئی۔

☆ ☆ ☆

اس گھر میں اپنی ہی دنیا آباد تھی۔ اپنے ہی روز و شب تھے۔ ناظمہ اور عذرا کی معمول کی لڑائیاں تھیں۔ لڑائی شروع تو بے جان چیزوں سے ہوتی' پھر ایک دوسرے کے بچوں کو کوسنیں بعد میں قریب بیٹھے دشمن کے حمایتی اپنے بچے کو دھموکے جڑے جاتے' ایک آدھ چیز ادھر ادھر پٹخیں جس سے وقتی طور پر لڑائی تھم جاتی۔ اگر کسی ایک کی طبیعت خراب ہوجاتی تو شیرو شکر بن جاتیں بعد میں کسی نئے موضوع پر نئی لڑائی۔
قریشی صاحب نے یہ گھر بنانا تو "جنت نگر" چاہا تھا' مگر اس گھر کی خواتین نے اسے "پل صراط" میں بدل رکھا تھا۔ اس پانچ مرلہ گھر میں تین کمرے' ایک ڈرائنگ روم تھا۔ بیچ کے رقبہ میں چند گز کا صحن تھا جو بہ وقت ضرورت کچن' سٹنگ روم اور اکثر و بیشتر پانی پت کا میدان بنا رہتا تھا۔ قریشی صاحب کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ تین بیٹیاں بیاہ چکے تھے۔ بیٹے کی باری آئی تو اپنے کمروں کے اوپر کمرے بنائے اور بہو کو آباد کیا۔ قریشی صاحب کے برابر والے کمرے میں کبھی والدہ رہتی تھیں۔ چھوٹی بہن شادی کے چند ماہ بعد ہی بیوہ ہوگئیں۔ اس کی سسرال میں صرف ایک بوڑھا سسر اور جیٹھ کی فیملی تھی۔ جیٹھ کی فیملی سے عذرا کا نبھا مشکل تھا اس لیے قریشی صاحب نے بہنوئی کی دکان کرائے پر اٹھوائی اور عدت کے بعد عذرا کو ننھے بلال سمیت اپنے گھر لے آئے۔ ناظمہ نے چند ماہ تو خوش دلی سے برداشت کیا۔ پھر یہ خوش دلی ناگواری میں بدلی اور زبان سے برسنے لگی۔ عذرا بھی مزاجاً" خاصی تیز تھیں ترکی بہ ترکی جواب دیتیں اور بھائی کے سامنے شکایتوں کے رجسٹر کھل جاتے۔ رو رو کے بے حال ہوجاتیں۔ ناظمہ کون سا ڈرنے والی تھیں ان کے پاس ہر شکوے کا جواب ہوتا۔
آخر قریشی صاحب ـــــ "خدا کے واسطے چپ کر جاؤ تم دونوں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر چلاتے تو دونوں سر جھٹکتی اپنے اپنے کمروں میں چلی جاتیں۔ قریشی صاحب کی والدہ بہت غیر جانبدار عورت تھیں جہاں بہو کو ڈانٹتیں وہاں بیٹی کو بھی نہ بخشتیں سو باتیں سنا کر دونوں کو کئی دن کی چپ لگا دیتیں۔ قریشی صاحب دبنگ آدمی تھے جو من میں سمائی سو کر ڈالی۔ پل میں اولیاء پل میں بھوت۔
وقت آگے سرکنے لگا بچے بڑے ہوگئے تو گھر کی تنگی پر لڑائی ہونے لگی۔ باتھ روم دوسری منزل پر تھا ہر وقت سیڑھیوں پر تانتا بندھا رہتا۔ ناظمہ نے میاں سے شکوہ کیا گویا تنگی بہن کی وجہ سے ہے قریشی صاحب نے پہلے بیگم کو ڈانٹا پھر ڈیوڑھی کی اوٹ میں ہی انتظام کردیا۔ خواہ باہر سے آنے والے کو کتنی ہی دیر دروازہ پیٹنا پڑے' مگر گھر کی خواتین کے شکوے کچھ کم ہوں۔ بھائی جان نے باپ کی اس معاملہ فہمی کو خوب قوالوں کی طرح سر دھن کر سراہا۔
"واہ ابا واہ۔ اگر کبھی ہمارے گھر چھت سے چور آجائے تو دیواروں سے سر ٹکراتا پھرے گا' غالباً" سیڑھیوں کے سامنے طوطوں کا پنجرہ رکھا ہے پہلے تو وہی شور مچائیں گے اگر وہ سو رہے ہوئے تو ڈیوڑھی کے آگے رکھی پانی کی جستی ٹنکی نے خاصی پھسلن بنا دی وہاں پھسلے گا' سر ٹنکی کے پہلو میں نصب ہری موٹر پر پھٹے گا اور پاؤں میری بائیک میں آئے گا اور اگر خوش نصیبی سے زندہ بچ گیا تو ڈیوڑھی کی اوٹ آپ نے برسوں سے تیار کروا رکھی ہے' وہ تو ہاتھ جوڑ کر کہے

گا۔ "بھائی جان زور سے تالی پیٹتے ہوئے بولے۔
"او بھائی۔ مجھے پولیس اسٹیشن چھوڑ آؤ۔ کم از کم اس گھمن گھیری سے جان چھوٹے۔" بھائی جان کے اس شاندار تبصرے پر ابا صرف ہنسے البتہ ناظمہ نے بیٹے کے کندھے پر زور سے دھموکا جڑا۔
"کم بخت تجھے تو مذاق سوجھے گا۔ اوپر والے باتھ روم پر تو تیری بیوی نے قبضہ کر رکھا ہے۔ آج تجھے نظر آگئی چھسلن اور موٹر۔۔۔ دس سال سے اسی رستے سے گزرا ہے کبھی پھٹا تیرا سر۔" بھائی جان اچانک حملے پر اچھل پڑے۔ ان کا تبصرہ بھی درست تھا۔
انہوں نے پندرہ منٹ دروازہ پیٹتے ہوئے انتظار کیا تھا آخر تنگ آکر ڈرائنگ روم کے رستے اندر آئے اب کچھ بولے تو ماں نے کندھے کا جوڑ ہلا دیا۔ کندھا سہلاتے ہوئے نظر بیوی پر پڑی جو سیڑھی کی گرل پکڑے دانت نکوس رہی تھی۔
"سامنے سے ہٹ نالائق عورت! میاں کے اوپر ہنس رہی ہے نکاح ٹوٹ جائے گا۔" وہ اسے گھورتے دانت پیستے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ غالباً" "نکاح ٹوٹ جائے گا" ان کا تکیہ کلام تھا جب بیوی بات نہ مانتی' اماں ابا سے لڑتی یا بلال منال کی پلیٹ میں سے کچھ اٹھا کر کھالیتا تو وہ فوراً" بول اٹھتے۔
"رخصتی سے پہلے اگر ایک دوسرے کے ساتھ کھاؤ پیو گے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔" جانے کس پیر کے زیر اثر تھے جیب میں مالا سی تسبیح ڈالے اندر ہی اندر دانے گراتے رہتے کچھ پڑھ کر پھونکتے رہتے اور اگر بحث و تکرار ہوجاتی تو "نکاح ٹوٹ جائے گا" کی رٹ لگا دیتے۔
یہ سب تو اس گھر کی معمول کی بحث تھی۔ ایسا بھی فاقہ زدہ خاندان نہیں تھا۔ قریشی صاحب کا پرونق بازار میں خوب چلتا ہوا جنرل اسٹور تھا اور بیٹا دکان کے ساتھ کٹ پیس کا اسٹال لگائے بیٹھا تھا۔ باپ سے زیادہ کمائی بیٹے کی تھی چند ہی سال میں اس نے اپنا پلاٹ خرید لیا' مگر گھر سے نکلے اس لیے نہیں کہ اگر اپنا گھر خود بنالیا تو ابا مکان بیٹیوں کو دے کر فارغ ہوجائیں گے۔ سب کھانا پکاتے الگ الگ تھے' مگر کھاتے قریشی صاحب کے کمرے میں تھے۔ یقیناً" یہ اصول قریشی صاحب کی والدہ نے عذرا' ناظمہ کی لڑائیاں دیکھتے ہوئے بنایا تھا غالباً" کھانے کے بہانے ایک دوسرے سے بات چیت ہوجائے اور رنجشیں نہ بڑھیں۔
یہ اصول آج بھی قائم تھا۔ دکھ سکھ سانجھے تھے۔ خوشی غمی کے مواقع نکلتے رہتے تھے۔ قریشی صاحب گھر کو احسن طریقے سے چلا رہے تھے اپنی حیثیت کے مطابق جہاں بیوی کو کھلا خرچ دیتے وہاں بہن کے اخراجات بھی خوش اسلوبی سے پورے کرتے۔ بہن کو دکان کا کرایہ خرچ کرنے نہیں دیتے تھے۔ تاکہ اپنے بیٹے کے مستقبل کے لیے سنبھال رکھے۔ بھتیجا بھی پوری طرح خیال رکھتا تھا۔
آج دوپہر کو بھائی جان کھانے کے لیے آئے تو ربڑی قلفہ بھی لے آئے۔ وہ صحن میں کھڑے آواز لگا رہے تھے۔
"او مخلوق خدا! اٹوٹ پڑو۔ پھر نہ کہنا اکیلے اکیلے بیوی کو کھلا دیا۔" ان کا منہ ماں کے کمرے کی طرف تھا۔
انہوں نے شاپر پھوپھی کو پکڑایا۔ منال ڈونگا نکال لائی۔ تھوڑی دیر بعد سب کھانے میں مگن تھے۔ کسی نے کرسی کھینچ لی کوئی مونڈھے پر ٹک گیا۔ بھابھی سیڑھی کے اسٹیپ پر بیٹھ گئیں۔
"دیکھ لو جی۔۔۔ وہ کمینہ ابھی تک نہیں اترا۔" بھابھی ربڑی سے بھرے منہ کو گول گول گھماتے ہوئے بولیں۔ ہاتھ میں پکڑے چمچ کا اشارہ چھت کی طرف تھا۔ غالباً" ان کا اکلوتا دس سالہ سپوت چھت پر پتنگ بازی کررہا تھا۔ "او بھائی آجا نیچے۔۔۔ آکر کھالے۔" بھائی جان اپنی پاٹ دار آواز میں چلائے۔ جو پوپی کے کانوں میں صور بن کے پہنچی۔ سیڑھیاں تو شاید وہ بھول ہی گیا۔ ربڑی کھانے کے لیے وہ ایک جست ـــــ میں ہی وہ صحن میں تھا۔ پھر کہاں کا ڈونگہ' کیسی ربڑی' چیخ پکار کا عالم تھا۔۔۔ بھابھی صدمے سے بے حال ہورہی تھیں۔ ناظمہ' عذرا ہاتھ مسل رہی تھیں۔ بھائی جان سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ بلال

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے بھاگ کر بائیک نکالی' منال بے ہوش پوپی کو اٹھا اسپتال پہنچ گئی۔ ناظمہ بہو بیٹے کو دلاسے دے رہی تھیں۔

"اللہ خیر کرے گا' چل ہوش کر اسپتال چلتے ہیں۔" عذرا چھپی جمع پونجی نکال لائی اور بھتیجے کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "یہ رکھ اور چل جلدی مجھے بھی لے چل۔" بھائی جان' بھنوئیں سکیڑے کبھی رقم کو دیکھ رہے تھے کبھی پھوپھی کو۔

"ضرورت ہو گی تو لے لوں گا۔" انہوں نے رقم واپس تھمادی۔

عذرا نے پیسے پرس میں رکھے اور ناظمہ کی غمگساری کرتے ہوئے اسپتال کی طرف دوڑ لگائی۔ قریشی صاحب کو بھی دکان پر خبر ہو گئی۔ وہ دکان نوکروں پر چھوڑے اسپتال پہنچ گئے تھے۔ ناظمہ' عذرا کا وظیفوں پر زور تھا۔ منال بھابھی کو ساتھ لگائے دلاسے دے رہی تھی ۔ بلال بھاگ بھاگ کر دوائیاں لا رہا تھا۔ بھائی جان اور قریشی صاحب سر تھامے بنچ پر بیٹھے تھے۔

"اے اللہ ہمارے اوپر رحم کر' ہمارے گناہ معاف کردے۔" ناظمہ سسکتے ہوئے دعا مانگ رہی تھیں۔

"اللہ تو بڑا کریم ہے' اپنا کرم کردے۔۔۔ میرے باپ کی نسل سلامت رکھ۔" عذرا سوں سوں کر رہی تھیں۔

"تمہارے منہ ٹوٹ جائیں' جواب کسی کے بچے کو کوسیں' تو ہمیں معاف کردے۔" وہ اپنی بدزبانیوں کا اعتراف کھلے دل سے کر رہی تھیں۔

اور اللہ تعالیٰ تو ہے ہی رحیم و کریم' انسان کو اس کی ہمت سے زیادہ آزمائش نہیں دیتا۔ انہیں بھی بلکتا دیکھ کر بڑی آزمائش سے بچالیا۔ پوپی کا بازو فریکچر ہوا تھا' پلاسٹر کے چند گھنٹے خاصے کٹھن گزرے تھے' مگر اب اسے ہوش آرہا تھا۔ سب اس کے گرد جمع اپنی والہانہ محبت کا اظہار کر رہے تھے۔

"تو چھت پر چڑھنے سے باز نہ آنا۔ تڑوا لیا نا بازو۔" عذرا' پوپی کو چمکارتے ہوئے اس کے قریب ہو بیٹھیں۔ ناظمہ نے پیچھے سرک کر نند کے بیٹھنے کے لیے کھلی جگہ بنائی۔ "بھابھی تم بوڑھی ہو گئیں' پھر بھی عقل نہ آئی۔" عذرا نے خوب کھلی جگہ لیتے ہوئے ناظمہ پر حملہ کیا۔ ناظمہ نے ناسمجھی میں بھنوئیں چڑھائیں۔

"بچے کو گڈیاں اڑانے سے کبھی نہیں روکا۔ دیکھ اتنا سا منہ نکل آیا۔" ناظمہ تو سنتے ہی پہلو بدل گئیں۔

"اچھا۔۔۔ پیسے کس نے دیے تھے۔" وہ ہاتھ چمکا کر بولیں۔ "بڑی آئی مجھے عقل سکھانے والی۔ ہونہہ۔۔۔" ناظمہ نے نخوت سے رخ پھیرا۔

"میں نے گڈیاں لانے کو تھوڑی دیے تھے۔ وہ اس کے ٹیسٹ میں نمبر اچھے آئے سو دے دیے۔" عذرا نے پوپی کا بازو سہلایا۔

"ہاں۔۔۔ تو نہ دیتیں۔۔۔ نہ تم دیتیں نہ وہ لاتا' نہ گرتا۔" ناظمہ ترکی بہ ترکی بولیں۔

"تو تم روک لیتیں۔۔۔" عذرا انہی کے لہجے میں بولیں۔

"عذرا میرا منہ نہ کھلوا۔" ناظمہ کچھ بولنے ہی والی تھیں کہ قریشی صاحب دانت پیس کر بولے۔ "یہ اسپتال ہے۔۔۔ خدا کے واسطے چپ کر جاؤ۔" انہوں نے ہاتھ جوڑے۔

اس سے پہلے کہ بات مزید آگے بڑھتی بلال آگے بڑھا۔ انہیں گھر جانے پہ راضی کر ہی لیا۔ بائیک کی تقریباً" ٹنکی تک بلال بیٹھا تھا اور وہ دونوں پیچھے مردانہ انداز میں بیٹھی تھیں۔ پھر گھر پہنچنے تک ان کی یہ بحث ختم نہ ہوئی کہ تمہاری وجہ سے ہی اسپتال سے نکالا گیا۔

☆ ☆ ☆

ان سب کی دعاؤں سے گھر بھر کا لاڈلا پوپی چند دن میں گھر آگیا۔ وہ دونوں اس کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ دونوں نے اسے والہانہ چوما اور دن رات اس پر ممتا نچھاور کی۔ ایک دلیہ بنالاتی تو دوسری ساگودانہ۔ ایک اپنی ہنڈیا سے بہترین بوٹی نکال لاتی

دوسری قیمہ بھون کر کھلاتی۔ آج کل ان کی توجہ کا مرکز پوپی بنا تھا۔ اس لیے ان کی لڑائیاں کچھ کم ہو گئیں۔ قریشی صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا وہ گھر کا سب سے بڑا مسئلہ حل کرنا چاہتے تھے۔

دراصل منال بلال کا نکاح چار سال پہلے بہت ایمرجنسی میں ہوا تھا۔ قریشی صاحب کی والدہ اچانک بیمار ہوئیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی بیوہ بیٹی کی اکلوتی خوشی وہ اپنی آنکھوں دیکھ لیں۔ یقیناً" منال بلال کی ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی بھی ان سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ انہوں نے قریشی صاحب سے ذکر کیا تھا۔ شادی تو اتنی جلدی ممکن نہ تھی سو انہوں نے دونوں کا نکاح پڑھوا دیا۔ دونوں نند بھابھی اس اچانک بنے نئے تعلق پر راضی نہ تھیں۔ یقیناً" اس لیے کہ ان کی اولاد کا اتنا اہم فیصلہ بغیر ان سے مشورہ کے طے پا گیا۔

"اب نکاح تو کروا دیا" بڑی بی" نے مگر رخصتی ہمارے جیتے جی نہیں ہو گی۔"

یہ دونوں کا واحد مشترکہ فیصلہ تھا۔ البتہ منال بلال کے دل محبت کے خوب صورت حصار میں تھے۔ منال جب چھت پر دھلے کپڑے پھیلانے جاتی بلال بھی موقع پاتے اوپر کی راہ لیتا۔ کبھی بلال چھت پر کسی کام سے ہوتا تو دبے پاؤں منال اوپر پہنچ جاتی۔ دونوں کے پہنچتے ہی عذرا' ناظمہ بھی اپنے سوجے گھٹنے لیے اوپر پہنچ جاتیں۔ وہ دونوں ان کی پہرہ داری سے عاجز آکر اپنے منہ سے کہنے لگے تھے۔

"ہم آپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں' ہماری شادی کردیں۔۔۔ کم از کم آپ بیماروں کو چوکیداری سے تو نجات ملے۔"

مگر وہ دونوں ایک دوسرے کے بچے کو کوستی' بے حیائی کے طعنے دیتیں اور اپنے والے کو ڈپٹی نیچے لے آتیں۔

وہ مسلسل چار سال سے اپنے ارادوں پر جمی ہوئی تھیں۔ البتہ آج کل پوپی کی وجہ سے حالات قدرے بہتر تھے۔ وہ دونوں اکثر اس کے پاس بیٹھی رہتیں۔ آج بھی اسے درمیان میں لٹائے اسے ہاتھ سے پنکھا جھلتے ہوئے باتوں میں مصروف تھیں۔ قریشی صاحب دونوں کا خوشگوار موڈ دیکھ کر خود بھی قریب رکھے مونڈھے پر ٹک گئے۔ وہ بھی گاہے بگاہے گفتگو میں شریک ہو رہے تھے۔ یقیناً" ان کے موڈ کو مزید خوشگوار بنا کر گھر کے اہم مسئلے کو حل کرنا چاہتے تھے۔ اور اب تو بلال کو گورنمنٹ اسکول میں سائنس ٹیچر کی جاب بھی مل گئی تھی سو اب وہ اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔

"میں تو سوچ رہا ہوں بیگم اب آخری فرض بھی ادا کردوں۔" وہ فکرمندی سے بولے۔

"میاں کون سا فرض قضا ہوا جا رہا ہے۔ جس کی فکر میں پڑ گئے۔" ناظمہ نے جھلتے پنکھے کا رخ میاں کی جانب کیا۔

"منال' بلال کا' اور کون سا۔" دونوں کے ہاتھوں میں تیز تیز گھومتے پنکھے کرنٹ کھا کر رک گئے۔ "اب تو ماشاء اللہ بلال کی نوکری بھی لگ گئی ہے اور جائیداد میں سے بھی تایا نے حصہ دے دیا۔ خیر سے اپنا گھر بنالے گا۔" ناظمہ کا سارا دھیان میاں کے پہلے جملے پر تھا۔

"میاں تم تو چاہتے ہی نہیں ہم دو گھڑی اکٹھے بیٹھیں۔ جہاں اکٹھے بیٹھے نہیں تم نے رونا رویا نہیں۔" ناظمہ کی خوشگواریت بھاپ بن کر اڑ گئی۔

"تم کس بات کے رونے رو رہی ہو۔" عذرا بھلا کیسے چپ رہتیں بھابھی کو اٹھتے دیکھ کر جتایا۔ "میں تو جیسے تمہاری بیٹی کی رخصتی لے رہی ہوں اپنے گلاب کے لیے۔"

"ہاں۔۔۔ تو دے کون رہا ہے رخصتی' تیرے کالے گلاب کو۔" ناظمہ مضبوطی سے پنکھا تھامے چمک کر بولیں۔

"میں آج کہوں نا اپنے چاند سے تو تمہاری بیٹی کے منہ پر دے مارے کاغذ۔" عذرا' ناظمہ کے بدلے تیور پر بھنا گئیں۔

"پھر کہتی کیوں نہیں' اپنے گرہن شدہ سے۔۔۔ لٹکا رہا ہے۔۔۔ آج ہی دے دے۔" قریشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

صاحب نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"دیتی ہوں میں اپنی شہزادی تجھے۔" ناظمہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"ہاں... ہاں... کیلیں ٹھونک کے بٹھائے رکھ اپنی حور پری کو... میرے لال کو کون سا کمی ہے۔" عذرا دستی پنکھا چارپائی پر ٹھونکتے ہوئے ناظمہ کو طیش دلا رہی تھیں۔ ان کی مسلسل گولہ باری کو روکنے کے لیے قریشی صاحب کی دھاڑ ہی کافی تھی۔

"ناہنجار عورتوں، چپ کر جاؤ۔"

"ہاں میاں اور بھی کچھ کہہ لو... چپ کیوں ہو گئے۔" ناظمہ بھنبھناتی ہوئی اپنے کمرے میں جا رہی تھیں۔ میاں کے القابات سن کر پھر پلٹ آئیں۔ اس وقت بھائی جان سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہے تھے۔ ماں کو باپ کے ساتھ بھڑتے دیکھا تو خاموش کیسے رہتے بھلا۔

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ... اماں آپ خاوند سے لڑ رہی ہیں... کچھ خیال کریں۔ نکاح ٹوٹ جائے گا آپ کا۔" ناظمہ تلملائی تو پہلے ہی کھڑی تھیں۔ اب بیٹے کی بات نے پتنگے بھی لگا دیے۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پنکھا زور سے ان کی کمر پہ مارا۔

"ادھر آ کم بخت... پہلے تو تیرا نکاح توڑوں... جانے کس مولوی سے ہر وقت نکاح کے فتوے لیتا رہتا ہے۔ کس بات کے خطرے ہیں تجھے۔" وہ تیوریاں چڑھائے مسلسل بیٹے کو گھور رہی تھیں۔ بھائی جان شرمندگی سے کمر سہلا رہے تھے کیونکہ پوتی باپ کو پٹتا دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھے ہنس رہا تھا گویا بھائی جان کی اچھی خاصی سبکی ہوئی۔ وہ تو نیچے منال کا پتا کرنے آئے تھے کہ گھر آ گئی یا نہیں۔

منال اپنی سہیلی کی سالگرہ میں گئی تھی۔ اسے چھوڑ تو وہ آئے تھے اور واپسی چھ بجے انہی کے ساتھ ہونا تھی۔ لیکن اب دکان سے خاصے تھکے ہوئے آئے تھے۔ سو انہوں نے بلال کو فارغ دیکھا تو اسے ہی کہہ دیا اور ساتھ سمجھانا ہرگز نہ بھولے "زیادہ دیر مت لگانا... بغیر رخصتی کے منکوحہ کو ادھر ادھر گھمانے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔" بلال ان کی بات ہنس کر ٹال گیا۔ شام کا نکلا ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ نو بجنے والے تھے جب ناظمہ اور عذرا کو پتا چلا کہ منال کو لینے بلال چھ بجے سے گیا ہوا ہے تو جلتی پر تیل کا کام ہو گیا۔

"ہائے... کم بخت اٹھا کر لے گیا میری بچی کو۔"

"ہاں... تمہاری کاکی تو گھٹنوں گھٹنوں چلتی تھی نا جو وہ اٹھا کر لے گیا۔ خود نکل کر بھاگی ہے میرے معصوم کے ساتھ۔" عذرا ابھی بھاگتے ہوئے دہلیز تک گئیں شاید دروازے سے آتا جاتا نظر آ ہی جائے گویا پریشانی انہیں بھی تھی۔

"میاں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ جا کر رپورٹ درج کرواؤ۔" ناظمہ سر تھامے قریشی صاحب کو جھنجھوڑنے لگیں۔

"او... بے وقوف عورت! تھانے جا کر کیا کہوں، میری بیٹی اپنے منکوح کے ساتھ بھاگ گئی ہے؟" وہ غصے سے کھڑے ہوئے اور پشت پر ہاتھ باندھے صحن میں چکر لگانے لگے۔ ناظمہ، بلال کو کوس رہی تھیں اور عذرا، منال کو بے حیائی کے طعنے دے رہی تھیں۔

اسی شور میں بھائی جان کے موبائل کا شور بھی شامل ہو گیا۔ فون منال کا تھا۔ کیوں کہ اسے لینے ابھی تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے بھائی جان لے آئے، مگر پریشانی بلال کی تھی، جو ابھی تک لاپتہ تھا اس کا موبائل آف تھا۔ بھائی جان اور قریشی صاحب سب جگہ پتا کر آئے۔ اس کے تمام دوستوں سے پتا کر لیا، مگر بلال کا کچھ پتا نہ تھا۔

عذرا صدمے سے چکراتی پھر رہی تھیں کہ ان کی زندگی کی واحد اور آخری خوشی، ان کی کل متاع جانے کہاں ہے۔ ناظمہ، عذرا کو سنبھالتیں، پانی پلاتیں تسلیاں دیتیں اور ساتھ ساتھ وظیفے، دعائیں اور اس کی خیریت کے لیے منتیں مان رہی تھیں۔ بھابھی، منال کو اپنے ساتھ لگائے بیٹھی تھیں کیوں کہ وہ مسلسل روتے ہوئے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ بھائی جان کے موبائل کا شور ایک بار پھر سکوت توڑنے لگا۔ لیکن اب کا ٹوٹا سکوت قیامت خیز تھا۔

☆ ☆ ☆

ہنستی بستی زندگی کو کیسے پسٹل کی آگ اگلتی نال لمحے میں جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ انگلی کو جنبش دینے والے کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس کو اور کس جرم میں مار رہا ہے۔ مرنے والے کو یہ پتا نہیں چلتا اس کے خون کا رنگ کس کے ہاتھوں پر چڑھا ہے۔ بس وہ ایک خبر بن کے چند لمحے اسکرین کی روشنی پاتا ہے یا پھر کاغذوں کی سیاہی میں رچ جاتا ہے۔

مگر پیچھے کتنے درد... کتنے عذاب رہ جاتے ہیں؟ نہ یہ مرنے والا اندازہ لگا سکتا نہ مارنے والا۔ یہاں بھی کچھ ایسی کیفیت تھی۔ جب بلال کے دوست کا فون آیا۔ شہر کے حالات خراب ہونے کی بنا پر فکر تو سب کو تھی، مگر اب در و دیوار اذیت ناک شور سے بھر گئے، ساکت سی منال، ماں اور پھوپھی کو تسبیح کے دوران بین کرتے دیکھ رہی تھی۔

"اب کیوں رو رہی ہیں آپ... آپ دونوں کی تو دلی مراد بر آئی ہے... یہ ہی چاہتی تھیں نا آپ کہ میں ساری زندگی اس کی منکوحہ ہی رہوں... زوجہ نہ بنوں... تو دیکھیں اب مجھے، میں بسنے سے پہلے اجڑ گئی ہوں... روئیں مت... دھمال ڈالیں... لڈیاں ڈالیں میری اجڑی خواہشوں پر..." وہ حلق کے بل دھاڑتے ہوئے اپنی چوڑیاں توڑ رہی تھی۔

بلال کو اس کی کلائی میں چوڑیاں بہت پسند تھیں۔ اس لیے وہ چوڑیاں پہنے رکھتی۔ بھابھی اسے سنبھالنے کی کوشش میں تھیں، مگر وہ چلاتے ہوئے بے قابو ہو رہی تھی۔ ناظمہ سجدے میں سر رکھے زور زور سے گڑگڑا رہی تھیں۔ عذرا لرزتے وجود کے ساتھ منال کے قریب گئیں اور اس کی سسکیوں کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

"منال میری بچی ایسے نہ بول... یہ نہ تو... میرا بلال ابھی زندہ ہے، اس کی ٹانگ پر گولی لگی ہے۔ اسے تیرے بین کی نہیں تیری دعاؤں کی ضرورت ہے میری جان!" عذرا کا ضبط سسکیوں میں ڈھلنے لگا۔

غالباً" فائرنگ کا سن کر تمام ٹارگٹ کلنگ کے سانحے آنکھوں کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ اب پھوپھی کے منہ سے بلال کی نوید سن کر وہ گھر میں کیسے ٹکتی پھر تو تمام خواتین اسپتال پہنچ گئیں۔

بلال جب منال کو لینے اس کی سہیلی کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ دو اشخاص موقع پر جاں بحق ہو گئے تھے بلال کی ٹانگ پر گولی لگی تھی۔ گولی آپریشن کے ذریعے نکل چکی تھی، مگر خون کی کمی کے باعث اسے خون لگنا تھا۔ خون ناظمہ اور عذرا نے دیا کیونکہ ان کا بلڈ گروپ اس سے میچ کر گیا تھا۔

کچھ دیر بعد بلال کو روم میں شفٹ کر دیا گیا اور روم میں صرف قریشی صاحب، بلال کا دوست اور بھائی جان جا رہے تھے۔ خواتین کو اس سے ملنے پر پابندی تھی کیوں کہ قریشی صاحب نے کہا تھا۔

"تمہیں شکر کرنا چاہیے اس کی زندگی بچ گئی، اس وقت اسے ہمت دینے کی ضرورت ہے، تم عورتوں کی چخ چخ کی نہیں... کیوں کہ۔" کہتے ہوئے وہ پل بھر کو رکے ان کے انداز سے لگتا تھا یقیناً "کوئی بڑی بات ہے تب ہی وہ آہ بھر کر بولے۔

"کیوں کہ... اس کی ایک ٹانگ... ختم ہو گئی ہے۔"

وہ کہتے ہی اندر کمرے میں چلے گئے، اور وہ سب تو جیسے دکھ کی شدت سے گویائی سکتے میں آ گئے۔ اور پھر ایک ساتھ سب کی نظریں منال کی طرف اٹھیں۔ وہ گم صم تھی۔ عذرا کے سینے سے ٹیس اٹھی۔

"ہائے میری کتنی خوب صورت، جوان بھتیجی جب بیٹا ٹھیک تھا، تو میں بد نصیب نہ مانی اور اب بیٹا اپاہج ہو گیا تو اس سے بیاہ کر اس کی قسمت رذیل دوں۔"

ناظمہ سر پکڑے کبھی بیٹی کے سوگ وجود کو دیکھتیں کبھی نند کی دگرگوں حالت کو۔ "میرے خدایا! میری نند تو پہلے ہی بہت دکھی تھی، اب اکلوتا بیٹا معذور ہو گیا... جب تک بلال ٹھیک تھا تو میں رخصتی دینے کو تیار نہ تھی اب معذور ہو گیا تو کیا معذور کو دے دوں یا اپنی بیٹی کا مستقبل دیکھوں... ہائے میرے اللہ! میں کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کروں۔۔۔ مجھے معاف کردے' میری بدزبانی میرے آگے آگئی۔"

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غرق تھیں کہ قریشی صاحب انہیں بلانے آگئے۔ غالباً" بلال ان سے ملنے کے لیے بضد تھا۔ عذرا اور ناظمہ نے اندر داخل ہوتے ہی اس کا ماتھا چوما اور اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ منال بھی بمشکل خود کو سنبھالتے اندر داخل ہوئی اور دروازہ پیچھے بند کیے وہیں رک گئی۔ شاید بلال کو اس طرح دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

"آگے آجاؤ منال! وہاں کیوں رک گئیں۔" وہ اسے دروازے کے قریب رکتے دیکھ کر بولا۔ تو منال آہستگی سے چلتی اس کے پاس آگئی۔ وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے سپاٹ چہرہ لیے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"منال! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔ منال نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"منال ہماری مائیں یہی چاہتی تھیں نا کہ ہم کبھی نہ ملیں' ان کی دلی خواہش پوری ہوگئی ہے۔"

منال نے پلکیں جھپکیں تو چند تارے ٹوٹ کر گالوں پر پھسل گئے۔

"میں تم سے کل بھی محبت کرتا تھا۔۔۔ آج بھی کرتا ہوں۔۔۔ اور شاید کرتا رہوں۔۔۔ مگر میں اپنی محبت اور خاص کر ضرورت کی خاطر تمہاری خوشیاں تو برباد نہیں کرسکتا۔" منال کا چہرہ یکدم زرد پڑا۔

"ہاں منال۔۔۔" مجھے تمہارا مستقبل بہت عزیز ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میں کسی قیمت پر بھی تمہاری خوشیاں داؤ پر نہیں لگنے دوں گا۔

ایک اپاہج شخص تمہیں دے بھی کیا سکتا ہے' جسے خود بیساکھی کی ضرورت ہو۔"

منال منہ کھولے لمبے سانس لیتی نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میں سب کے سامنے تمہیں آزاد۔"

"چپ ہوجاؤ۔" منال نے ہسٹریائی انداز میں اپنی ہتھیلی سختی سے اس کے منہ پر جمادی۔

"تم سمجھتے کیا ہو میری خوشیوں کو کہ وہ صرف تمہارے قدموں کی محتاج ہیں۔۔۔ اتنی سستی نہیں ہے میری خوشی۔۔۔ میرا مستقبل تم ہو۔۔۔ صرف تم۔۔۔" اس نے سسکی لی۔

"بلال! ہم لڑکیوں کا دل اندھا ہوتا ہے' جو محبت میں صرف ظاہر نہیں دیکھتا۔ وہ تو صرف مرد کا دل اس میں بسا اعتبار' اس کا اعتماد' اس کی سچائی محسوس کرتا ہے۔ ہاں البتہ اپنی ذات پر اس کا ٹوٹا اعتماد برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ بکھر کر کرچی ہوجاتا ہے۔۔۔ میری کرچیاں مت کرو۔" وہ اس کی بازو پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سسکیوں سے اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔

"میرے چاند۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ میں تیرے صدقے جاؤں۔" ناظمہ نے روتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹایا۔

"منال کل بھی تیری تھی' آج بھی تیری ہی ہے۔۔۔ میں تو ویسے ہی بکواس کرتی تھی۔" وہ اسے پچکارنے لگیں۔ عذرا نے پہلے چٹاچٹ منال کو چوما اور پھر بھابھی کے گلے لگ گئیں۔

"بھابھی تمہارا دل بہت بڑا ہے' تم نے میرے معذور بچے کو اپنی ہیرے جیسی بیٹی دے دی' میں تو تمہارے احسانوں تلے دب ہی گئی۔" وہ ایک دوسرے سے لپٹی روتے ہوئے اپنی اپنی بدزبانی کا اعتراف کررہی تھیں۔ گویا آپس کی رنجشیں ان کے کلچر کا حصہ تھیں' دلوں میں نفرت نہیں تھی' آج بھی ایک دوسرے کے جذبات کا احساس زندہ تھا۔

"اماں! اس کا مطلب ہے اب تمہیں بیساکھی شدہ داماد قبول ہے؟" بھائی جان نے دانت نکوسے۔ "پہلے ہی راضی ہوجاتیں کم از کم ان کا نکاح تو خطرے میں نہ پڑتا۔"

"کم بخت تو نکاح پر فتویٰ دینے سے باز نہ آنا۔" ناظمہ نے اپنی جون میں لوٹتے ہوئے بیٹے کو چیت بھی رسید کی۔ سب کے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹ آن رکی تھی۔

قریشی صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور پندرہ دن بعد شادی کی تاریخ طے کردی اور یہ بھی فیصلہ سنادیا کہ اتنے دن بلال اپنے دوست کے گھر میں رہے گا' کیوں کہ ڈاکٹرز اسے فارغ کرچکے تھے اور دوست کا گھر اسپتال سے قریب تھا۔

چند دنوں میں سب نے بھاگم بھاگ شادی کی تیاری کی۔ طے یہ پایا کہ بلال اپنے دوستوں' بھائی جان اور قریشی صاحب کے ہمراہ بارات لائے گا اور استقبال خواتین کریں گی۔۔۔ آخر وہ دن آپہنچا۔

بارات آچکی تھی۔ بچیاں پلیٹوں میں پھولوں کی پتیاں لیے کھڑی تھیں۔ سب سے آگے سفید کلف سے اکڑے سوٹ میں ملبوس قریشی صاحب۔ پینٹ کوٹ میں بھائی جان اور پھر شیروانی میں ملبوس دولہا کی وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ دوست خوش گپیاں کرتے آرہے تھے۔ قریشی صاحب تو پھولے نہ سمارہے تھے۔ بہن اور بیوی کو مبارک سلامت کہتے آگے بڑھے اور اسٹیج پر بیٹھی بیٹی کو چوما۔ عذرا' ناظمہ نے دولہا کی خوب بلائیں لیں اور اس کی وہیل چیئر پکڑ کر اسے اسٹیج تک لے آئیں۔ بلال کے دوست نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "یار تجھے گود میں اٹھا کر ادھر بٹھادیتے ہیں۔۔۔ صرف آج کی خاطر داری ہے۔"

مگر بلال قہقہہ لگاتے خود اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں یار اتنی رومانٹک سچویشن اور پھر پہلے سے میری منتظر دلہن کو لینے میں اپنے قدموں پر چل کر جاؤں گا۔" وہ کہتے ہوئے اسٹیج پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ عذرا اور ناظمہ منہ پھاڑے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ قریشی صاحب حیرت زدہ بیٹی کو پیار کرتے ہوئے بولے۔

"بھئی جب گھی سیدھی انگلی نہ نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑیں۔" عذرا' ناظمہ ابھی بھی کچھ نہ سمجھیں تو قریشی صاحب اسٹیج سے اتر کر دونوں کے قریب آگئے۔

"او نیک بختو! گولی تو اسے لگی تھی' مگر اللہ کا کرم ہوگیا ہڈی بچ گئی تھی اور کوئی بڑا آپریشن بھی نہیں ہوا اسی لیے تو ڈاکٹرز نے جلدی فارغ کیا تھا اور دوست کے گھر بھی اس لیے رکھا کہ تم دونوں کو بھنک نہ پڑجائے اور رہا تم دونوں کا خون۔۔۔ وہ تو اسپتال کے بلڈ بینک میں جمع کروادیا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ تم دونوں کی طاقت کچھ کم ہو اور گھر کی لڑائیوں سے جان چھوٹے اور دوسرے بچے کی زندگی بچنے کی خوشی میں تمہاری طرف سے صدقہ جاریہ ہوجائے' اسے خون تو میرے جوان نے دیا تھا۔" وہ بھائی جان کا کندھا تھپکتے ہوئے بولے۔

"ہائے میاں! تم تو ڈرامے بازی میں عورتوں کو مات دے گئے۔" ناظمہ ہونٹوں پر انگلی جما کر بولیں۔ البتہ عذرا کے چہرے پر خوشی کے رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔

بھائی جان ان کا کندھا سہلاتے ہوئے ماں کے قریب ہوئے۔

"اماں! اگر ڈراما نہ کرتے تو پھر کیا کرتے' اگر آپ کو پتا چل جاتا کہ بلال ٹھیک ہے تو آپ دونوں اپنی ضد پر اڑی رہتیں اور ان کا نکاح باوجوہ تاخیر خواہ مخواہ میں ٹوٹ۔۔۔" وہ زبان دبا کر فوراً" رفوچکر ہوئے کہ کہیں نکاح کے فتویٰ پر اماں جوتا نہ اتار لیں۔ وہ تو مجمع کا خیال بھی نہیں کریں گی۔

بلال حیرت زدہ منال کے پہلو میں بیٹھا مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بہت کمینے ہو تم۔۔۔ تمہیں اندازہ ہے' تمہارے الفاظ سے میرے دل پر کیا گزری تھی۔" وہ پھر سے رو دینے والی ہوگئی۔

"مائی ڈیئر! اندازہ لگانے کے لیے ہی اس دن ڈاکٹرز لگ بولے تھے' آخر حادثے کو اتنی قریب سے دیکھا تھا اور اس لیے بھی کہ اگر مستقبل میں کوئی حادثہ ہوگیا تو میرے ساتھ کیا سلوک کریں گی محترمہ۔۔۔"

وہ مسلسل دانت نکال رہا تھا اور منال حیرت اور خوشی سے گلابی پڑتا چہرہ لیے بلال کو ڈپٹ رہی تھی اور یہ خوب صورت لمحہ دوست نے کیمرے کی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا۔

☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

صائمہ اکرم چوہدری

یہ کارزارِ محبت

سکینہ، جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے، جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کبڑے پن کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگاتار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کمرا دلوا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ، ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی مریضہ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکولوجسٹ ہے اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم، ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن، عائشہ کے کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈیپنڈنٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد رامس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کمپیٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زویا کو ان کا سکینہ پر مہربان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی

تلاوتِ لب

WWW.PAKSOCIETY.COM

وقتاً" فوقتاً" سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔ نعت کمپیٹیشن میں سکینہ کی ملاقات موحد اور عائشہ سے ہوتی ہے۔ عائشہ کی پینٹنگز سے متاثر ہو کر علی اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مگر ماہم کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

ثنائلہ زبیر ایک مشہور مصنفہ ہے۔ وہ اپنے فرضی کردار سکندر شاہ سے محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات ماہم سے ہوتی ہے۔ ثنائلہ اپنی ماں کا واحد سہارا ہے۔ اس کا اکلوتا بھائی دوسرے ملک میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے اور انہیں تقریباً" بھول ہی گیا ہے۔ معمولی ایکسیڈنٹ کے واقعے میں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ سکندر شاہ سے بے حد مماثلت رکھتا ہے۔ ثنائلہ اور موحد کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مارننگ شو کی میزبانی کرنے سے منع کرنے پر ثمن انصر سے خلع کا دعوا دائر کر دیتی ہے۔ ایک اسپتال میں عائشہ علی کو ایک لڑکی کے ساتھ گائنی وارڈ میں دیکھ کر برگشتہ ہو جاتی ہے۔ ماہم، رامس کی ٹانگوں پر برص کے نشان دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اور تقریباً" اس سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔ رامس دلبرداشتہ ہو کر عائشہ سے رابطہ کرتا ہے۔ عائشہ اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ڈاکٹر خاور، زویا سے سکینہ کے معاملے میں خفا ہو جاتے ہیں اور انہیں واپس اپنے ملک جانے کا کہہ دیتے ہیں۔ عائشہ شاپنگ مال میں علی اور ماہم کو اکٹھے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کر مزید ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

اعجاز کی ماں سکینہ سے اس کا رشتہ ختم کر کے اپنی بھانجی سے طے کر دیتی ہے۔ سکینہ خوش ہو جاتی ہے گفتگو کے دوران ثنائلہ کو پتا چلتا ہے کہ موحد، ماہم کو جانتا ہے۔ ثنائلہ کی غیر موجودگی میں اس کے ماموں کو بیٹا اس کے گھر آتا ہے۔ اس کی ملاقات نابیہ سے ہوتی ہے۔ رامس اپنی والدہ کو عائشہ کے گھر لے کر آتا ہے۔ رامس اور موحد کی اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ ماہم دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ انصر بھائی ثمن آپی کو طلاق دیتے ہیں۔ ماہم، علی میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ علی اس کے کلینک پر جاتا ہے تو بہت خوش ہو جاتی ہے۔ محفل موسیقی میں علی کا عائشہ سے سامنا ہوتا ہے مگر دونوں کے درمیان ناراضی ہنوز برقرار رہتی ہے۔ مزید وہ لائبریری میں اس لڑکی کو دیکھ لیتی ہے جسے پہلے بھی عائشہ نے علی کے ساتھ دیکھا ہوتا ہے۔ وہ اپنا حوالہ علی کی بیوی کے نام سے دے رہی ہوتی ہے۔

آٹھویں قسط

جب وہ کتابوں کی دکان سے نکلی تو اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ پورا وجود ہچکولوں کی زد میں تھا۔ آج تو امید اور ناامید کی درمیانی کیفیت بالکل ختم ہو گئی۔ اپنے قدموں کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے وہ پارکنگ کی طرف جا رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد انتی آنسوؤں کی دھند کی وجہ سے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ اچانک اس کو چکر سا آیا اور وہ فٹ پاتھ پر ہی بیٹھ گئی۔

"عائشہ!" کسی نے پیچھے سے آ کر بہت نرمی سے اسے پکارا۔ "آر یو اوکے۔۔۔؟"

رامس کی آواز نے اس کی سماعتوں پر دستک دی، لیکن وہ اس وقت ایسی حالت میں تھی کہ گردن اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنا دنیا کا مشکل ترین کام لگا۔

"عائشہ! کیا ہوا آپ کو؟ طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ بالکل اس کے پاس بیٹھ کر فکر مندی سے بولا۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں۔" عائشہ کے منہ سے بمشکل پھسلا اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ رامس گھبرا گیا۔

"اف مائی گاڈ عائشہ! کیا ہوا ہے؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ "آپ تو بہت بہادر ہیں۔" اس نے تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔ وہ بری طرح رونے لگی۔

"نہیں ہوں میں بہادر، مجھے بہادری کا ٹیگ لگا کر اپنے آپ کو اندر سے ختم نہیں کرنا۔ پلیز مجھے رونے دو، ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔" عائشہ نے روندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ بالکل ایسے بچے کی طرح رو رہی تھی جس کی پسندیدہ چیز اس سے چھن گئی ہو۔

"خیر تو ہے۔ یہ آپ دونوں یہاں کون سی جذباتی فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں؟"

ماہم کی آواز پر رامس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ ان دونوں کے عین سر پر کھڑی انہیں عجیب سی نظروں سے گھور رہی تھی۔ ماہم کو دیکھ کر رامس کا خون کھول اٹھا۔

"مائنڈ یور اون بزنس پلیز۔۔۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"جسٹ شٹ اپ!" آگے سے بھی ماہم تھی۔ رامس کی بات پر اسے جیسے آگ لگ گئی۔

"کیا کہا ہے تم نے اسے؟" ماہم نے شعلہ برساتی آنکھوں سے رامس کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر اجنبیت اور بیگانگی کی ایک گہری تہہ تھی۔

"میں لوگوں کا دل دکھانے والی باتیں نہیں کرتا، یہ شعبہ آپ کا ہے اور آپ ہی کو سوٹ کرتا ہے۔" وہ تڑخ کر بولا۔ ماہم کو ایک لمحے میں ادراک ہوا کہ سامنے کھڑا شخص کسی بھی لمحے تہذیب کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے اسے نظر انداز کر کے بڑے اپنائیت بھرے انداز سے عائشہ کو مخاطب کیا۔

"عائشہ! کیا ہوا میری جان؟" اس کے طرز تخاطب پر رامس نے طنزیہ نگاہوں سے ماہم کی طرف دیکھا، جو عائشہ کا ہاتھ پکڑے بڑی محبت سے پوچھ رہی تھی۔

"ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔۔۔" رامس بلند آواز میں بڑبڑایا۔ ماہم نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے غصے سے دیکھا۔

"رامس! مجھے ایک گلاس پانی چاہیے۔" عائشہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"عائشہ! کیا ہوا ہے مائی ڈیر! کیا اس رامس کے بچے نے کچھ کہا ہے؟" اس کے تھوڑا دور جاتے ہی ماہم بے تابی سے بولی۔

"کم آن ماہم۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ کیوں کچھ کہے گا۔ وہ تو خود ابھی ابھی یہاں پہنچا ہے، جیسے تم آئی ہو۔" ماہم اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے یقین نہ کر رہی ہو۔

"میں شاپ سے باہر نکلی تو مجھے چکر سا آ گیا، ایسا لگا بی پی لو ہو گیا ہے۔" عائشہ نے اس کے بڑھائے ہوئے نشو سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"واقعی چکر آیا تھا یا تم مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہی ہو؟" ماہم کا چہرہ سپاٹ اور لہجہ عجیب سا ہوا۔

"کسی بھی انسان کو چکر دینے کے لیے دماغ میں فالتو بھیجہ ہونا چاہیے، جو اس پر سوچ بچار کر سکے۔ الحمدللہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
زرد موسم	راحت جبیں	750/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
عین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
زخم کو ضد تھی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب اڈاک خرچ -/30 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ -37 اردو بازار کراچی۔
فون نمبر: 32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے دماغ میں ایسی کوئی فالتو چیز نہیں۔۔۔" عائشہ اب مکمل طور پر خود کو سنبھال چکی تھی۔ اسے اب اپنی جذباتیت پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے خفت زدہ انداز سے سامنے سے آتے ہوئے رامس کو دیکھا جس کے ہاتھ میں جوس کا ڈبا تھا۔ وہ اب سوچ رہی تھی کہ اسے ان دونوں سے کیسے جان چھڑا کر گھر پہنچنا ہے۔

☆ ☆ ☆

"یہ تو کوئی ایسی بات نہیں، جس کی وجہ سے غبارے کی طرح منہ پھلا لیا جائے۔" نابیہ نے سارا قصہ سن کر ثنائلہ کی کلاس لی۔ وہ آج کافی دن کے بعد اس کی طرف آئی تھی۔

"یہ چھوٹی بات نہیں ہے نابیہ! وہ اتنی اچھی لڑکی کے خلاف ایسی باتیں کر رہا تھا۔" ثنائلہ روہانسی ہوئی۔

"مسئلہ باتیں کرنے کا نہیں ہے یار، مسئلہ یہ ہے کہ وہ "اسی" کے بارے میں ہی کیوں ایسی باتیں کر رہا تھا؟"

نابیہ کے سوال پر وہ بھونچکا سی گئی۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

"حالانکہ بے وقوف لڑکی! یہی بات تمہیں اس سے سب سے پہلے پوچھنی چاہیے تھی۔"

"بس مجھے دھیان ہی نہیں رہا، اصل میں مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ ماہم منصور کو جانتا ہوگا۔" ثنائلہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"وہ اسے صرف جانتا نہیں، بلکہ بہت اچھی طرح جانتا ہے میڈم۔۔۔" نابیہ اسے طنزیہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا یار۔۔۔" ثنائلہ نے بے بسی سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔

"تم اپنے ننھے منے دماغ پر زور نہ ہی ڈالو تو اچھا ہے۔" نابیہ ہنسی۔

"کیا اسے فون کر کے پوچھوں؟" ثنائلہ کو اچانک خیال آیا۔

"کیا پوچھو گی؟" نابیہ چونکی۔

"یہی کہ وہ ماہم کو کیسے جانتا ہے۔"

"اللہ کے واسطے! یہ بے ہودہ سوال کرنے کے لیے اسے فون نہ کرنا۔" نابیہ نے باقاعدہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔

"تو پھر کیا کروں؟" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"ابھی چپ رہو، جب اس کی کال آئے تو بات کر لینا۔" نابیہ نے اسے سمجھایا۔

"اور اگر اس نے مجھے کال ہی نہ کی تو۔" ثنائلہ کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو کوئی پریشانی ہے کیا؟" جمیلہ مائی نے اس دن ڈاکٹر خاور کو اپنی پیشانی مسلتے دیکھ کر کچھ جھجک کر پوچھا۔

"بس ماں جی! پریشانیاں تو زندگی کا حصہ ہیں۔ ان سے کٹ کر تھوڑی رہا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر خاور بمشکل مسکرائے۔ آج صبح ہی سے ان کے سر میں درد تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے فرائض پوری ذمے داری سے سرانجام دے رہے تھے۔

"پتر! وہ جو سات آسمانوں کے اوپر رہنے والی ذات ہے نا، وہ اپنے بنائے ہوئے ایک پتے سے بھی غافل نہیں، پھر تو نے کیسے سوچ لیا کہ وہ تیری پریشانی کا حل نہیں نکالے گا۔" جمیلہ مائی نے بڑے پرسکون انداز سے ڈاکٹر خاور کو دیکھا۔ جن کی پیشانی پر پڑا بل ایک دم ہی ہلکا ہوا۔

"ماں جی! میں نے کب کہا کہ اللہ تعالیٰ میری طرف سے غافل ہو گیا ہے۔" وہ اب کے کھل کے مسکرائے۔

"اگر ایسی کوئی بات نہیں پتر! فیر پریشان شکل بنا کر پھرنے کا کیا فائدہ۔ جب سوہنے رب نے پریشانی اور غم کے کیڑے (دائرے) میں ڈالا ہے تو وہ نکالے گا بھی۔ بس اللہ پر اعتبار رکھ۔" جمیلہ مائی نے میز پر سے تسبیح اٹھائی۔

"بس ماں جی! میرے لیے دعا کریں۔" ڈاکٹر خاور

بڑے تھکے تھکے سے انداز کے ساتھ وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔

"پتر! تیری اللہ کے ساتھ کوئی لڑائی ہے کیا؟" جمیلہ مائی کے سوال پر وہ ہکا بکا رہ گئے۔ فوراً" ہی نفی میں سر ہلایا۔

"جب اللہ سوہنے سے کوئی لڑائی نہیں تو پھر سچے دل سے خود اپنے لیے دعا کر، پتر! جو دکھ اور پریشانی تیرے حصے میں آئی ہے۔ اسے تو جانتا ہے یا تیرا رب۔ بھلا کوئی اور اتنے سچے دل سے تیرے لیے دعا کر سکتا ہے؟" جمیلہ مائی نے ڈاکٹر خاور کو لاجواب کیا۔

"لیکن ماں جی! ایک مسلمان کی دعا دوسرے مسلمان کے حق میں قبول ہوتی ہے۔" انہوں نے یاد دلایا۔

"میں نے کب انکار کیا؟" جمیلہ مائی نے سادگی سے کہا۔ "لیکن جب انسان کو کوئی چوٹ لگتی ہے یا اس کے جسم کا کوئی حصہ ہلکا سا چل جاتا ہے تو اگلا بندہ اس کی تکلیف کا اندازہ تو کر سکتا ہے، لیکن ویسا محسوس تو نہیں کر سکتا نا۔" جمیلہ مائی کے زندگی کو برتنے کے اپنے اصول تھے۔

"کہا تو آپ نے ٹھیک ہے، لیکن پھر بھی اللہ کے مقبول بندے ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر خاور بڑی دقت سے مسکرائے تو جمیلہ مائی نے بھی بات بدلنے کی غرض سے پوچھا۔

"پتر! بیہ سکینہ کا آپریشن کب ہوگا؟" جمیلہ مائی نے نسبتاً" ہلکے لہجے میں پوچھا۔ اس وقت سکینہ ادویات کی وجہ سے غنودگی میں تھی۔

"ان شاء اللہ بہت جلد۔ آپ بس دعا کریں۔" ڈاکٹر خاور نے سکینہ کی فائل دوبارہ اٹھالی۔ "آپ اپنی بیٹی کے لیے تو دعا کرتی ہیں نا۔" انہیں اچانک یاد آیا۔

"ماں۔۔۔ باپ کو تو دعا کے لیے کہنے کی لوڑ ہی نہیں ہوتی۔ ان کے دل سے دعا تو خود بخود نکلتی ہے۔" جمیلہ مائی نے سادگی سے کہا تو ڈاکٹر خاور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پتر کوئی خطرے والی بات تو نہیں نا۔" جمیلہ مائی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"خطرے والی بات تو ہے ماں جی! بس اللہ سے اچھی امید رکھیں۔" ڈاکٹر خاور نے صاف گوئی سے کہا تو جمیلہ مائی کے چہرے پر فکرمندی کی ایک لہر بڑی سرعت سے پھیلی مگر اگلے ہی لمحے غائب ہو گئی۔

"پتر! دعا تو کرتی ہوں۔ آگے سوہنے رب کی مرضی۔ وہ جو بہتر سمجھے۔" جمیلہ مائی کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح عاجزی کا ایک جہاں آباد تھا۔

"اگر خدانخواستہ، ویسا نہ ہوا، جیسا ہم سب سوچ رہے ہیں پھر۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے کسی ممکنہ اندیشے کے تحت پوچھا تو جمیلہ مائی کا چہرہ ایک لمحے کو تاریک ہوا۔

"جو اللہ کی رضا، میں اسی میں راضی۔۔۔" جمیلہ مائی کے مختصراً" جواب نے ڈاکٹر خاور کو بالکل ہی لاجواب کر دیا۔ وہ تعجب سے اپنے سامنے بیٹھی عام سی خاتون کو دیکھنے لگے۔ سانولا چہرہ، آنکھوں کے نیچے حلقے، بالوں میں ہلکی ہلکی جھلکنے والی سفیدی، عام سی کاٹن کا سفید سوٹ پہنے اس خاتون میں کوئی ایسی بات تھی جو اسے خاص بناتی تھی اور وہ اس کے دل کا سکون اور قناعت کی دولت تھی۔ جس سے اللہ نے اسے مالا مال کر رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے اس بات کا ساری زندگی افسوس رہے گا کہ تم نے مجھ سے اپنی باتیں چھپانا شروع کر دی ہیں۔" اس دن ماہم اچانک ہی عائشہ کے گھر آگئی لیکن اس نے آنے سے پہلے معلوم کر لیا تھا کہ موحد گھر پہ نہیں ہے۔

"اور تم خود کیا کرتی پھر رہی ہو۔" اپنی پینٹنگ پر کام کرتے ہوئے عائشہ کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

"کیوں، میں نے کیا، کیا ہے؟" وہ سامنے رکھے کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے صاف مکر گئی۔ عائشہ نے مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"اچھا! واقعی تمہیں نہیں پتا، تم نے کیا، کیا ہے؟" عائشہ کے لہجے میں چھپا یقین اس دفعہ ماہم کو بوکھلا سا گیا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو عائشہ!"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ بھی کچھ دن پہلے تم شاپنگ مال میں علی کے ساتھ کیا کر رہی تھیں۔" عائشہ کی بات پر وہ بری طرح چونکی۔

"وہ تو اس دن مجھے اتفاقاً" وہاں مل گیا تھا۔ تم کہاں تھیں اس وقت۔" ماہم نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"میں اس وقت اگر بالکل تمہارے سامنے بھی ہوتی تو شاید تمہیں نظر نہ آتی۔" عائشہ نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ کر گئی۔

"تم مجھے ایسا سمجھتی ہو عائشہ!" ماہم نے رنجیدگی سے کہا۔ "جبکہ میں تم دونوں کی صلح کروانے کے چکروں میں اپنی پوزیشن خراب کیے جا رہی ہوں۔"

"تم سے کس نے کہا کہ ہماری صلح کرواؤ۔" عائشہ نے فوراً" بات کاٹی۔

"مجھے کہنے کی ضرورت ہے کیا؟" ماہم کا لہجہ افسردگی میں ڈوبا۔ "میں تمہاری دوست ہوں عائشہ!" ماہم نے اسے یاد دلایا تو عائشہ ہلکا سا شرمندہ ہوئی۔

"جبکہ مجھ سے تمہاری پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔" ماہم نے سنجیدگی سے کہا تو عائشہ کی بدگمانی ایک لمحے میں ختم ہوئی۔

"میں اس کی وجہ سے پریشانی نہیں ہوں ماہم!" عائشہ نے اسے یقین دلانے کی ناکام کوشش کی۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو عائشہ!" ماہم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"وہ ایسا قابل اعتبار بندہ نہیں جس کے پیچھے انسان اپنی زندگی خراب کرتا پھرے۔" عائشہ نے نظریں چرا کر اپنی پینٹنگ کی طرف دیکھا۔ جس پر ایک گہری اداسی کا تاثر نمایاں تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ وہ ایک نمبر کا دھوکے باز انسان ہے۔" ماہم کی بات پر عائشہ کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماہم کو دیکھا۔

"تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے میں نے۔" ماہم کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ نے بسیرا کیا۔ "روز بھانت بھانت کے لوگ میرے کلینک پر آتے ہیں۔ نت نئے تماشے دیکھتی ہوں میں۔"

"مجھے تو ویسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔" عائشہ نے صاف گوئی سے کہا۔ "مجھے تو ہمیشہ ہی اچھے لوگ ملے ہیں۔"

"تمہیں اچھے لوگ اس لیے ملے کیونکہ تم خود اچھی ہو۔ تمہیں اپنی سادگی میں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ ایک چہرے کے پیچھے اور کتنے چہرے چھپے ہیں۔" ماہم نے سنجیدگی سے اسے جتایا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

"شاید ایسا ہی ہو، لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ ایک دھوکے باز بندہ ہے۔"

"مجھے۔۔۔" ماہم طنزاً" ہنسی۔ "کم آن عائشہ! میں ایک سائیکولوجسٹ بھی تو ہوں۔ ایک لمحے میں لوگوں کو جج کر لیتی ہوں۔" ماہم نے چٹکی بجا کر بڑے فخریہ انداز سے کہا۔

"پھر بھی۔۔۔" عائشہ نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"میں نے اگر تمہیں بتا دیا تو تم ہرٹ ہو گی۔"

"تم مجھے بتاؤ، میں اب اس سے زیادہ تو ہرٹ نہیں ہو سکتی، جتنا ہو چکی ہوں۔" عائشہ کے لہجے میں گہرا رنج تھا۔

"دفع کرو تم اسے، زندگی ایک شخص پر تو ختم نہیں ہوتی نا۔" ماہم نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں جاننا چاہتی ہوں ماہم؟" عائشہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"پلیز عائشہ! ختم کرو اس قصے کو۔" ماہم ہلکا سا جھنجھلائی۔ جبکہ اس کے طرح ٹالنے پر عائشہ کا دل بے ربط انداز میں دھڑکنے لگا۔

"آخر ایسی کیا بات ہے جو تم بتانا نہیں چاہتیں؟" اس نے سخت لہجہ میں کہا۔

"عائشہ۔۔۔" ماہم عجیب سے مخمصے کا شکار ہوئی۔ جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بتائے یا نہ بتائے۔

"ایکچوئلی یار۔۔۔" وہ بولتے ہوئے رکی۔

"وہ مجھے پرپوز کرنے کے چکروں میں ہے۔" ماہم

نے کہا تو عائشہ نے بے یقینی سے ماہم کا مطمئن چہرہ دیکھا۔ اسے واقعی یہ خبر سن کر دھچکا پہنچا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ ڈرامے باز کیا کرنے آئی تھی آج۔" موحد جو ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا۔ ماہم کو دیکھ کر غصے میں آ گیا۔ یہ تو شکر تھا کہ وہ اس وقت گھر سے نکل رہی تھی۔ کچن سے نکلتی ہوئی ماما نے تاسف بھری نگاہوں سے موحد کو دیکھا۔

"بہت بری بات ہے موحد! اتنے دنوں کے بعد تو وہ آئی تھی۔" ماما نے باہر نکلتے ہی موحد سے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اپنی وہیل چیئر آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے میز کے پاس پہنچ کر ریموٹ کنٹرول اٹھاتے ہوئے بولا۔

"وہ کون سا کوئی خیر کی خبر کے ساتھ آئی ہو گی۔ دیکھ لیجیے گا عائشہ کے چہرے پر مزید بارہ بج گئے ہوں گے۔" موحد کے طنزیہ لہجے پر وہ چونکیں۔

"مجھے تو سخت پریشان کر رکھا ہے اس لڑکی نے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح رونے لگتی ہے۔" ماما نے فکرمندی سے کہا۔

"تو آپ پتا کریں نا کہ وہ کیوں ٹینس ہے۔ بیٹیاں تو ویسے بھی ماؤں کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔" موحد نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ٹی وی آن کیا۔

"میرے تو کوئی بھی قریب نہیں، کبھی اس کا مزاج برہم ہے تو کبھی تمہارا، اللہ جانے مجھے کس بات کی سزا دیتے ہو۔" ماما کو ایک دم ہی غصہ آیا۔

"لو میں نے کیا، کیا ہے۔" موحد نے حیرانی سے پوچھا۔

"پچھلے ایک ہفتے سے تم بھی منہ سجائے پھر رہے ہو اور عائشہ کا تو کافی عرصے سے یہی حال ہے۔" ماما دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"آپ بس عائشہ کی شادی کا سیریسلی کچھ سوچیں۔" موحد نے انہیں ایک نئی راہ سجھائی۔

"یہ اچھی بات کہی تم نے۔ ایسے کیسے سوچ لوں میں کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی تو ہو۔" ماما چڑ کر بولیں۔

"وہ جو اس دن رامس کی والدہ آئی تھیں، وہ کیا کہہ رہی تھیں۔" موحد کو اچانک ہی یاد آیا۔

"وہ تو اچھی خاصی بھلی مانس خاتون تھیں اور عائشہ میں خاصی دلچسپی بھی دکھا رہی تھیں۔ لیکن۔۔۔" ماما بات کرتے کرتے رکیں۔

"لیکن کیا؟" موحد نے حیرت سے ان کا بے زار چہرہ دیکھا۔

"لیکن یہ کہ عائشہ نے مجھے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ رامس کے ساتھ بس اس کی اچھی دوستی ہے اور کچھ نہیں۔" ماما کی بات پر موحد کے چہرے پر کسی سوچ کا تاثر واضح ہوا۔ اس نے یوں ہی اثبات میں اپنا سر ہلا کر سنجیدگی سے کہا۔

"پتا نہیں کیوں ماما! مجھے لگتا ہے عائشہ کسی کو پسند کرتی ہے۔" موحد کے منہ سے پھسلا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" ماما کو جھٹکا لگا۔ "کون ہے وہ؟"

"کمال کرتی ہیں ماما! میں نے آپ سے کہا ہے کہ میرا اندازہ ہے یہ۔ ضروری نہیں کہ درست بھی ہو۔" موحد نے منہ بنا کر وضاحت کی۔

"پھر بھی کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو گا نا تمہیں۔ تمہارے ساتھ اتنی دوستی بھی تو ہے اس کی۔" ماما نے یاد دلایا۔

"ماما! دوستی جتنی بھی ہو۔ لیکن ایسے معاملات میں بھائی تو بہنوں سے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ لیکن لڑکیاں جھجک کا شکار ہو جاتی ہیں۔" موحد نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ٹی وی کی طرف نظر دوڑائی، جہاں پاکستان میں تیز بارشوں کے بعد ہونے والی تباہی کی رپورٹس چل رہی تھیں۔

"لیکن موحد! تم کچھ تو اگلوانے کی کوشش کرو، آخر وہ کب تک اس طرح کڑھ کڑھ کر اپنی حالت خراب کرتی رہے گی۔" ماما کا فکر سے برا حال تھا۔

"میں کوشش کروں گا ماما!" موحد نے انہیں تسلی دی۔

"اور تم خود بھی اپنے بارے میں سیریس ہو کر سوچو"

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی اتا پتا بتاؤ اس لڑکی کا" میں عائشہ کے ساتھ جا کر چکر لگا کر آتی ہوں۔" ماما نے نئی بات چھیڑ دی۔

"کس لڑکی کا؟" موحد نے معصومیت سے کہا تو انہوں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب یہ بھی میں بتاؤں کہ کون سی لڑکی کا؟" انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ مضطرب سا نظر آرہا تھا۔

"ماما! کچھ نہیں ایسا۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"کون ہوش مند لڑکی میرے جیسے معذور انسان کے ساتھ زندگی گزارنے پر راضی ہوگی۔" موحد کی بات پر ماما کے دل پر گھونسا سا پڑا۔

"موحد۔۔۔" انہوں نے سخت صدمے سے اپنے اونچے لمبے جوان بیٹے کو دیکھا۔ جس کے پیروں کے نیچے سے قسمت نے زمین کھینچ لی تھی۔

"لیکن مجھے تو عائشہ نے بتایا تھا کہ تم کسی لڑکی میں انٹرسٹڈ ہو۔" وہ بوکھلائیں۔

"میرے انٹرسٹڈ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔" اس نے استہزائیہ انداز سے اپنا مذاق اڑایا۔ ماما کے دل کو کچھ ہوا۔

"پھر بھی بیٹا!" ماما کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

"ایک بات بتائیں ماما! اگر میرے ساتھ یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو کیا آپ کسی معذور لڑکی کو اپنی بہو بناتیں؟" اس نے بے رحمی سے ان کا زرد ہوتا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ بول نہ سکیں۔

"نہیں نا۔۔۔" وہ طنزاً ہنسا۔ "پھر کوئی اپنی بالکل ٹھیک، نارمل بیٹی کے لیے کسی معذور شخص کو کیوں ترجیح دے گا۔" موحد نے انہیں ایک دم ہی تلخ سوچوں کے سمندر میں گویا دھکا دے دیا تھا۔ ان کا دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا ہی چلا گیا۔ اس تلخ حقیقت سے تو انہوں نے بارہا نظر چرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اچھے شریف انسان ہیں آپ۔ اس دن مجھے لارا لگا کر واپس ہی نہیں آئے۔ ثنائلہ نے میری ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔" نابیہ کو اس دن وہ اچانک ہی رالی سینٹر کی پارکنگ میں نظر آگیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً" شاپ سے نکل کر اس کی گاڑی کے پاس پہنچی۔

"اوہ آئی ایم سوری! میری والدہ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔" وہ اس اچانک حملے پر بوکھلا سا گیا۔ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خفت زدہ لہجے میں اس نے وضاحت دی۔

"بندہ کم از کم ایک کال کر کے بتا تو دیتا ہے۔" نابیہ کا چہرہ سرخ ہوا۔ "آپ کی وجہ سے مجھے آپ کی کزن صاحبہ نے اتنی باتیں سنائیں اور ابھی تک سنا رہی ہیں۔" نابیہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔

"آئی ایم رئیلی سوری! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا آپ اپنا نمبر مجھے دے سکتی ہیں۔" وہ حقیقتاً" شرمندہ ہوا۔

"اور اگر آپ نمبر لے کر ایک دفعہ پھر غائب ہوگئے تو۔۔۔" نابیہ کی صاف گوئی پر اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"پھر ایسا کریں کہ آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔" اس نے فوراً" اپنے والٹ سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر نابیہ کی طرف بڑھایا۔ جو اس نے فوراً" ہی پکڑ لیا۔

"ویسے آپ تو اچھی خاصی غصے والی خاتون ہیں۔" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

"ہر وہ بندہ جو صاف گو ہو اور لگی لپٹی کے بغیر بات کرنے کا عادی ہو، وہ دوسروں کو منہ پھٹ اور سڑیل ہی لگتا ہے۔" نابیہ نے شان بے نیازی سے کہا۔

"لیکن میں نے آپ کو سڑیل یا منہ پھٹ تو نہیں کہا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"مطلب تو یہی تھا نا۔" نابیہ کی صاف گوئی پر اس نے قدرے دلچسپی سے اپنے سامنے کھڑی دراز قد اور اچھی شکل و صورت کی حامل لڑکی کو غور سے دیکھا۔

"اندازے تو بہت زبردست لگاتی ہیں آپ۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"بات اندازوں کی نہیں، مشاہدے اور تجربے کی

ہے۔" نابیہ نے فوراً" ہی تردید کی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ جبکہ نابیہ نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔

"اچھا آپ کا مشاہدہ اور تجربہ میرے بارے میں کیا کہتا ہے؟" اس نے دونوں بازو سینے سے باندھتے ہوئے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"میرا مشاہدہ تو یہی کہتا ہے کہ آپ کو لوگوں کی پہچان نہیں۔ جس کی وجہ سے قدم قدم پر ٹھوکر کھا کر لڑھکتے پھرتے ہیں۔" نابیہ کے بے لاگ تبصرے پر وہ حقیقتاً ہکا بکا ہوا۔

"اس کے علاوہ حد درجہ جذباتی اور قدرے بے وقوف بھی واقع ہوئے ہیں۔" نابیہ کی طرف سے ایک اور زوردار حملہ ہوا۔

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ تھوڑا سا برا مان کر طنزاً" بولا۔

"میں۔۔۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "میں انتہائی بدتمیز، منہ پھٹ، بے صبری، جذباتی اور احمقانہ حد تک پر اعتماد لڑکی ہوں۔ دل کی اچھی ہوں۔ لیکن آج کل دلوں میں کون جھانکتا ہے۔ اس لیے میرے جیسے لوگ بھی زمانے میں ان فٹ ہوتے ہیں۔" وہ کھلے دل سے اپنا مذاق اڑاتی ہوئی اسے اور حیران کر گئی۔

"ہوں۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "آپ کی تھیوری کے مطابق تو پھر ہم دونوں ہی سوسائٹی میں موو کرنے کے لحاظ سے ان فٹ ہیں، ہیں نا۔" اس نے سامنے کھڑی لڑکی کو اپنی گہری نظروں کے حصار میں لیا۔

"جی ہاں۔۔۔" نابیہ بڑے دلکش انداز میں مسکراتی ہوئی اس کے دل کے تاروں کو ہلا گئی۔

"پھر کیا خیال ہے دوستی ہو جائے؟" اس نے ایک دم ہی اپنا دایاں ہاتھ نابیہ کی طرف بڑھایا تو وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے گالوں پر بکھرتی لالیاں سامنے کھڑے بندے کے دل میں ایک حشر سا برپا کر گئیں۔ وہ اب کھلے دل سے قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ جبکہ نابیہ کے لیے اپنی بے ربط ہوتی سانسوں پر قابو پانا دنیا کا مشکل ترین کام ثابت ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اس قبرستان میں آکر تو مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے موت کوئی بہت رومانوی سی چیز ہے۔"

سکینہ کے منہ سے نکلنے والی اس بے تکی سی بات نے ڈاکٹر خاور کے ساتھ سسٹر ماریہ کو بھی حیران کیا۔ اسلام آباد کے اس قبرستان میں اردو ادب کی کئی نامور شخصیات دفن تھیں۔ اس دن ڈاکٹر خاور سکینہ کو خصوصی طور پر اس قبرستان سے تھوڑے سے فاصلے پر واقع پرائیوٹ اسپتال میں لے کر آئے تھے۔ تاکہ اپنے ایک دوست اسپائنل سرجن کے ساتھ سکینہ کا کیس ڈسکس کر سکیں۔ واپسی پر انہوں نے سرسری سا اس قبرستان کا تذکرہ کیا تو سکینہ اسے دیکھنے کے لیے مچل گئی۔

"توبہ کرو سکینہ! موت تو بہت خوف ناک چیز ہوتی ہے۔" سسٹر ماریہ نے فوراً" ہی کانوں کو ہاتھ لگا کے اسے ڈرایا۔

"بھئی۔۔۔ ایسی چیز جس کے بعد دوبارہ مرنے کا کوئی خوف نہ ہو۔ وہ کیسے خوف ناک ہو سکتی ہے۔" سکینہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں سسٹر ماریہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہاں تو پہلی دفعہ مرنا بھی کون سا آسان کام ہے۔" سسٹر ماریہ اس کی وہیل چیئر کو تھامے کھڑی ڈاکٹر خاور کو دیکھ رہی تھی جو کافی لوگوں کی قبروں پر دعا کر کے آئے تھے۔

"قدرت اللہ شہاب، احمد فراز، نسیم حجازی، پروین شاکر اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کی آخری آرام گاہ بھی یہیں ہے۔" ڈاکٹر خاور نے اس کے قریب پہنچ کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"یہ تو بہت مہنگا قبرستان ہوگا۔ ہے نا۔" سکینہ کے حسرت بھرے لہجے پر ڈاکٹر خاور مسکرائے۔

"نادان لڑکی! مرنے والے لوگوں کو کیا پتا کہ وہ کن جگہوں پر دفن ہیں۔ انہیں تو اگلے جہاں کے حساب کتاب کی فکر کھا جاتی ہیں۔ یہ تو سارے زندہ لوگوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے مسئلے مسائل ہیں۔" انہوں نے سسٹر ماریہ کو اشارہ کیا کہ گاڑی کی طرف چلیں۔

"کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ بہت منظم انداز سے بنا ہوا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا یہ۔۔۔" سکینہ کے بچکانہ انداز پر سسٹر ماریہ نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔

"سکینہ! اچھے اچھے کلمات منہ سے نکالتے ہیں۔ یہ بھی کوئی پسند کرنے کی جگہ ہے۔"

"میں نے کیا غلط کہا۔ پہلے ہی اماں گاڑی میں منہ بنا کر بیٹھی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ عورتوں کا قبرستان میں جانا منع ہے۔" سکینہ نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے سسٹر ماریہ کو یاد دلایا۔

"تمہاری اماں سیانی عورت ہے۔ مولوی صاحب کا سارا علم اس نے گھول کے پی رکھا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی ہوگی۔" سسٹر ماریہ نے سنجیدگی سے کہا۔ جبکہ جمیلہ مائی نے ان تینوں کو گاڑی کی طرف آتے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ جبکہ ڈاکٹر خاور مسکراتے ہوئے ان کی گفتگو سنتے رہے۔ انہوں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔

"سکون آگیا؟" جمیلہ مائی نے بڑی خفا نگاہوں سے سکینہ کو دیکھا جو نہ جانے کیوں آج ضد پر تھی۔

"ہاں اماں آگیا۔" سکینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو اماں ناراضی سے باہر کھڑکی میں دیکھنے لگی۔ گاڑی ایک دفعہ پھر ان کے اسپتال کی جانب گامزن ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

"دیکھیں علی! جب وہ آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی تو میں کیسے زبردستی کروادوں۔" وہ جو علی کو ایک دفعہ پھر اپنے آفس میں دیکھ کر ایک دم خوش ہوگئی تھی۔ اس کی فرمائش سن کر ماہم کا موڈ بری طرح خراب ہوگیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ اسے کسی قسم کی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ورنہ وہ دل میں بغض رکھنے والی لڑکی نہیں۔" علی نے سنجیدگی سے ماہم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ اسے کب سے جانتے ہیں۔" ماہم نے بلیک کافی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

"یہی کوئی پچھلے چند مہینوں سے۔" اس نے حیرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ہوں۔۔۔" ماہم نے اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھا' جو اس کے دل چاروں خانوں پر قابض ہوگیا تھا۔

"جبکہ میرا اور ماہم کا ساتھ کوئی بائیس تیئس سالوں پر محیط ہے۔ اس کے اور میرے بابا دونوں ہی آرمی میں تھے۔ ان کی جگہ جگہ پوسٹنگ ہوئی۔ لیکن انہوں نے اپنی فیملیز کو ہمیشہ ایک ہی اسٹیشن پر رکھا۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" علی نے اس کی بات کاٹی۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ آپ عائشہ کو نہیں جان سکتے۔" اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"یہ ضروری نہیں ہے ماہم!" علی نے اس کی بات سے اختلاف کیا۔

"یہ بالکل ضروری ہے سر۔" ماہم نے اس کا مذاق اڑایا۔

"آپ مجھے بس اتنا بتا دیں کہ وہ آج کل فاطمہ پارک میں اپنی پینٹنگز بنانے کے لیے کتنے بجے جاتی ہیں۔" علی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اس نے پینٹنگز بنانی چھوڑ دی ہیں۔" ماہم کی اطلاع پر اسے دھچکا سا لگا۔

"ان کا نیا سیل نمبر ہے آپ کے پاس؟" اسے اچانک یاد آیا۔

"نہیں۔۔۔" وہ صاف مکر گئی۔ علی نے اپنے اندر ابلتے ہوئے اشتعال پر بمشکل قابو پایا۔ "کوئی پی ٹی سی ایل نمبر؟"

"لینڈ لائن نمبر ہے۔ لیکن وہ میں عائشہ کی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتی۔" اس نے بدلحاظی سے کہا تو علی نے ایک لمبا سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"ویسے آپ کیوں اس طرح اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟" ماہم نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میں بس اپنی پوزیشن اس کے سامنے کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔" علی نے ایک لمبا سانس لے کر ماہم کی آنکھوں میں موجود تاثر کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنی زندگی کی راہیں متعین کر چکی ہے۔" ماہم کی اطلاع پر اسے جھٹکا سا لگا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کے راستوں کی منزل کہاں جاتی ہے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر گیا۔

"رامس علی کی طرف۔" ماہم کے منہ سے پھسلا۔ سامنے بیٹھے شخص کو زوردار سا کرنٹ لگا۔ "کون رامس علی؟"

"میرا ایک پیشنٹ تھا۔" وہ اب علی کے چہرے کی اڑتی رنگت سے باقاعدہ لطف اندوز ہوئی۔

"آپ کا پیشنٹ؟ لیکن عائشہ کو کہاں ملا وہ؟" علی نے بڑے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

"ظاہر ہے میرے ہی کلینک پر۔" ماہم نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن عائشہ نے مجھ سے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔" علی کو یقین نہیں آیا۔

"ظاہر ہے' وہ اپنی اتنی پرسنل بات آپ سے کیوں کرے گی؟" ماہم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"رامس علی کہاں رہتا ہے۔" اس نے غور سے ماہم کا چہرہ دیکھا جو خاصا پرسکون تھا۔

"یہیں اسلام آباد میں' کچھ عرصے پہلے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ اس کی والدہ اسے میرے پاس لائی تھیں۔" ماہم نے ترنگ میں آکر تفصیل دی۔ "کوئی ڈپریشن وغیرہ کا مسئلہ تھا اسے اپنے والد کے انتقال کے بعد۔"

"اوہ۔" وہ ایک دم ہی کھڑا ہوا۔

"اب کیا آپ رامس علی سے ملنے جائیں گے۔" ماہم نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"آپ کو یقین ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہیں؟" اس نے ماہم کا سوال نظر انداز کر کے اپنا سوال کر دیا۔

"یس ہینڈرڈ پرسنٹ۔" اس نے بھی نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "ویسے رامس علی کی والدہ بھی کسی خاص سلسلے میں عائشہ کے ہاں چکر لگا چکی ہیں۔" ماہم کی اطلاع پر علی کے چہرے کا رنگ اڑا۔

"لیکن آپ نے تو پچھلی دفعہ بتایا تھا کہ اس کی کہیں اور بات چیت چل رہی ہے۔" علی کو یاد آیا۔

"یس آف کورس! لیکن جہاں دونوں طرف انٹرسٹ ہو' بات وہیں آگے بڑھتی ہے۔" ماہم نے آخری کیل بھی مضبوطی سے ٹھونکی۔ علی کے ذہن میں طوفان سا برپا تھا۔ وہ بڑی عجلت میں اس کے کلینک سے نکلا۔ وہ بہت تیزی سے ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ بلیو ایریا کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک اس کی نظر سامنے مارکیٹ سے نکلتی عائشہ پر پڑی۔ اس نے اچانک ہی بریک لگائی۔ عائشہ کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے شاپر اٹھائے لڑکے کو دیکھ کر اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ وہ اگلے کئی لمحوں تک بریک پر سے پاؤں نہیں اٹھا سکا۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں کے ہارن کی آوازوں نے ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے کیا میرے گھر میں خفیہ کیمرے نصب کر رکھے ہیں یا کسی کو میری جاسوسی پر مامور کر رکھا ہے' جو ہر جگہ ٹپک پڑتے ہو۔" آج کافی دنوں بعد وہ گھر سے نکلی تھی۔ ماما' بابا کی ویڈنگ اینورسری کا گفٹ لینا تھا۔ لگے ہاتھوں اس نے آج موحد کے لیے بھی شاپنگ کر لی۔ اپنے کام سے فراغت پا کر وہ جیسے ہی پارکنگ کی طرف بڑھی تو سامنے ہنستے مسکراتے رامس کو دیکھ کر ایک دم جل کر بولی۔

"کیسے غلط اندازے بعد میں لگائیے گا۔ فی الحال یہ شاپر پکڑائیں مجھے۔" رامس نے آگے بڑھ کر اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھ سے شاپر پکڑے اور اس کی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

"یہ تم کس خوشی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہے ہو۔" عائشہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا' جو بڑی بے تکلفی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

"اب مردوں کی موجودگی میں خواتین گاڑی ڈرائیو کرتی اچھی لگتی ہیں کیا۔ کم از کم مجھے تو سخت زہر لگتا ہے۔" اس کی معصومیت عروج پر تھی۔

"تمہاری گاڑی کہاں ہے۔" عائشہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"ورکشاپ میں۔" بڑے اطمینان سے جواب آیا۔

"تو تم یہاں تک آئے کیسے ہو؟" عائشہ نے بادل نخواستہ اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ایک دوست ڈراپ کر کے گیا ہے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تم گاڑی کہاں لے جا رہے ہو۔" عائشہ نے اسے مخالف سمت میں مڑتے دیکھ کر بوکھلا کر پوچھا۔

"اپنے گھر۔" وہ گیئر تبدیل کرتے ہوئے اسے سلگا لیا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ میں کیا کرنے جاؤں گی وہاں۔" عائشہ کا ضبط جواب دے رہا تھا۔

"ماما بیمار ہیں۔ ان کی میڈیسن لینی تھی۔ بس گیٹ پر ہی دے کر آپ کو چھوڑ آؤں گا۔" اس کی سنجیدگی پر عائشہ کا غصہ کچھ کم ہوا۔ "کیا ہوا ماما کو؟"

"وہ ہی انجائنا کا درد اور شوگر کا مسئلہ ہے۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"اب کون ہے ان کے پاس؟" وہ فکر مند سی ہو کر بولی۔

"بھائی ہیں ان کے پاس۔۔۔ لیکن ان کی بھی کل سے کافی طبیعت خراب ہے۔ کچھ فلو اور بخار سا ہے۔" وہ ایک سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

"تو تم دونوں بھائی شادی کیوں نہیں کر لیتے ہو۔" عائشہ کو غصہ آیا۔

"کوئی کرتا ہی نہیں۔" رامس نے بات کو مذاق میں اڑایا۔ اس کی بات پر عائشہ نے برا سا منہ بنایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"عائشہ۔۔۔" اس نے بہت آہستگی سے اس کا نام لیا۔ وہ بری طرح چونکی۔ "میں بہت حساس طبیعت کا بندہ ہوں۔ لڑکیوں سے پہلے بہت الرجک تھا۔ میری زندگی میں پہلی دفعہ جو لڑکی آئی اس کا نام ماہم منصور تھا۔" اس نے رامس کی طرف دیکھا۔

"لوگ میرے ساتھ بڑی بڑی باتیں کر کے بھول جاتے ہیں۔ لیکن میں ان ہی باتوں کے حصار میں سے کئی سالوں تک نہیں نکل پاتا۔ یہ لفظ بے جان لگتے ہیں لیکن ان کے اندر احساس کی دھڑکنیں ان کو اتنی قوت بخش دیتی ہیں کہ کسی کی زندگی کو بنا بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے صاف گوئی سے پوچھا۔

"مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ جس دن آپ نے مجھے ماہم اور موحد کے قصے کا بتایا تھا۔ اسی دن شاید روانی میں ہی آپ نے کہا تھا کہ رامس! تم میرے لیے موحد کی طرح ہو۔" عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے واقعی یاد نہیں تھا۔

"مجھے یاد ہے رامس۔" اس نے خفت سے کہا تو رامس مسکرا دیا۔ "اگر یاد ہوتا تو آپ میرے ساتھ اتنی بے رخی سے پیش نہ آتیں۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر آپ مجھے موحد سے کم ہرگز نہیں پائیں گی۔"

رامس کے خلوص دل سے کہی بات نے عائشہ کی آنکھوں کو بے اختیار نم کیا۔ آنسوؤں کا ایک ریلا سا آنکھوں سے نکلا اور پھر گالوں پر پھسلتا ہی گیا۔

"اوہ مائی گاڈ! آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے آخر' کیوں ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی ہیں۔" وہ گاڑی اپنے گھر کے سامنے روک چکا تھا۔ اب مصنوعی غصے

سے اسے گھور رہا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔" عائشہ نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا۔ اسی لمحے گھر کا گیٹ کھلا' اندر سے نکلنے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے بے یقین نظروں سے سڑک پر کھڑی گاڑی کو دیکھا۔

"رامس! ماما کی میڈیسن لے آئے ہو۔" ایک مانوس لہجہ عائشہ کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر رامس کے دائیں جانب دیکھا۔ اسے شاک لگا۔

"اوہ بھائی آپ۔۔۔" وہ ایک دم چونکا۔ اس نے گاڑی کے کھلے شیشے میں سے اپنے بالکل پاس کھڑی گاڑی میں بیٹھے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا تو ہلکا سا گھبرایا۔

"جی! لے آیا ہوں۔" اس نے عجلت بھرے انداز میں جواب دیا ۔ جبکہ اس کی بات سنتے ہی وہ اپنی گاڑی زن کر کے نکال کر لے گیا۔ اس کی اس حرکت پر رامس اچھا خاصا شرمندہ ہوا۔

"آئی ایم سوری! بھائی کچھ جلدی میں تھے' اس لیے میں نے آپ کا تعارف نہیں کروایا۔" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو بالکل حق دق انداز میں گاڑی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہارے بھائی ہیں؟" عائشہ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور بھابھی۔۔۔؟" عائشہ نے دل پر پتھر رکھ کر سوال کر ہی لیا۔

"کون سی بھابھی۔۔۔؟" اس نے حیرانی سے عائشہ کا پھیکا چہرہ دیکھا۔

"تمہارے بھائی کی شادی نہیں ہوئی کیا؟" عائشہ نے حیرت سے کہا۔

"نہیں! کس نے کہہ دیا؟ انٹرنیشنل کنوارے ہیں میرے بھائی۔۔۔" رامس کی بات پر عائشہ کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ اس نے سخت بے یقینی سے رامس کا چہرہ دیکھا۔

"لیکن آپ بھابھی کا کیوں پوچھ رہی ہیں۔" رامس نے بڑا عقل مندانہ سوال بڑے موقع پر کیا تھا' لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سوال اسے خاصا مہنگا پڑے گا۔ عائشہ اس کے سوال کو سنتے ہی دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر جو رونا شروع ہوئی تو رامس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

☆ ☆ ☆

"سکینہ! کیا یہ ضروری ہے کہ جس کے ساتھ محبت کی جائے' اسے زندگی کا ساتھی بھی بنایا جائے۔" ڈاکٹر خاور شام کو گھر جاتے ہوئے لان کی طرف نکل آئے جہاں وہیل چیئر پر بیٹھی سکینہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"یہ ضروری نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔۔۔" سکینہ کے جواب نے انہیں حیران کیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے رکھے بنچ پر بیٹھ گئے۔

"پھر شادی کس سے کی جائے۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے دلچسپی سے اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔ وہ بوگن ویلیا کی بیل کے نیچے تھی۔ عنابی رنگ کے پھول چاروں جانب بکھرے ہوئے تھے۔

"شادی اس سے کی جائے جو آپ سے محبت کرتا ہو۔" سکینہ نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

"لو یہ کیا بات ہوئی۔ اپنے دل کو چھوڑ کر کون بندہ کسی دوسرے کے دل کی پروا کرتا ہے۔" انہوں نے شوخ لہجے میں اسے چھیڑا۔

"جو بندہ صرف اپنے ہی دل کی سنتا ہے تو پھر دل بھی کسی ضدی بچے کی طرح ہی اسے خوار کرتا ہے۔ جب آپ دوسروں کی پروا کرتے ہیں تو اللہ آپ کے لیے بھی آسانیاں دے دیتا ہے۔"

"اللہ آسانی کے ساتھ وہ ہی محبت کیوں نہیں دے دیتا۔" ڈاکٹر خاور کو اس سے بحث کرنے میں مزا آنے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایک بات یاد رکھیے گا کہ محبت کے سفر میں "چاہنے" سے زیادہ "چاہے" جانے کا احساس زیادہ دلکش ہوتا ہے۔ جب آپ محبت نام کا کٹورا لے کر کسی کے پیچھے نکلتے ہیں تو آپ کو کئی چیزوں کی قربانی دینا پڑتی ہے، جس میں سرفہرست آپ کی عزت نفس ہے۔ اس کے برعکس انسان کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے چاہا جارہا ہے تو چاہے جانے کا احساس کسی نشے کی طرح اسے کئی کئی دن تک مدہوش کیے رکھتا ہے۔ بے شک تجربہ کرکے دیکھ لیں۔" سکینہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو بے ربط ہونے سے بچایا۔

"جب انسان کا اپنا ہی دل بجھ جائے تو وہ کسی اور کی محبت سے کیسے دل بہلائے۔" ڈاکٹر خاور نے افسردگی سے کہا۔

"دوسروں کی محبتیں صرف دل بہلانے کا ذریعہ تھوڑی ہوتی ہیں۔" سکینہ کو ان کی بات اچھی نہیں لگی، اس لیے فوراً" اظہار کردیا۔

"آئی ایم سوری سکینہ! میرا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا۔" ڈاکٹر خاور نے بوکھلا کر صفائی دی۔

"دوسروں کی محبتیں ہمیں بغیر خوار ہوئے مل جاتی ہیں نا، اس لیے ہمیں اس کی قدر نہیں ہوتی۔" سکینہ کا دل ابھی بھی صاف نہیں ہوا۔

"اچھا، اگر یہ بات ہے تو بتاؤ کہ اعجاز سے کیوں چڑتی ہو تم۔۔۔؟" ڈاکٹر خاور نے اسے ایک لمحے میں لاجواب کیا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا وہ۔۔۔" اس نے اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔ اس کی بات پر ڈاکٹر خاور کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا جان دار تھا۔ سکینہ سخت خفت کا شکار ہوئی۔

"سکینہ اللہ دتا! دوسروں کو سمجھانا اور نصیحت کرنا دنیا کا جتنا آسان کام ہے، خود اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔

سکینہ بے بسی کے احساس کے ساتھ مسکرائی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ آپریشن کے بعد کی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے اس کا دھیان بٹانے کو پوچھا۔

"سچی بات بتاؤں ڈاکٹر صاحب!" وہ تھوڑا سا جھجکی۔

"ہاں بالکل۔" ڈاکٹر خاور نے نرمی سے کہا۔

"میرا اب کچھ بھی سوچنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ ایسے لگتا ہے جیسے زندگی میں کوئی فل اسٹاپ سا لگ گیا ہو۔" اس کی آنکھوں میں رنج چھلکا اور ڈاکٹر خاور کو مضطرب کرگیا۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے سکینہ! اچھا اچھا سوچتے ہیں۔" ان کی آنکھوں میں سکینہ کے لیے ایک خاموش دلاسا تھا۔

"بہت عرصہ میں نے بہت اچھا اچھا سوچ کر دیکھ لیا، اب خود کو اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔" اس نے اپنی گود میں گرے بوگن ویلیا کے پھول فضا میں اچھالے۔

"جب اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے تو ایسی باتیں نہیں کرتے جس سے لگے کہ مجبوراً" یہ فریضہ سرانجام دیا گیا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا تو وہ اداسی سے سر ہلا کر رہ گئی۔

"میں نے آپ کے لیے ایک کام سوچا ہے۔" ڈاکٹر خاور کی بات نے اسے تجسس میں مبتلا کیا۔

"میرے لیے۔" وہ حیران ہوئی۔ "وہ کیا۔۔۔؟"

"یہ تو میں آپ کے آپریشن کے بعد ہی بتاؤں گا ان شاء اللہ۔۔۔" ڈاکٹر خاور کے چہرے پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ ابھری۔

"ہوں۔۔۔" اس نے سر ہلایا۔ "لیکن میں یہ شہر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔" سکینہ نے بے چارگی سے کہا۔

"ہم آپ کو اسی شہر میں رکھیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر اس کا دل تھوڑی سی خوش فہمی کا شکار ہوا۔

"اسی شہر میں، کہاں۔۔۔؟" وہ حد درجہ تعجب کا شکار ہوئی۔

"کہیں بھی۔۔۔" وہ بڑے پروقار انداز سے مسکرائے۔ "یہ کوئی چھوٹا شہر تھوڑی ہے سکینہ۔۔۔" انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں مزید کہا۔ "اور کہیں نہ سہی، میرا گھر تو آپ کے لیے حاضر ہے۔"

سکینہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے ڈاکٹر خاور کو دیکھا۔ جن کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح نرمی اور چہرے پر ایک پرخلوص سی مسکراہٹ تھی۔ سکینہ کو تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ دل کسی مورنی کی طرح ناچنے لگا اور آنکھوں میں جگنوؤں کی ایک بارات سی آکر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"مائی گاڈ! علی، رامس کا بھائی ہے۔" اپنے کمرے کے کارپٹ پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اس نے کوئی سیکڑوں دفعہ سوچا۔

اس دن رامس کے بے تحاشا اصرار پر بھی اس نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔ اپنے دل کی اتھل پتھل حالت کو سنبھالتے ہوئے وہ نہ جانے کس طرح اپنے کمرے تک پہنچی تھی۔ ماما کے پاس انصر بھائی کی والدہ آئی ہوئی تھیں۔ اسے ڈرائنگ روم میں جاکر خالہ کو سلام تک کرنا یاد نہیں رہا۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"یہ میں نے کیا کردیا۔۔۔ پھر وہ لڑکی کون تھی۔۔۔ اس نے اتنے دھڑلے سے علی کا نام کیوں لیا؟" دماغ میں بے شمار سوچوں نے اودھم مچایا۔

"رامس تو ہزار دفعہ اپنے بھائی کا ذکر کرچکا ہے اور اگر واقعی اس کی کوئی بھابھی ہوتی تو وہ اس کا ذکر کیوں نہ کرتا۔" اس نے خود کو سمجھایا۔

"پھر وہ لڑکی کون تھی۔۔۔ کاش! وہ مجھے دوبارہ کہیں مل جائے۔" اس نے آنکھیں زبردستی بند کرتے ہوئے صوفے کے ساتھ ٹیک لگائی۔

"ہر دفعہ ایک ہی لڑکی کیوں؟ کہیں اس کے بھائی نے چوری چھپے شادی تو نہیں کررکھی۔" دماغ نے ایک نئی راہ دکھائی۔

"نہیں۔ وہ ایسا لگتا تو نہیں۔" دل نے فوراً" ہی اس کی طرف داری کی۔

"مجھے علی کو کال کرنی چاہیے۔" اس نے فوراً" ہی بیگ اٹھا کر اپنا سیل فون نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب بیل جارہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ایک لمحے کو رک گئیں۔ سانسوں کے تسلسل میں بھی بے قاعدگی پیدا ہوئی۔ دوسری جانب سے کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔ عائشہ کا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔ اس نے بے تابی سے اس کا نمبر دوبارہ ملایا۔ اس دفعہ تیسری بیل پر اس کی کال کاٹ دی گئی۔ عائشہ کے دل کو دھچکا لگا۔ وہ اب پاگلوں کی طرح بار بار اس کا نمبر ڈائل کررہی تھی، لیکن ہر دفعہ اس کی کال فوراً" کاٹ دی جاتی۔

"علی! میری کال اٹینڈ کریں۔" اس نے مختصر سا ایک ٹیکسٹ اسے بھیجا۔

"میں آپ کی آواز سننا نہیں چاہتا۔" دوسری طرف سے آنے والا میسج پڑھ کر عائشہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے بری طرح سے زمین پر دھکا دے دیا ہو۔ اس نے ایک دفعہ پھر اس کا نمبر ملایا، لیکن اس دفعہ نمبر پر چلنے والی ٹیپ سے اسے پتا چلا کہ فون ہی بند کردیا گیا ہے۔

"یہ میرے ساتھ ایسا کیوں کررہا ہے؟" ایک پریشان کن سوچ نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا۔

"تم نے بھی تو اس کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ اسے کسی بھی قسم کی صفائی کا موقع دیے بغیر فرد جرم عائد کردی تھی۔" دل نے بھی عین موقع پر آکر اسے یاد دلایا۔

اس نے سیل فون بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ حد درجہ ذہنی خلفشار کا شکار ہوئی۔ اسی ذہنی پراگندگی کے ساتھ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

"بھائی! طبیعت ٹھیک ہے؟" اس نے موحد کو ڈرائنگ روم کے ایک اندھیرے کونے میں کشن

WWW.PAKSOCIETY.COM

آنکھوں پر رکھے بیٹھے دیکھا۔
"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔" موحد نے بے زاری سے جواب دیا۔ عائشہ نے کمرے کی ساری لائٹس جلا دیں۔
"عاشو! لائٹیں بند کردو' مجھے روشنی اچھی نہیں لگ رہی۔۔۔" موحد نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔ عائشہ نے ایک دفعہ پھر ساری لائٹیں آف کردیں۔ کمرے میں بس لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی روشنی آرہی تھی۔
"بھائی! جن لوگوں سے ہمیں محبت ہو۔ ان کی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے ہمیں باہر کی روشنی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی آنکھوں کی نمی براہ راست دل پر پڑتی ہے۔" عائشہ تھکی تھکی اس کے پاس کاربٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ یہ اس کا مخصوص اسٹائل تھا۔ وہ اب اپنی کہنیاں اس کے گھٹنے پہ ٹکائے بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
"اور جن لوگوں سے آپ محبت کا دعوا کرتے ہوں' ان سے کوئی بات چھپانی بھی نہیں چاہیے۔" موحد نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ کر گیا۔
"ہم دونوں بہن بھائی ہی محبت کے معاملے میں شاید بد قسمت واقع ہوئے ہیں۔" عائشہ کے افسردہ لہجے پر موحد نے فوراً" آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں کی لالی سے عائشہ نے بمشکل نگاہیں چرائیں۔
"عاشو! کون تھا وہ۔۔۔" موحد نے اس کے سرد ہاتھ تھامے اور انتہائی محبت سے انہیں اپنے ہاتھوں سے حرارت بخشی۔
"شاید کوئی مانوس اجنبی تھا' جسے میں نے اپنی بد گمانی سے کھودیا۔" عائشہ اکیلے یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی' اس لیے آج ضبط کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔
"محبت اتنی بد گماں کیوں ہوتی ہے؟" موحد کے اپنے دل کے سارے ٹانکے بھی ادھڑ گئے۔
"محبت ہی تو بد گمان ہوتی ہے ورنہ دوسرے جذبوں کے معاملے میں تو ہم لاپروا ہوتے ہیں۔ جس چیز کی پروا ہوتی ہے۔ اسی چیز کے کھو جانے کا اندیشہ ہمیں ہلکان کیے رکھتا ہے اور ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے ردعمل ظاہر کرنے لگتے ہیں۔" عائشہ نے اپنا نچلا لب کچلتے ہوئے وضاحت دی۔
"کیا اس نے آپ کو فون نہیں کیا؟" عائشہ نے اس کی خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔
"نہیں' وہ بھی شاید میری طرف سے بد گمان ہوگئی ہے۔" موحد رنج بھرے انداز سے بولا۔
"محبت زیادہ دیر تک بد گمان رہ ہی نہیں سکتی۔ دل کوئی نہ کوئی منطق یا دلیل ڈھونڈ ہی لاتا ہے۔" عائشہ نے موحد کا ہاتھ دبا کر تسلی دی۔
"پھر تمہارے دل نے کوئی منطق یا دلیل ڈھونڈنے میں اتنی دیر کیوں کردی۔" موحد نے فوراً" سوال کرکے اس کے دل کی دھرکنوں میں ارتعاش برپا کر دیا۔
"زیادہ دیر تو نہیں ہوئی بھائی۔۔۔" عائشہ نے سادگی سے کہا تو موحد نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی بہن کا چہرہ دیکھا جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا تھا۔
"تھوڑی بہت ناراضی تو اس کا بھی حق بنتی ہے نا۔" اس کے معصومانہ انداز پر وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

"تم یہ سب مجھے اب بتا رہی ہو؟" ثنائلہ نے سخت صدمے سے سامنے دیوار پر بیٹھی نابیہ کو دیکھا جو ایک گرما گرم ابلے ہوئے بھٹے پر لیموں اور نمک مرچیں لگائے بڑے مزے سے کھا رہی تھی۔
"تو کیسے بتاتی یار! دو دفعہ آئی' خالہ جان پاس سے اٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔ اس کے بعد کل آئی تو اس وقت تم شہیر کی کال سننے میں مصروف تھیں۔" نابیہ نے فوراً" گھبرا کر صفائی دی۔
"شٹ اپ' بات نہ کرو مجھ سے۔۔۔" ثنائلہ کو ٹھیک ٹھاک غصہ آگیا۔
"اب تو بات کرنا میری مجبوری ہے' ظاہر ہے کہ تمہارے ماموں کے بیٹے پر دل جو آگیا ہے میرا۔" نابیہ نے ایک آنکھ شرارت سے دبا کر اسے اشارہ کیا۔

"حکومت اور یہ لوفروں کی طرح حرکتیں بند کرو۔" ثنائلہ نے ٹھیک ٹھاک اسے جھاڑا لیکن نابیہ نے فوراً" ہی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔
"قسم سے رج کے سوہنا ہے تمہارا کزن' اور جب بازو سینے پر باندھ کے غور سے دیکھتا ہے تو یقین کرو نور جہاں کی طرح وہ گانا گانے کو دل کرتا ہے۔" وہ اچھل کر دیوار سے زمین پر آئی۔ اس وقت دونوں اپنی مشترکہ چھت پر تھیں جن کے درمیان چھوٹی سی منڈیر تھی۔
"وے میں دل تیرے قدماں وچ رکھیا۔۔۔ تو پیر اوتھے پاتے سہی۔۔۔" وہ شرارت سے پوری چھت پر گھوم رہی تھی۔ اس کی شوخیاں اس وقت ثنائلہ کو زہر لگ رہی تھی۔
"بند کرو' اپنی فضول' بے ہودہ حرکتیں۔ ہم لوگ یہاں اتنی ٹینشن میں ہیں' امی روز مجھ سے پوچھتی ہیں کہ تمہارے ماموں کے گھر سے کوئی اطلاع نہیں آئی اور تم۔۔۔" مارے غصے کے ثنائلہ سے بولا ہی نہیں گیا۔
"دھیرج میری جان دھیرج! اب تو کچے دھاگے سے سرکار بندھے چلے آئیں گے۔" نابیہ پر ابھی بھی شرارت کا بھوت سوار تھا۔
"تم اپنے یہ کچے پکے دھاگے اپنے پاس رکھو اور مجھے شرافت سے اس کا نمبر دو۔ میں خود بات کرتی ہوں۔" ثنائلہ کی سنجیدگی پر نابیہ نے بھی معاملے کو ذرا سنجیدہ لیا۔
"اب صبر کرلو' یہ بھٹہ کھا کر نیچے جاتی ہوں' میرے سیل فون میں ہے اس کا نمبر۔ لے لینا' جان کیوں نکل رہی ہے۔" وہ اب عجلت بھرے انداز میں کھانے لگی۔ مرچوں کی وجہ سے اس کی ناک اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا' لیکن وہ سوں سوں کرتے ہوئے بھی کھانے سے باز نہیں آرہی تھی۔ ثنائلہ خاموشی سے آسمان پر ڈولتی ہوئی پتنگوں کو دیکھنے لگی۔
"ویسے کیا حال ہے تمہارے ہیرو کا' کوئی فون شون آیا کہ نہیں۔۔۔" نابیہ کو چانک ہی یاد آیا تو ثنائلہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"تب ہی مزاج گرامی اتنا برہم ہے۔" نابیہ نے بلند آواز میں تبصرہ کیا' لیکن دوسری جانب ہنوز خاموشی تھی۔ "تم نے خود کال کرکنی تھی۔"
"کیوں میں کیوں کروں؟" وہ ایک دم پلٹ کر غصے سے بولی۔ "اب کیا ہر دفعہ میں ہی پہل کروں' پہلے بھی میں ہی اس کے پیچھے بھاگتی رہی تو کیا اب ساری زندگی یہی کام کیے جاؤں گی۔" ثنائلہ کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب تھا۔
"کم آن مائی ڈیر! محبت میں تیرے میرے والے حساب نہیں ہوتے۔ یہ سوچنے لگو گی تو اپنی ہی زندگی خراب کروگی۔" نابیہ نے ہاتھ میں پکڑا بھٹہ اب ساتھ والوں کی چھت پر پھینک دیا۔ ثنائلہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔
"یہ لوگ بھی تو آم کھا کر گٹھلیاں ہماری چھت پر پھینک دیتے ہیں۔" اس نے کان کھجاتے ہوئے صفائی دی۔
"تم کبھی نہیں سدھر سکتیں۔" ثنائلہ نے مایوس ہو کر کہنیاں دیوار پر ٹکالیں۔ سامنے سورج غروب ہونے کا منظر دل میں افسردگی کا احساس بھر رہا تھا۔
"وہ بھی یہی کہتا ہے۔" نابیہ نہ چاہتے ہوئے بھی شرارت کر گئی تو ثنائلہ کو ہنسی آگئی۔ اس کا موڈ بہتر دیکھ کر نابیہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔
"چلو' صبح تمہارے ہیرو سے ملنے چلتے ہیں۔" اس کی فرمائش پر ثنائلہ کو جھٹکا سا لگا۔ "ہرگز نہیں۔۔۔" اس نے صاف انکار کیا۔
"یہ تم سب محبت کرنے والوں کی مشترکہ بری عادت ہوتی ہے' ہر وقت انا کے اونچے مینار پر بیٹھ کر جلتے اور کڑھتے رہیں گے' لیکن ناک نیچی ہونے کے خوف سے رابطہ نہیں کریں گے۔ ساتھ ساتھ نیچے جھانکتے بھی رہیں گے کہ شاید دوسرے کو عقل آجائے اور وہ اسے منانے آجائے۔" نابیہ کو بھی ایک دم ہی جلال آیا۔
"تمہیں بڑا تجربہ ہے۔۔۔" ثنائلہ اس کے جل کر بولنے پر کھلکھلا کر ہنسی۔
"نہیں ہے تو ہو جائے گا' تمہارے کمینے بھائی نے تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے سارے ہی ارمانوں پر پانی پھیر دیا تھا۔" وہ خود بھی ڈوبتے سورج کو دیکھ کر اداس ہوئی۔

"چلو بھائی تو خود غرض نکلا اب ذرا دھیان سے' اگلا بھی میرا ہی ماموں زاد ہے۔" ثنائلہ نے پہلی دفعہ اسے چھیڑا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"فکر نہ کرو' اس دفعہ مضبوطی سے پلّو سے باندھ کر گرہ لگاؤں گی۔ ایسے۔۔۔" نابیہ نے اپنے دوپٹے کے کونے کو گرہ لگا کر دکھائی تو ثنائلہ اس کی شرارت پر کافی دیر تک ہنستی رہی۔

☆ ☆ ☆

"ماہم! اگر آپ فری ہیں تو آج ڈنر اکٹھے کریں۔" علی کی غیر متوقع کال نے ماہم پر شادیٔ مرگ طاری کر دیا۔

وہ جواب بالکل ہی اس سے مایوس ہو گئی تھی۔ اس کال نے اس کے اندر قوت بھر دی۔ اس نے واڈروب سے اپنا بہترین سوٹ نکالا' بڑی مہارت اور سلیقے سے میک اپ کر کے اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ رائل بلیو کلر میں اس کی گوری شہالی رنگت کی چھب ہی نرالی تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے تو خود بھی ماہم مبہوت انداز سے خود کو دیکھتی رہ گئی۔ ہوٹل پہنچنے تک بے شمار تو صیفی نگاہوں نے اس کے وجود کا احاطہ کیا۔

"کیسے ہیں آپ۔۔۔" ماہم نے بڑی دلکش مسکراہٹ سے پہلے سے موجود علی کو دیکھا' جو خاصا تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"آپ کے سامنے ہوں۔ وہ بڑی دقت سے مسکرایا۔

"کچھ ٹینس لگ رہے ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں' ایک تو کام کا برڈن تھا اور کچھ دنوں سے امی کی بیماری کی وجہ سے رات کو سو بھی نہیں سکا۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"آپ ملوائیں نا' کسی دن اپنی ماما سے۔۔۔" ماہم کی فرمائش پر وہ تھوڑا سا چونکا۔

"ہاں ضرور کیوں نہیں' بہت جلد ان شاء اللہ۔۔۔" وہ ویٹر کو فارغ کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اچھی لگ رہی ہیں آپ۔۔۔" علی کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے نے ماہم کے چہرے پر اس قدر روشنی بھر دی کہ ایک لمحے کو علی خود بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔

"تھینکس گاڈ! آپ کے اندر بھی اچھی چیز کو سراہنے کی حس موجود ہے۔" ماہم کھلکھلا کر ہنسی تو دائیں بائیں سے کافی لوگوں نے مڑ کر بے اختیار اسے دیکھا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔" ماہم نے بڑے نزاکت بھرے انداز سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا' جہاں ہنسی کسی جھرنے کی طرح بہتی ہی جا رہی تھی۔ دل کی دنیا کے انوکھے راگ ماہم کو بے حال کیے جا رہے تھے۔ ہر چیز اسے محو رقص لگ رہی تھی۔

"کیوں' میں انسان نہیں ہوں کیا بلکہ میرے خیال میں تو میں اچھا خاصا جمالیاتی ذوق رکھتا ہوں۔" علی نے سادگی سے وضاحت دی۔

"اچھا؟" وہ بے مقصد ہنسی۔ "مجھے تو لگتا تھا کہ آپ کا سارا جمالیاتی ذوق آرٹ اور پینٹنگز تک محدود ہے۔" ماہم ہنستے ہنستے طنز کر گئی۔

"وہ تو ابھی بھی ہے۔" علی کی سنجیدہ بات پر اس کی ہنسی کو بریک لگی۔ "مجھے جہاں بھی کوئی اچھی پینٹنگ نظر آئے میں فوراً" اسے خریدنے کو بے تاب ہو جاتا ہوں۔" علی کی وضاحت پر وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

"آپ جس چیریٹی شو کا ذکر کر رہی تھیں' پچھلی دفعہ' اس پر کام اسٹارٹ کریں؟"

"جی' جی کیوں نہیں۔۔۔" علی کی بات نے اسے جی بھر کے بدمزہ کیا۔

آپ ایسا کریں کہ سارے پروگرام کا ایک خاکہ سا بنا لیں پھر اس کے مطابق کام شروع کر دیں گے۔" ماہم نے تفصیل سے جواب دیا

"ٹھیک ہے' میں پہلی فرصت میں اس پر کام شروع کرتا ہوں' پھر آپ سے ڈسکس کروں گا۔" علی نے

اپنی پلیٹ میں رائس نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا سوچا ہے آپ نے اپنی لائف کے بارے میں۔۔۔؟" ماہم نے اچانک ہی سوال کیا۔

"کیا سوچنا ہے؟ بس خود بخود ہی سب کچھ ہوتا جا رہا ہے اور چیزیں جتنے فطری انداز سے ہوں' اتنی ہی بہتر ہوتی ہیں۔" علی نے گھما پھرا کر ہی جواب دیا۔

"آپ نے اپنے بارے میں کبھی تفصیل سے بتایا ہی نہیں۔۔۔" ماہم نے بڑے لاڈ سے گلہ کیا۔

"مجھے اپنے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔" اس کی صاف گوئی دل کو دکھانے والی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" ماہم کھانا چھوڑ کر اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھنے لگی تو وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

"بھئی کوئی بتانے والی بات بھی تو ہو' بس دو بھائی ہیں ہم اور والدہ ہیں۔ یہی چھوٹی سی فیملی ہے ہماری۔۔۔" اس نے بادل نخواستہ تھوڑا بہت بتا ہی دیا' جو ماہم کے لیے تسلی بخش تھا۔

"اور جاب یا بزنس۔۔۔؟" ماہم نے فوراً" ہی اگلا سوال کیا۔

"بھئی نکما سا بندہ ہوں' غریب سا' بس لوگوں کی خدمت کر کے خوش ہو جاتا ہوں۔ یہی میرا کام ہے اور یہی بزنس۔۔۔" اس نے سراسر ماہم کو ٹالا تھا اور یہ بات اسے فوراً" سمجھ میں آ گئی۔

"حیرت ہے کہ آپ نے اس دفعہ عائشہ کے بارے میں نہیں پوچھا ابھی تک۔۔۔" ماہم نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔ وہ ہلکا سا چونکا اور مسکرایا۔

"جس راہ پر اب جانا ہی نہیں' اس کے بارے میں کیا پوچھنا۔" علی کی بات پر ماہم کو ایک خوش گوار سا جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔

"کیا ہوا۔ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟" علی نے اس کی محویت کو فوراً" ہی نوٹ کیا۔

"کچھ نہیں سوچ رہی ہوں کہ آج گنگا الٹی کیوں بہہ رہی ہے۔"

"دریا اپنا راستہ بدل بھی تو لیتے ہیں۔" علی کے معنی خیز لہجے پر ماہم کا دل پوری قوت سے دھڑکا۔ اس کی بھوک اچانک ہی اڑ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دریا اتنی آسانی سے بھی راستہ بدل سکتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"اماں! جاجی کا بچہ اب یہاں کیوں آیا ہے؟" سکینہ کا موڈ آج صبح ہی سے خراب تھا۔ ابے کے ساتھ ڈھیروں گنے' مولیاں اور شلجم لیے اندر آتا جاجی سکینہ کا سارا سکون غارت کر گیا تھا۔ ابا جیسے ہی ظہر کی نماز پڑھنے گئے۔ وہ جمیلہ مائی پر برس پڑی۔

"ہائے ہائے پتر! مجھ نمانی نوں کی خبر۔" جمیلہ مائی حیران ہوئیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ابے نے تجھے ٹیلی فون پر اس کے آنے کی اطلاع نہ دی ہو۔" سکینہ کو قطعاً" یقین نہیں آیا۔

"اے لو۔۔۔!" جمیلہ مائی نے ناک پر انگلی رکھ کر اپنی لاڈلی بیٹی کا خفا خفا سا چہرہ دیکھا۔ "بھلا سکینہ میں نے کیا تجھ سے پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے' جواب بولوں گی۔"

"کچھ نہ کچھ تو تجھے ابے نے بتایا ہی ہو گا نا۔" سکینہ کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی تھی۔

"جاجی کے آنے کا تو نہیں بتایا' ہاں اتنا ضرور بتایا تھا کہ جاجی نے منگنی سے انکار کر دیا ہے۔" جمیلہ مائی نے کمرے میں دھماکا ہی تو کیا تھا۔

"دیکھا' میری چھٹی حس ٹھیک کہتی تھی' شوخا ابویں نہیں یہ سارے کھیت اجاڑ کر یہاں لے آیا۔" سکینہ کو ایک دم ہی اشتعال آیا۔

"غصہ نہیں کرتے میری دھی رانی! یہ چیزیں تو تیرا ابا لے کے آیا ہے۔" جمیلہ مائی نے اپنی بیٹی کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

"ابے کے کون سے مربعے ہیں۔" وہ بری طرح چڑی۔ "ساری زندگی تو ابے نے مٹی کے پانڈے ہی بنائے اور بیچے ہیں۔ یہ کھیتی باڑی تو جاجی کا ابا کرتا تھا۔" سکینہ کو پتا تھا کہ یہ ساری چیزیں اعجاز سوغات کے طور پر لایا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"چل چھڈ' میری دھی! غصہ نہیں کرتے۔" جمیلہ مائی نے اسے پچکارا۔

"اماں! ایک بات کان کھول کے سن لے۔ تجھے جاجی کی بے بے کی باتیں بھول سکتی ہیں' مجھے نہیں۔" سکینہ نے برا سا منہ بنا کر جمیلہ مائی کو یاد دہانی کروائی تو وہ پھیکے سے انداز سے مسکرا دی۔

"پتر! کڑوی کسیلی باتوں کو صبر کے گھونٹ کے ساتھ نگلنا ہی پڑتا ہے ورنہ یہ حلق کو بدمزہ کر کے کسی بھی چیز کا سواد لینے نہیں دیتیں۔" اماں نے نصیحت کی۔

"اماں! مجھے ہی ان کڑوی باتوں کے سواد آسکتے ہیں' مجھے نہیں۔" سکینہ نے ناک چڑھا کر کہا اور خود جگ سے پانی ڈال کر پینے لگی۔ اس کا مزاج اچھا خاصا برہم تھا۔

"اچھا اچھا' اب زیادہ اوکھی نہ ہو' مجھے نماز پڑھنے دے' عصر کا ویلا نکلتا جارہا ہے۔" جمیلہ مائی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اٹھی اور وضو کے لیے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ سکینہ نے تھوڑا سا اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ سامنے لان میں ایک اداس سی شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔

"میری دھی رانی ٹھیک ہے نا۔" اللہ دتا کمہار ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ سکینہ اپنے ابے کو دیکھ کر مسکرائی۔ اللہ دتے نے اپنی گلابی پلاسٹک کی ٹوکری میں سے کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک خوب صورت سی صراحی نکالی۔

"یہ دیکھ میں اپنی دھی رانی کے لیے خصوصی طور پر بنا کر لایا ہوں۔" اللہ دتا نے ایک نفیس سی پانی والی صراحی سکینہ کی طرف بڑھائی۔

"واہ ابا! یہ تو بہت پیاری ہے۔" ایک بے ساختہ سی خوشی سکینہ کے چہرے پر چھلکی۔ وہ صراحی پر بنے نقش و نگار کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ ابا اس کی حیرانی پر بڑی متانت کے ساتھ مسکرایا۔

"دیکھ لینا میری دھی بھی ان شاء اللہ آپریشن کے بعد ایسی ہی پیاری ہو جائے گی۔" اللہ دتا نے اسے امید کا ایک چراغ پکڑایا۔

"اور اگر ابا! میں ایسی نہ ہوئی تو۔" سکینہ نے ایک اندیشے کے تحت پوچھا۔

"تو کیا ہوا' میری دھی تو ویسے ہی میری اکھیوں کا چانن ہے اور مجھے تو جیسی بھی ہو اچھی ہی لگتی ہے۔" اللہ دتا کمہار بالکل اس کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں ابا' اپنا پانڈا (برتن) تو ہر کمہار کو ہی اچھا لگتا ہے۔" سکینہ کے لہجے کی شرارت نے اللہ دتے کے دل میں کئی پھول کھلا دیے۔

"بس پتری! سمجھ کہ یہ دنیا بھی کسی کمہار کا ہی گھر ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو بہت محبت سے تخلیق کرتا ہے اور اسے پھر زمین پر بھیج دیتا ہے۔ اس کے بنائے سارے ہی پانڈے چاہے جتنے بھی ٹیڑھے میڑھے' بدشکلے یا بے ڈھنگے ہوں۔ اس ذات کو ہر ایک ہی سے پیار ہے۔ انسان تو اس کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔" اللہ دتا نے ہمیشہ کی طرح اپنی لاڈو کو آج بھی ایک ہی سبق پڑھایا تھا۔

"ہاں ابا! انسان تو اپنا ایک جوڑ تک نہیں بنا سکتا' لیکن اللہ کی بنائی ہوئی شکلوں میں کھڑے کھڑے ایک سو ایک نقص نکال دیتا ہے۔" سکینہ نے افسردگی سے کہا۔

"نا سمجھ ہے نا' غور نہیں کرتا' اس لیے گھاٹے کے سودے خود خرید کر گھر لے آتا ہے۔" اللہ دتا اپنی بیٹی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا ابا! یہ بتا کہ کتنے دن کے لیے آیا ہے۔" سکینہ نے صراحی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس اب تو میں اپنی دھی رانی کے آپریشن کے بعد ہی جاؤں گا۔" اس نے فورا ہی اپنا پروگرام بتایا تو سکینہ بھی مطمئن ہو گئی۔

وہ ابھی بھی صراحی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے صراحی کو سائیڈ میز پر رکھا۔ اچانک اس کی کہنی پاس ہی رکھے شیشے کے گلاس سے ٹکرائی اور گلاس صراحی کو ساتھ لیتا ہوا جو فرش پر گرا تو کرچیاں دور دور تک پھیل گئیں۔

سکینہ کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ اس نے سخت صدمے اور رنج سے فرش پر بکھری صراحی کو دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ ایک لمحے کو تو اللہ دتا کی بھی قوت گویائی سلب ہو کے رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں ٹیلی فون کی تیز گھنٹی کی آواز سے عائشہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے وال کلاک پر ٹائم دیکھا تو شام کے چار بج رہے تھے۔ انتہائی سستی اور کاہلی سے اس نے پی ٹی سی ایل فون کا ریسیور اٹھایا۔

"تم اپنا سیل فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہی ہو۔" دوسری جانب ماہم کی تیز آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"یار! گھنٹی کی آواز بند کر رکھی تھی' سو رہی تھی میں۔" عائشہ نے جمائی لیتے ہوئے بے زاری سے جواب دیا۔ وہ ابھی مزید سونا چاہتی تھی۔ کافی دن کے بعد ہی تو اسے آج کھل کر نیند آئی تھی۔

"ہاں' ظاہر ہے کہ اتنے اچھے پروپوزل کے بعد انسان کو ایسی ہی پرسکون نیند آتی ہے۔" ماہم کے طنزیہ لہجے پر اس کی آنکھیں مکمل طور پر کھلیں۔ "کون سا پروپوزل؟"

"جواب یہ بھی میں ہی بتاؤں۔" ماہم کی کاٹ دار ہنسی نے عائشہ کی ساری نیند بھک کر کے اڑا دی۔

"ظاہر ہے جب تم مجھے بتاؤ گی تو میں تم ہی سے پوچھوں گی۔" عائشہ کو اس کا طرز تخاطب بالکل اچھا نہیں لگا۔

"یار! تم واقعی اتنی معصوم اور بھولی ہو یا بس ایکٹنگ کرتی ہو۔ اگر ایکٹنگ کرتی ہو تو قسم سے لاجواب کرتی ہو۔ آسکر ایوارڈ کے لیے تمہارا نام واقعی بنتا ہے۔" ماہم کے لہجے کی چبھن وہ آرام سے محسوس کر سکتی تھی۔

"میں نے تو ثمن آپی سے کہہ دیا ہے کہ اب تو آپ کو احیان کی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔ عائشہ تو پیدائشی مدر ٹریسا ہے' اس لیے بے فکر ہو جائیں۔" ماہم کا لہجہ سلگ رہا تھا۔ جبکہ عائشہ اس کی کوئی بھی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔" اس نے ماہم کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"میرے چاہنے یا نہ چاہنے کو چھوڑو' تم یہ بتاؤ کہ اگر انصر بھائی ہی سے شادی کرنا تھی تو پہلے بتا دیتیں' آپی خود بخود ہی تمہارے حق میں دست بردار ہو جاتیں۔" ماہم کی بات سن کر عائشہ کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

"واٹ۔۔۔ تمہارا دماغ ٹھیک ہے ماہم؟" عائشہ کو اپنے سارے جسم کا خون ابلتا ہوا محسوس ہوا۔

"میرا دماغ تو ٹھیک ہے تم پہلی فرصت میں اپنا چیک اپ کرواؤ۔۔۔" ماہم نے دوبدو جواب دیا۔ "تم کیا سمجھ رہی تھیں' تم مجھے انصر بھائی کے پروپوزل کا نہیں بتاؤ گی تو مجھے کیا پتا ہی نہیں چلے گا۔" ماہم بولی نہیں بلکہ چیخی تھی۔

"ماہم! فضول باتیں مت کرو اور تمہیں انصر بھائی سے اب کیوں دلچسپی ہے۔ تمہاری بہن تو انہیں چھوڑ چکی ہے۔" عائشہ نے بمشکل غصہ ضبط کر کے طنزا" پوچھا۔

"میری دلچسپی کو چھوڑو' اپنی بات کرو۔ تمہاری ماما نے سوچا ہو گا کہ عائشہ رحیم کو کوئی اور اچھا پروپوزل تو ملے گا نہیں تو چلو ان کا بھانجا ہی سہی۔" ماہم نے اس کے سر پر بم ہی تو پھوڑا تھا۔ کئی لمحوں تک تو عائشہ بول ہی نہیں سکی اور جب بات اسے سمجھ میں آئی تو فورا" ہی ریسیور کریڈل پر پٹخا اور ننگے پاؤں کمرے سے نکلی۔ ماما اور موحد بھائی دونوں شام کی چائے لان میں اکٹھے پیتے تھے۔ اس وقت بھی وہیں تھے۔

"ماما! یہ خالہ کو کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی باتیں کیوں کر رہی ہیں وہ؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر انتہائی غصے سے بولی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خالہ کے کل کے ہنگامی دورے کا کیا مقصد تھا۔

"کیوں' کیا ہوا؟" ماما کے چہرے کی اڑتی رنگت نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

عائشہ کو یقین دلایا کہ بات میں کوئی نہ کوئی سچائی ضرور ہے۔

"خالہ کل کیا کرنے آئی تھیں۔" موحد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا جو سونے کے بعد منہ ہاتھ دھوئے بغیر ہی ننگے پاؤں یہاں موجود تھی۔

"کچھ نہیں' وہ تو ویسے ہی آئی تھیں' ہوا کیا ہے۔" ماما بوکھلاہٹ کا شکار ہوئیں۔

"ان کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ انصر بھائی کے لیے میرا پروپوزل لائیں۔" عائشہ کا شدید اشتعال کی وجہ سے سانس تیز ہوا۔ موحد کو بھی اس بات سے کرنٹ لگا۔ وہ حیرت سے ماما کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ خود بھی اس واقعے سے اتنا ہی لاعلم تھا جتنی عائشہ۔

"ارے بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں' انہوں نے سرسری سا ذکر کیا تھا' میں نے اسی وقت منع کردیا۔" ماما نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ مگر اس کے بعد انہوں نے پورے خاندان میں یہ بات پھیلا دی کہ وہ میرے اور انصر بھائی کے رشتے کی بات کرکے آئی ہیں۔" غصے سے عائشہ کے چہرے کا رنگ سرخ ہوا۔

"خالہ کا دماغ ٹھیک ہے۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔" موحد نے فوراً ہی اپنا سیل فون نکالا۔

"کچھ نہیں ہے ایسا موحد! فون بند کرو۔" ماما کے لہجے میں سختی در آئی۔

"کیوں۔ انہوں نے بلا سوچے سمجھے ایسی حرکت کیوں کی؟" موحد بھی فوراً ہی ہتھے سے اکھڑا۔

"تم دونوں نے کیا تماشا بنا رکھا ہے۔ جب میں کہہ رہی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں تو پھر۔" ماما تھوڑا سا بلند آواز میں بولیں۔

"تو آپ کے خیال میں عائشہ نے کوئی خواب دیکھا ہے؟" موحد کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" ماما اب عائشہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ماہم نے۔" غصہ اور ناراضی عائشہ کے لہجے اور آنکھوں سے امڈ رہی تھی۔

"ماہم نے۔؟" ماما کو دھچکا سا لگا۔ "ان کے گھر تک یہ بات کیسے پہنچی۔"

"انہوں نے آپ کے ڈرائنگ روم میں خفیہ کیمرے نصب کروا رکھے ہیں۔" موحد نے ایک دفعہ پھر طنز کیا۔

"یہ تو بہت غلط کیا آپا نے۔" ماما کو حقیقتاً "صدمہ پہنچا۔

"انہوں نے غلط کیا یا صحیح کیا۔ آپ اپنی زبان میں ان کو بتا دیں کہ جہاں جہاں استعمار لگا کر آئی ہیں' وہاں وہاں پہلی فرصت میں ہٹا دیں۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

موحد کی آنکھوں سے شعلے ہی تو لپکے تھے۔ وہ اب اپنی وہیل چیئر کے پہیوں پر تیز تیز ہاتھ مارتا ہوا اندر جا رہا تھا۔ جبکہ عائشہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ماہم اور ثمن آپی کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔

☆ ☆ ☆

"بہت تیز اور شاطر نکلی تمہاری یہ عائشہ۔" ثمن آپی نے نیل پالش لگاتے ہوئے ماہم کو مخاطب کیا۔ جو دو کھیرے کے ٹکڑے آنکھوں پر رکھے بڑے آرام اور سکون سے لیٹی ہوئی تھی۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے دونوں بہنیں گھر پر تھیں۔

"میں تو بہت معصوم' بھولی اور بے وقوف سی لڑکی سمجھتی تھی اسے۔"

"آج کے دور میں کوئی بھی معصوم اور بھولا نہیں ہوتا آپی۔" ماہم نے صوفے پر لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"ہاں۔ لیکن اب اتنا بھی رشتوں کا کال نہیں پڑا کہ انکل رحیم اپنی بیٹی کو کسی دوسری شادی والے کے پلے باندھ دیں۔" ثمن آپی کو ابھی تک یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"خیر عائشہ کے لیے تو واقعی ہی کال پڑا ہوا ہے۔" ماہم طنزاً ہنسی۔ "ایک تو شکل و صورت اللہ نے ایسی دی ہے۔ اوپر سے اس نے خدمت خلق کر کر کے اپنا بیڑا غرق کرلیا ہے۔"

"ویسے تم نے شام میں اچھی کلاس لی اس کی؟" ثمن آپی کو اچانک ہی یاد آیا۔

"ہاں ناں۔ میرے سامنے ایکٹنگ کر رہی تھی کہ جیسے اسے پتا ہی نہ ہو۔" ماہم نے برا سا منہ بنایا۔

"ہو سکتا ہے نہ بتایا ہو۔ انصر کے گھر کی ملازمہ کہہ تو رہی تھی کہ کل ہی بڑی بی بی ان کے ہاں بات کرکے آئی ہیں۔" ثمن آپی نے سلیقے سے کیوٹکس کا پہلا کوٹ لگایا۔

"آپ نے بھی ہر جگہ اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں۔" ماہم کو ہنسی آئی۔

"بھئی لاعلمی میں مارے جانے سے بہتر ہے کہ انسان اپنا بچاؤ پہلے ہی کرلے۔ کم از کم اپنے قاتل کا نام تو پتا ہو۔" ثمن کا موڈ بھی آج خاصا خوش گوار تھا۔

"عائشہ کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔ اس میں اتنا دم خم نہیں۔" ماہم نے لاپروائی سے اطلاع دی۔

"کبھی کبھی انتہائی بے ضرر نظر آنے والے لوگ ایسا وار کرتے ہیں کہ انسان کو حیران ہونے کا بھی موقع نہیں ملتا۔" ثمن آپی سنجیدہ ہوئیں۔

"عائشہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ کسی پر وار کرنا تو دور کی بات' وہ اپنا بچاؤ کرلے' یہی بہت ہے۔" ماہم کو اس کی فطرت کا بخوبی اندازہ تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کی ماما انصر کا پروپوزل قبول کرلیں گی۔" ثمن آپی کو ایک نئی فکر نے گھیرا۔

"اس کی ماما کا تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن ان کے گھر میں جو ہٹلر موجود ہے۔ وہ ہرگز نہیں کرے گا۔" ماہم اب اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہٹلر۔" ثمن آپی نے حیرت سے ماہم کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

"موحد کی بات کر رہی ہوں۔ وہ کسی ہٹلر سے کم تو نہیں۔" ماہم نے لیموں کا ٹکڑا اپنے ناخنوں پر ملتے ہوئے شوخی سے کہا تو ثمن آپی کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"اسے اللہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔" ثمن آپی نے نیل پالش کی شیشی کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"اب پہلے جیسے حالات بھی تو نہیں' کسی زمانے میں لڑکیوں کے دل اس کی آہٹ پر دھڑکتے تھے۔ کسی فاتح جرنیل کی طرح گھومتا تھا اب تو۔" ماہم کو یاد آیا۔

"ہاں اب وہی لڑکیاں اس کی وہیل چیئر کے پہیوں کی آواز سنتے ہی بھاگ جاتی ہوں گی۔" ثمن آپی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں اس لائن میں سب سے آگے بھاگنے والی تو میں ہی تھی۔" ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔

"تم نے تو واقعی میرا تھن ریس جیتی ہے۔ بھئی مان گئی تمہیں۔"

ثمن آپی نے کھلے دل سے اپنی چھوٹی بہن کو سراہا۔ جو کم از کم ذہانت میں ان سے چار ہاتھ آگے تھی۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں سوچ بچار کرکے اور نفع و نقصان دیکھ کر ہی سودا کرنے کی قائل تھی۔ ان کی طرح صرف جذبات کی رو میں بہنے کا ہنر اسے نہیں آتا تھا۔ انہیں تو انصر سے پہلی نظر کی محبت نے ہی چاروں شانے چت کردیا تھا مگر انصر کی بدقسمتی کہ اس محبت کی عمر خاصی مختصر تھی۔

☆ ☆ ☆

"بس اتنی سی محبت تھی اسے مجھ سے۔" موحد نے کیلنڈر کو دیکھتے ہوئے رنجیدگی سے سوچا۔ اسے ثنائلہ سے بات کیے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ نہ تو اس نے کال کی اور نہ ہی موحد کی اتنی ہمت ہو سکی کہ اس سے بات کرسکے۔

"واہ ثنائلہ واہ! کہاں گئے تمہارے سکندر شاہ کے ساتھ طوفانی محبت کے دعوے۔ سب ہلکی سی بدگمانی میں بہہ گئے۔" موحد کا دل کرب و رنج کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے آسمان پر موجود تنہا چاند کو دیکھنے لگا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔

"کال تو دور کی بات' تم نے تو ایک ٹیکسٹ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔" موحد نے اپنے دل میں اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے گلہ کیا۔ آج نہ جانے کیوں اس دشمن جاں کی یاد بار بار آئے جارہی تھی۔ موحد نے اپنا سیل فون نکالا اور اس کا نمبر اپنی کانٹیکٹ لسٹ میں سے نکالا۔ اسی لمحے ثنائلہ کا نمبر ابھرا۔ موحد نے سخت بے یقینی سے اپنے ہاتھ میں موجود سیل فون کی اسکرین کو دیکھا۔ حقیقتاً" ثنائلہ کی کال آرہی تھی۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے آدھی بیل پر فون اٹینڈ کرہی لیا۔

"جب یاد کررہے تھے تو کال کرنے میں کیا مضائقہ تھا۔ بہت انا ہے نا آپ میں۔" دوسری جانب ثنائلہ کے محبت بھرے لہجے نے موحد کو زندگی کی حرارت بخشی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں تمہیں یاد کررہا تھا۔" موحد نے بے تابی سے پوچھا۔

"میرے دل نے اور آپ کو پتا ہے کہ آپ کے معاملے میں میرا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔" وہ ہنسی۔ "ویسے جس تیزی سے فون اٹینڈ کیا۔ وہ بتانے کے لیے کافی ہے۔" ثنائلہ آج بھی یقین کی سب سے اونچی سیڑھی پر کھڑی تھی۔ موحد ایک لمحے کو پسپا ہوا۔

"جن سے محبت کی جائے۔ ان کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے؟" ایک شکوہ بے اختیار ہی موحد کے لبوں پر مچلا۔

"کیا محبت پر سارے ہی اختیار آپ کے ہیں۔ میرا کوئی حق نہیں۔" ثنائلہ کا لہجہ نم ہوا اور دوسری جانب موحد کو یہ نمی اپنے دل پر گرتی محسوس ہوئی۔

"اگر ایک بھی آنسو آنکھ سے نکالا تو میں جان نکال دوں گا۔" موحد کی محبت بھری دھمکی پر ثنائلہ نے فوراً" ہی اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"پتا ہے پچھلے ایک ہفتے میں، میں نے کتنی دفعہ اپنا سیل فون نکالا۔ ان باکس چیک کرتی تھی کہ شاید کوئی ایسا میسج آیا ہو۔ لیکن آپ نے تو شاید قسم کھالی تھی، ہے نا۔۔۔" ثنائلہ نے بھی کھل کر گلہ کیا۔

"تم نے تو شاید ایک گھنٹے میں اپنا سیل زیادہ سے زیادہ دس دفعہ چیک کیا ہو۔ لیکن یہاں تو آنکھیں ہی اس اسکرین پر چپکی ہوئی تھیں۔ ہر گھنٹی پر دل دھڑکتا تھا۔ ہر کال پر تمہارا گماں ہوتا تھا۔ آفس میں ہر وزیٹر کی اطلاع پر ایسے لگتا تھا کہ تم آئی ہو۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ میں نے تمہاری محبت کو خون کے ساتھ اپنی شریانوں میں گھومتا ہوا محسوس کیا ہے۔ مجھے پہلی دفعہ پتا چلا کہ میری ہر سوچ اور میرے ہر احساس پر تم قابض ہو چکی ہو۔" موحد نے آج پہلی دفعہ کھل کر اعتراف کیا۔

"مجھے لگ رہا ہے جیسے میری سماعتیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔" دوسری جانب ثنائلہ بے یقین ہوئی۔

"دھوکا تو مجھے میرے دل نے دیا ہے۔" موحد کی بات پر وہ چونکی۔

"میں سمجھتا تھا کہ میرے دل میں وسعت نہیں۔ وہاں ایک محبت کے بعد دوسری کی گنجائش کبھی نکلے گی ہی نہیں۔ لیکن میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ بعض لوگوں کی محبتیں تو سیلاب کی طرح زور آور ہوتی ہیں۔ اپنا راستہ خود بناتی چلی جاتی ہیں۔" وہ جیسے نیند کے زیر اثر بول رہا تھا۔

"پہلی محبت کس سے کی تھی موحد؟" ثنائلہ کی ساری ہی حسیں بیدار ہوئیں۔

"کیا کروگی پوچھ کر۔" موحد رنجیدہ ہوا۔

"بتائیں نا۔" ثنائلہ نے اصرار کیا۔

"اس محبت کے سارے نقش میں اپنے دل سے دھو چکا ہوں۔ اب دل کی سرزمین پر بس تمہاری، بس تمہاری ہی حکمرانی ہے۔ اب تم جو چاہو۔ سلوک کرو، میں نے ہار مان لی ہے۔" موحد کو نہ جانے آج کیا ہو گیا تھا۔

"بتاؤ نا موحد! مجھ سے پہلے کس نے اس میرزمین پر راج کیا ہے۔" ثنائلہ کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں اس چیز سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" موحد نے بڑی روانی سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" ثنائلہ نے برجستہ انداز میں جواب دیا تو وہ ہنس دیا۔

"پھر چھوڑو اس بات کو، رات گئی سو بات گئی۔"

"لیکن آپ نے اگر ذکر کر ہی دیا ہے تو پھر نام بتانے میں تو کوئی ہرج نہیں میں کون سا اسے جانتی ہوں گی۔" ثنائلہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"تم جانتی ہو اسے۔" موحد کی بات نے اسے حیران کیا تو وہ بے تاب ہوئی۔ "کیا واقعی؟ کیا نام ہے اس کا؟"

"ماہم منصور۔" دوسری طرف سے فوراً" ہی جواب آیا۔ ثنائلہ کے سر پر تو گویا چھت ہی آن گری۔ اسے لگا کہ کسی طاقت نے اس کا دل اپنی مٹھیوں میں پکڑ کر بڑے طریقے سے جکڑ دیا ہے۔ اسے بہت زور سے دھکا لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

عائشہ کو آج پارک کے اسی مخصوص کونے میں آکر اپنا کام کرتے ہوئے تیسرا دن تھا۔ وہ پچھلے دو دن سے بے چینی سے علی کی منتظر تھی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ وہ صبح بلاناغہ جوگنگ کرنے کے خبط میں مبتلا ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اپنی یہ عادت چھوڑ دی ہو۔ لیکن یہ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنا جاگنگ ٹریک بدل لیا ہو۔ وہ اس امید کے ساتھ آج کل وہاں آرہی تھی کہ شاید اس سے سامنا ہو جائے۔ وہ اس سے بہت سی باتوں کو کلیئر کرنا چاہتی تھی۔

انار کے درخت کے نیچے اپنا کینوس رکھے، وہ بظاہر اپنے کام میں مصروف تھی لیکن اس کی نگاہیں سامنے جاگنگ ٹریک پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنا کام کرتے کرتے وہ وقتاً" فوقتاً" سامنے بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔ وہاں وہی مخصوص چہرے نظر آرہے تھے جو کئی مہینوں سے باقاعدہ اسے نظر آتے تھے۔ ان چہروں میں وہی ایک چہرہ غائب تھا، جو کبھی اسے اکثر وہاں نظر آتا تھا۔ اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور بے زاری سے اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

"مجھے رامس کو فون کر کے پوچھنا چاہیے۔" ابھی ابھی اس کے ذہن میں خیال آیا۔

"لیکن وہ کیا سوچے گا کہ میں کیوں اس کے بھائی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

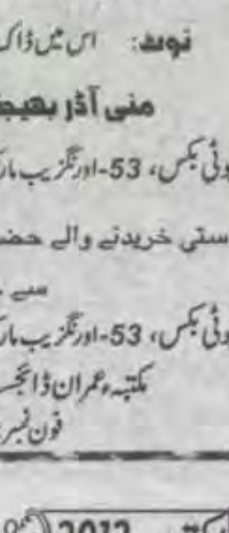

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت =/100 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/100 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- =/250 روپے

3 بوتلوں کے لئے ---------- =/350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" دماغ نے فوراً" ہی اسے عمل درآمد کرنے سے روکا۔

"پوچھتا ہے تو پوچھتا رہے۔ صرف وہی میری مدد کرسکتا ہے۔" ایک اور سوچ نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا۔

"ہوش کے ناخن لو عائشہ! کیا ہوگیا ہے تمہیں۔" دماغ نے بروقت ہی اس کی کھنچائی کی تو اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ اچانک ہی اس کی نگاہ سفید ٹریک سوٹ میں ملبوس شخص پر پڑی۔ وہ اس کے سامنے والے ٹریک پر ہی بھاگتا آرہا تھا۔ عائشہ کے دل کی دھڑکنوں میں ایک ارتعاش سا برپا ہوا۔ اس کی نظریں مقناطیس کی طرح علی پر جم گئیں۔ وہ اس سے اب چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔

اسی لمحے اس کی نظریں بھی عائشہ سے ٹکرائیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے عائشہ کے دل نے دھڑکنے سے انکار کردیا۔ علی نے صرف ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی تھی لیکن اس ایک نگاہ میں اس قدر اجنبیت اور رکھائی تھی کہ عائشہ کو اپنے پیروں سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ایک لمحے کو ساکت ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ اور تیزی سے ٹریک پر بھاگنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ یہ چیز عائشہ کے لیے تکلیف دہ تھی۔ وہ تکلیف کے گہرے اثر کے تحت سامنے رکھے بنچ پر بیٹھ گئی۔ ہمیشہ کی طرح آنسو آج بھی آنکھ کی منڈیر پار کرکے اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔ اسے وہاں بیٹھے ہوئے پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ آسمان پر موجود بادلوں نے انگڑائی لی اور اگلے ہی چند منٹوں میں جل تھل ہوگیا۔

وہ برستے آسمان کے نیچے اکیلی بیٹھی تھی۔ کینوس پر بنی اس کی ادھوری پینٹنگ کو بارش کی بوندوں نے بالکل خراب کردیا تھا۔ سارے رنگ آپس میں مل کے ایک بھدی سی شکل اختیار کرگئے تھے لیکن اسے پینٹنگ کی کوئی فکر نہیں تھی۔ جو بھدا پن اس کی اپنی زندگی میں آگیا تھا' اس کے بعد کوئی بھی چیز اس کے لیے تکلیف دہ نہیں تھی۔ بہت دقت کے ساتھ وہ گھر تک پہنچی تھی اور ادھر ماما کا پریشانی سے برا حال تھا۔

"کہاں چلی گئی تھیں عائشہ! میں ایک سو ایک دفعہ تمہارے نمبر پر کال کرچکی ہوں۔" ماما کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ماما! میرا فون گاڑی میں پڑا تھا۔ اس لیے مجھے پتا نہیں چلا۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا اور خود واش بیسن کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے کپڑوں پر بارش کی بوندیں اور کیچڑ کے داغ لگے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے چینج کرکے آؤ۔ موحد کو ڈاکٹر کے پاس لے کے جانا ہے۔" ماما کے فکرمند انداز پر وہ ٹھٹکی۔

"کیا ہوا بھائی کو؟"

"رات سے ٹمپریچر میں جل رہا ہے۔ آنکھیں سرخ اور برا حال ہے۔" ماما کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آپ نے انکل ذکی کو کال نہیں کی؟" عائشہ نے اپنے فیملی ڈاکٹر کے بارے میں دریافت کیا۔

"کی تھی' وہ ملک سے باہر ہیں' تم یہ باتیں بعد میں کرلینا۔ پہلے چینج کرکے آؤ۔" ماما نے ناگواری سے اسے ٹوکا تو وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اگلے دس منٹ میں وہ قریبی پرائیوٹ اسپتال میں تھی۔ موحد کی حالت واقعی خاصی خراب تھی۔ اسے فوراً" ہی ایمرجنسی میں داخل کیا گیا تھا۔ عائشہ کافی دیر تک ڈاکٹر کے کہنے پر اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتی رہی۔ اگلے تین گھنٹوں میں جاکر موحد کی حالت کچھ سنبھلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھر جانے کی ضد شروع کردی۔ وہ اب کافی بہتر محسوس کررہا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ موحد کی وہیل چیئر لیے ریسپشن سے باہر نکل رہی تھی۔ جب کسی نے اچانک ہی اسے مخاطب کیا۔

"ارے سکینہ! کیسی ہو؟" موحد کو بڑی بے ساختہ سی خوشی کا احساس ہوا۔ عائشہ بھی بڑے جوش سے سامنے وہیل چیئر پر بیٹھی لڑکی سے مل رہی تھی۔ جس کے چہرے پر شناسائی کی جھلک تھی۔

"ابا! یہ عائشہ باجی ہیں اور یہ ان کے بھائی۔"

سکینہ نے اپنے پاس کھڑے ایک دیہاتی سے بندے سے ان کا تعارف کروایا تو اس نے بڑے پرخلوص انداز سے موحد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کا حال پوچھ رہے تھے۔

"ماما! یہ سکینہ ہے۔ جس کا میں اور بھائی آپ سے ذکر کرتے ہیں۔" عائشہ کی اطلاع پر مسز رحیم نے مسکرا کر اس کا حال پوچھا۔

"میرا اسی مہینے آپریشن ہے۔ آپ لوگ دعا کیجیے گا۔" سکینہ کا پراعتماد انداز عائشہ کے ساتھ ساتھ موحد کو بھی حیران کرگیا۔

"ہاں ضرور سکینہ! آپ کو میرا گفٹ مل گیا تھا نا۔" عائشہ کو اچانک یاد آیا تو سکینہ بری طرح جھینپ سی گئی۔ اس نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔ حالانکہ اس نے وہ تمام چیزیں اماں کے خوف سے سسٹر ماریہ کو دے دی تھیں۔

"ماما! سکینہ کی آواز ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ بہت خوب صورت نعتیں پڑھتی ہے۔" موحد کی اطلاع پر ماما مسکرائیں۔ وہ بارہا اس کا ذکر سن چکی تھیں۔

"اور یہ بھی ڈاکٹر خاور کی پیشنٹ ہیں' جو میرا بھی علاج کررہے ہیں۔"

"اللہ پاک آپ کو بھی زندگی اور صحت سے نوازے۔" اللہ وتا کے پرخلوص انداز سے ماما ایک دم ہی متاثر ہوئیں۔

"ہاں' ہاں بیٹا! جب آپ کا آپریشن ہو تو مجھے بھی بتائیے گا۔ میں بھی دعا کروں گی۔" ماما کے نرم انداز نے موحد کے ساتھ ساتھ عائشہ کو بھی حیران کیا۔

"کیوں نہیں بہن جی! اللہ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان کے حق میں دعا ضرور سنتا ہے۔" اللہ وتا کمہار کا لہجہ اس کے حلیے کے بالکل برعکس تھا۔ اس کے لہجے کا توازن اور متانت اسے لوگوں کے ہجوم میں منفرد بناتی تھی۔

"ہم لوگ یہاں سکینہ کے کچھ ٹیسٹ کروانے آئے تھے۔ اب ہمیں اجازت۔" انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے ان سب سے اجازت چاہی۔ سکینہ نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا کہ آج اس کے ساتھ اماں نہیں تھی۔ ورنہ ان کی موجودگی میں تو وہ عائشہ اور موحد کو مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کرسکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" رامس اس دن اچانک ہی ان کے گھر آگیا اور وہ اسے لان میں بیٹھی ہوئی مل گئی۔ بلیو جینز پر وائٹ ٹی شرٹ پہنے وہ خاصا ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔ عائشہ کو بے ساختہ ہی ماہم پر افسوس ہوا۔ جس نے ایک معمولی سی بات کو جواز بنا کر اچھے خاصے لڑکے کو مسترد کردیا تھا۔

"کیوں میں نے کیا' کیا ہے؟" عائشہ نے بڑی مشکل سے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ اسے اب پتا چلا تھا کہ اس کے انداز میں ایک مانوس سی شباہت کیوں جھلکتی ہے۔ دونوں بھائیوں کی آنکھوں کا رنگ اور قد کاٹھ بالکل ایک جیسا تھا۔ لیکن رامس اپنے بھائی کی نسبت زیادہ اسمارٹ تھا۔

"مجھے محسوس ہوا کہ آپ مجھ سے چھپتی پھر رہی ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شرارت سے بولا۔

"کیوں' میں نے کون سا تمہارا قرض دینا ہے جو تم سے بھاگتی پھروں۔" اس نے کپ میں موجود چائے کا آخری گھونٹ لیا۔

"یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا کہ کون سا قرض دینا ہے۔ ویسے آپ جیسی بے مروت لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" وہ سامنے والی کرسی سنبھال چکا تھا۔ عائشہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ماما! اتنی زیادہ بیمار ہیں' ہم دونوں بھائی گھن چکر بنے رہے۔ آپ کو بتایا بھی تھا مگر مجال ہے کہ آپ نے ایک کال کرکے بھی پوچھا ہو۔" اس کے شکوے پر عائشہ ایک دم شرمندہ ہوئی۔

"آئی ایم سوری! یہ واقعی میری غلطی ہے۔" اس نے فوراً" ہی اعتراف کیا۔ "اب کیسی ہیں وہ؟"

"اب تو ماشاء اللہ کافی بہتر ہیں۔" وہ مسکرایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"لیکن میں نے تو انہیں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ فوراً" بھائی کی شادی کریں یا پھر میرے بارے میں سوچیں۔ گھر کو ایک اور خاتون کی اشد ضرورت ہے۔" اس کی بات پر عائشہ کے دل کی دھڑکن بے ربط ہوئی۔

"چائے لوگے یا کافی۔" عائشہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔

"چائے کے ساتھ ساتھ گھر میں جو کچھ بھی کھانے کو ہے' منگوالیں۔ بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔" رامس کی بے تکلفی آج اسے قطعاً" بری نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے ملازمہ کو چائے لانے کو کہا اور خود اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آج تو بتادیں کہ آپ اس دن اتنا زیادہ کیوں روئی تھیں۔" رامس نے اسے چھیڑا۔

"کس دن؟" وہ بھی انجان بنی۔

"اسی دن جب میرے گھر کے سامنے آپ نے دریا بہادیے تھے۔" اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

عائشہ کے منہ بنانے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"آج ایک بات تو آپ لکھ لیں کہ آخر میں کام آپ کے میں ہی آؤں گا۔ اس لیے جو بھی بات ہے سچ سچ بتادیں۔" رامس کی شرارت پر عائشہ کا دل دھڑکا۔ اس نے بے ساختہ ہی نظریں چرائیں۔

"مجھے چھوڑو' یہ بتاؤ کہ تم کن چکروں میں ہو آج کل۔" عائشہ نے فوراً" ہی بات بدلنے کی غرض سے پوچھا۔

"میں تو آج کل بہت اچھے' خوب صورت اور نازک سے چکر میں آیا ہوں۔ دعا کیجیے گا کہ پھر کہیں گھن چکر نہ بن جاؤں۔" اس نے سامنے لان میں بے فکری سے گھومتے ہوئے خوب صورت مور کو دیکھا۔

"نہیں اس دفعہ ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔" عائشہ کے چہرے پر ایک پرخلوص سی مسکراہٹ ابھری تو رامس کھلے دل سے مسکرادیا۔

"کہاں ہوتی ہیں وہ آپ کی میڈم باوری صاحبہ۔" رامس کا اشارہ وہ فوراً" سمجھ گئی۔

"مجھے کوئی علم نہیں' کافی دنوں سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہوا۔" عائشہ نے صاف گوئی سے بتایا تو وہ کے بولا۔ "آج کل پھر کسی بے چارے کی شامت ہوگی۔"

"اب بے چارے خود اپنی شامت کو دعوت دیں بندہ کیا کرے۔" عائشہ نے ہنستے ہوئے طنز کیا۔

"بات تو سچ ہے۔ مگر بات ہے رسوائی کی۔" وہ کان کھجاتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"اب خاموشی اور سکون کے ساتھ چائے پیو۔" عائشہ نے اس کے سامنے رکھی چائے کی طرف اشارہ کیا تو وہ فوراً" ہی متوجہ ہوا۔ "یہ آپ نے بہت نیک کام کیا ہے۔ اللہ آپ کو کوئی ہینڈسم سا شوہر دے۔"

"مجھے یہ ہینڈسم اور ڈیشنگ پرسنالٹی کا کوئی کر نہیں۔ بس جو بھی ہو بندے کا پتر ہو۔" عائشہ کی بات وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں شرارت کے رنگ اترے۔

"ایسا شخص تو پھر دنیا میں ایک ہی ہے۔" وہ اپنی پلیٹ میں کباب نکالتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"وہ کون؟" عائشہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میرا بھائی۔۔۔" لاپروائی سے کہتے ہوئے عائشہ کا سارا سکون غارت کرگیا۔ اس نے جانچتی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے رامس کو دیکھا' جو بے دھیانی میں بات کرکے اب مکمل دھیان اور توجہ سے چکن روسٹ کھانے میں مشغول ہوگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پرائیوٹ اسپتال کا ایک کمرا تھا۔ جہاں رامس اور علی کی والدہ کو رات کو ایڈمٹ کیا گیا تھا۔ رات ان کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں یہاں لایا گیا تھا۔ دونوں بھائیوں کے چہروں پر فکر اور تشویش کے سائے نمایاں تھے۔ وہ دونوں ایک پل کو نہیں سو پائے۔ ماما کی دن بدن گرتی حالت نے ان کے ہاتھ پاؤں پھلا رکھے تھے۔ ان کا ہائی بلڈ پریشر اور شوگر پچھلے ایک ہفتے سے کنٹرول میں نہیں آرہے تھے۔

"ماما! پلیز' اب ٹھیک ہوجائیں۔" رامس نے انتہائی محبت بھرے انداز سے اپنی والدہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اللہ مجھے ہمت دے تو میں اپنے دونوں بچوں کے گھر اپنے ہاتھوں سے بسا جاؤں۔" انہوں نے حسرت بھرے انداز سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"آپ بس' رامس کے لیے سوچیں۔" اس کے تلخ لہجے پر رامس اور ماما دونوں ہی چونکے۔

"رامس کے لیے ہی کیوں؟" ماما اپنی کہنیوں کے بل بمشکل اٹھ کر بیٹھیں۔ رامس نے فوراً" ہی اٹھ کر انہیں سہارا دیا۔

"اس لیے کہ یہ اپنی زندگی کے لیے ٹارگٹ سیٹ کرچکا ہے۔" اس نے بہت غور سے اپنے چھوٹے بھائی کا حواس باختہ چہرہ دیکھا۔ رامس کے ساتھ اس کی کبھی بھی بے تکلفی نہیں ہوپائی تھی۔ ایک تو ویسے بھی وہ اس سے پورے پانچ سال چھوٹا تھا اور کچھ وہ خود بھی فطرتاً سنجیدہ مزاج اور کم گو تھا۔

"وہ بے چارہ تو تمہارے لیے ٹارگٹ سیٹ کرتا پھر رہا ہے۔" ماما نے ہلکے سے کہا تو وہ چونک اٹھا۔

"میرے لیے؟" ان کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ تینوں ہی چونک گئے۔ رامس نے اٹھ کر بے اختیار دروازہ کھولا۔ سامنے عائشہ کو پھولوں کے گلدستے کے ساتھ کھڑا دیکھ کر خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔

"ماما! عائشہ آئی ہیں آپ کی عیادت کرنے۔" رامس کے منہ سے نکلنے والے فقرے پر علی کو جھٹکا سا لگا۔ جبکہ ماما کے چہرے پر ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ پھیلی۔ وہ دانستہ کھڑکی کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ دل کی دھڑکنوں پر قابو پانا دشوار ہوا۔

"کیسی بہن ہیں آپ میری۔ اب خیال آیا ہے؟" رامس کے استحقاق بھرے لہجے سے زیادہ اس کی بات پر علی کو کرنٹ لگا۔ اس نے بے ساختہ مڑکر اسے دیکھا۔ کاسنی لمبی قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجاما پہنے' دوپٹا سلیقے سے پھیلائے۔ وہ دل کو چھو لینے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

"آنٹی! میرے لیے ایک موحد کیا کم تھا۔ جواب اٹھتے بیٹھتے اس کے بھی لیکچر شروع ہوگئے ہیں۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے گلہ کیا۔ وہ اس کی بات پر ہنسیں۔ جبکہ ان دونوں کی گفتگو علی کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

"بھئی! میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تم بہن بھائیوں کا مسئلہ ہے۔" ماما کے لہجے میں محبت' نرمی اور اپنائیت کے سب ہی رنگ تھے۔

"علی! تم عائشہ سے ملے؟" ماما نے اچانک ہی اسے مخاطب کیا۔ جو بالکل ہکا بکا انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی اور آنکھوں کی چمک اس بات کی گواہ تھی کہ وہ اس ساری صورت حال سے لطف اندوز ہورہی ہے۔

"ماما! میں عائشہ سے پہلی دفعہ تھوڑی مل رہا ہوں۔ بہت عرصے سے جانتا ہوں۔" علی کی بات نے اس دفعہ عائشہ کے چھکے اڑائے۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اسے علی کی طرف سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ جبکہ ماما اور رامس نے بڑی حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا' جواب کھل کر مسکرا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

خالدہ نثار

محبت کی صورت

"میں نمرہ فیاض سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی بات پر انہوں نے کتاب سے نگاہ ہٹا کر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"اچھا؟" ان کا انداز سوالیہ تھا جو اگلے ہی پل طنزیہ ہو گیا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ان کی نظروں کی کاٹ اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

مہکمل ناول

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اور جو پہلی بیوی ہے وہ؟ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟" ان کی بات پر اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔
"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔"
"اچھا!" وہ طنزیہ ہنسے تو وہ پہلو بدل کے رہ گیا۔
"سروکار نہیں یا ہمت و مردانگی نہیں؟" ان کے گہرے طنز پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
"آپ جانتے ہیں' نہ ہمت کی بات ہے' نہ مردانگی کی۔ میرے ہاتھ آپ کی وجہ سے ہی بندھے ہیں۔"
اس کی بات پر انہوں نے ہاتھ میں تھامی کتاب بند کر کے میز پر رکھی۔ پھر آگے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر ہولے سے ہنسے۔
"مرد کے ہاتھ کوئی مجبوری نہیں باندھ سکتی۔"
وہ کچھ کہنے لگا تھا۔ مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
"کچھ بھی ہو' ریحا تمہاری بیوی ہے۔ اس کی خبر رکھا کرو۔ سنا ہے' کل بھی تاج ریسٹورنٹ میں کسی جاذب عرف جھنڈی کے ساتھ لنچ کرتی پائی گئی ہے۔"
ان کی بات نے اس کے اندر شعلے بھڑکا دیے۔ وہ جھٹکے سے کرسی سے اٹھا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں آگ کی تپش تھی۔ وہ بھی اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔
"میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم یوں جذباتی ہو جاؤ۔ بلکہ اس لیے بتایا ہے کہ اب تمہیں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟"
انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ایک نظر انہیں دیکھتا جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

بہت کھولتے دماغ کے ساتھ وہ باہر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ذاتی گارڈز مستعد ہو گئے۔ وہ جھٹکے سے بی ایم ڈبلیو کا دروازہ کھولتا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ بھی پیچھے کھڑی سفید کھلی جیپ میں بیٹھ گئے۔ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا وہ شاہان ولا پہنچا تھا۔ وہ اندر آیا تو خاموشی اور سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔
"پانی لے آؤ۔" کچن سے نکل کر سامنے آتی ہوئی صفیہ سے کہتا وہ صوفے میں دھنس گیا۔ وہ پانی لے آئی۔
"بابا آ گئے؟" گلاس ٹرے سے اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"نہیں جی! وہ تو نہیں آئے۔ پر نمرہ بی بی کے دو' تین فون آئے تھے۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں۔"
"کیا میں نے تم سے پوچھا کہ کس کا فون آیا تھا؟" اس کے درشتی سے کہنے پر وہ سٹپٹا گئی۔
"نہیں جی! پر وہ کہہ رہی تھیں۔"
"شٹ اپ۔" اس نے خاصی بلند آواز میں غصے سے کہا تو وہ کانپنے لگی۔ "جتنا پوچھا جائے اتنا ہی بتایا کرو اور یہ کیسے گلاس میں پانی لے آئی ہو؟"
اس نے کانچ کے شفاف گلاس کو ناگواری سے دیکھتے سامنے سفید چمکتی دیوار پر دے مارا۔ کانچ ٹوٹ کر بکھر گیا اور بہتا ہوا پانی قالین میں جذب ہونے لگا۔ وہ صوفے سے اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑا سیل اور گاڑی کی چابی بیڈ پہ پھینک کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔
شاور لے کر اس نے کھولتے دماغ کو پر سکون کرنا چاہا تھا۔ شرٹ کے بغیر بلیک ٹراؤزر پہنے وہ باہر نکلا۔ روم فریج سے اسپیشل مشروب نکال کر وہ بیڈ کے دائیں طرف رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔ دو' تین ویگ پی کر وہ خاموشی سے بیڈ پر آ لیٹا۔

☆ ☆ ☆

وہ جس وقت گھر آئے وہ اپنے روم میں جا چکا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں اے سی کی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بیڈ پر وہ چت لیٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب چلے آئے۔ اس کے سرخ و سفید وجیہہ چہرے پر بجی سبز آنکھیں اس وقت بند

تھیں۔ وہ عالم مدہوشی میں تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے سیاہ بال پیچھے ہٹاتے وہ واپس مڑے تو نظر سامنے میز پر دھری بوتل اور گلاس پر پڑی۔ ان کے اندر ناگواریت کی شدید لہر اٹھی۔ مگر اس کے باپ ہونے کے باوجود وہ اس پر ایسا اختیار نہیں رکھتے تھے کہ اسے یہ زہر اندر انڈیلنے سے منع کر سکتے۔ اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھے۔ اگر روکا جاتا تو وہ ضد میں انتہا کر دیتا۔ انہوں نے اک بے بس نظر اس پر ڈالی اور باہر نکل گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ساڑھے بارہ بجے جب اس کی آنکھ کھلی' چند لمحے کسلمندی سے لیٹے رہنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر دھرا موبائل اٹھایا۔ آفس کے علاوہ نمرہ اور حسن کی بھی مس کالز تھیں۔ اس نے موبائل واپس دھرا اور خود اٹھ گیا۔ طویل شاور لینے سے طبیعت پر چھایا بوجھل پن دور ہوا تھا۔ تولیہ بیڈ پر پھینک کر گیلے بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ نیچے چلا آیا۔ سیڑھیوں پر سے اترتے شاہان کو انہوں نے اک نظر دیکھا اور دوبارہ اخبار کی جانب متوجہ ہو گئے۔ وہ نیچے آ کر اب سینٹرل ٹیبل پر دھرے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل رہا تھا۔ گلاس بھر کے وہ صوفے پر آ بیٹھا۔
"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ اخبار لپیٹ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
"آپ سرفراز صاحب سے بات کر لیں کہ وہ۔۔۔"
"سرفراز صاحب غالباً" تمہارے ماموں ہوتے ہیں۔" وہ بے ساختہ ہی اسے ٹوک بیٹھے۔
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے کندھے جھٹکے۔ "بہرحال آپ ان سے بات کر لیں۔ ان کی بیٹی کی رخصتی کے حوالے سے۔"
صفیہ کی لائی ناشتے کے لوازمات سے سجی ٹرے اپنی طرف کھسکاتے اس نے مغرور و بے نیازانہ انداز میں کہہ کر انہیں ایک بہت بڑی خوش خبری دے دی تھی۔
"کیا کہا تم نے؟" انہیں یقین نہیں آیا۔
جس بات کے لیے وہ پچھلے چار سال سے اس پر زور دے رہے تھے اور وہ مان کے نہیں دے رہا تھا۔ آج وہی بات اس نے خود کہہ دی تھی۔
"میرے خیال میں' میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جو آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ سرفراز صاحب سے رخصتی کی کوئی ڈیٹ لے لیں۔ مگر وہ اسی ماہ کی ہو۔"
اپنی بات مکمل کر کے وہ اب چائے پینے لگا۔ جبکہ ان پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی گاڑی "سرفراز ولا" کے سامنے آ رکی تھی۔ چوکیدار نے پہلے خاصی حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر مستعدی سے گیٹ کھولنے لگا۔ مگر وہ گاڑی اندر لے کر نہیں گیا۔
"کیا مطلب؟" اس کے گاڑی باہر ہی روکنے پر انہوں نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔ "تم اندر نہیں آؤ گے؟"
وہ تلخی سے مسکرایا۔ "میرا نہیں خیال کہ آج اندر میری ضرورت ہے۔"
"ضرورت نہ بھی ہو تو بھی تمہیں اندر چلنا چاہیے۔"
"پر جہاں میری ضرورت نہ ہو' وہاں میں نہیں جاتا نہیں۔ یقین جانیے! جس دن ضرورت ہو گی' ضرور جاؤں گا۔"
اس کی بات پر وہ مزید کچھ کہے بغیر اتر گئے۔ جانتے تھے' وہ اب نہیں جائے گا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے گاڑی واپس موڑ لی۔

☆ ☆ ☆

سفید پینٹ پر سیاہ شرٹ پہنے' کالے بالوں کی اونچی سی پونی بنائے' آنکھوں پر گاگلز ٹکائے اس نے ہلکا سا

WWW.PAKSOCIETY.COM

قہقہہ لگایا۔ ساتھ چلتی ٹوئی کی بھی ہنسی نکل گئی تھی۔
"جازی! تم بھی نا۔" اس نے ہنستے ہوئے جازی کے کندھے پر ہلکا سا پنچ مارا۔ وہ بے چارہ ہاتھ میں تھامے ڈھیروں شاپنگ بیگز کی وجہ سے بس کراہ کر رہ گیا۔ وہ لوگ پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ جاذب نے سیاہ کرولا کا لاک کھول کر بیگ اندر رکھا۔
"اونو۔" اس کے لبوں سے نکلا تو وہ دونوں بھی چونک گئیں۔
"کیا ہوا؟" ریحا کے پوچھنے پر اس نے اپنے سر پر ہلکے سے ہاتھ پھیرا۔ "یار! ممما کے کپڑے تھے ٹیلر کے پاس، جو انہوں نے مجھے لازمی لانے کا کہا تھا۔ میں پانچ منٹ میں لے کے آتا ہوں۔"
وہ واپس مڑا تو وہ دونوں اسے غصے سے گھور کر رہ گئیں۔ وہ کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے شاہان کی نظر اس پر پڑی تھی۔ سیاہ شرٹ کی ہاف سلیوز پہنے وہ بے نیازی سے کھڑی تھی۔ بہت کھولتے دماغ کے ساتھ وہ اس کی طرف بڑھا۔
"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" بنا کسی دوسری بات کے اس نے بہت غصیلے لہجے میں پوچھا تو وہ تنک کر رہ گئی۔
"آپ سے مطلب؟" اس کے یوں کہنے پر شاہان کا دماغ ایک سیکنڈ میں گھوما تھا۔
"میں نے پوچھا تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"
"اور میں نے بھی آپ سے کہا ہے کہ میرے پرسنلز کے متعلق سوال کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔" اس کی بات پر اس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے۔
"مجھ سے زیادہ تمہارے پرسنلز جاننے کا حق کس کے پاس ہے مسز شاہان علی؟"
اس کی بات پر ریحا نے تنفر سے سر جھٹکا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی، جب شاہان اسے چھوڑ کر جاذب کی طرف متوجہ ہوا تھا جو ابھی واپس آیا تھا اور خاصی حیرانی سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم!" اس نے جھٹکے سے جاذب کی شرٹ کا کالر پکڑ کر جھٹکا۔ ریحا ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ پاس کھڑی ٹوئی خاصی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ پارکنگ میں موجود لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔
"آج کے بعد اس لڑکی کے آس پاس دائیں بائیں نظر مت آنا۔ ورنہ۔" وہ ایک لمحہ رکا۔ اس کا لہجہ انتہائی تپش لیے ہوا تھا۔ "اگر صبح نظر آئے تو شام کا اور اگر شام کو نظر آئے تو اگلی صبح کا سورج دیکھنے کی تمنا دل میں مت رکھنا۔"
اس نے جاذب کا کالر ایک جھٹکے سے چھوڑا جو خوف زدہ نظروں سے کبھی اسے اور کبھی پیچھے کھڑے اس کے مسلح گارڈ کو دیکھ رہا تھا۔ آس پاس کھڑے لوگ بھی اپنا کام ادھورا چھوڑے ان کی طرف متوجہ تھے۔ وہ دو قدم واپس چلتا پریشان سی کھڑی ریحا کے مقابل آیا اور پھر کسی کے بھی کچھ سمجھنے سے پہلے اس نے ریحا کی دودھیا کلائی پکڑی اور اسے اپنی گاڑی کی سمت گھسیٹا۔ دروازہ کھول کر اس نے ریحا کو پسنجر سیٹ پر دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اس کے گارڈز بھی جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ گاڑی پارکنگ سے نکال رہا تھا تو وہ جو شاک کے عالم میں بیٹھی تھی۔ تڑپ کر اس کی طرف پلٹی۔
"آپ۔" غصے سے اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔
"بس۔" شاہان نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ اس کے تمام الفاظ اندر ہی رہ گئے تھے۔
"اب ایک لفظ نہیں۔" چبا چبا کر اس نے اتنے سرد سے انداز میں کہا تھا کہ وہ بس پیچ و تاب کھا کے رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان کی بات پر سرفراز علی نے خاصی حیرانی سے ان کی جانب دیکھا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ان کی حیرانی ان کے الفاظ سے بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ جبکہ آسیہ بیگم یعنی

مسز سرفراز علی چہرے پر ناگواری سجائے خاموش بیٹھی تھیں۔
"کیوں ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے۔" انہیں سرفراز علی کی حیرانی پر حیرانی ہوئی۔ "ان دونوں کا نکاح ہوا ہے اب رخصتی تو ہونا ہے۔" انہوں نے سرفراز علی کو یاد دلانے کی کوشش کی۔
"آپ کی بات درست ہے۔ مگر تب وہ بچے تھے۔ اب بڑے ہو چکے ہیں اور۔" سرفراز علی کی بات پر انہیں ایک دم غصہ آیا تھا۔ ان کی بات کاٹ بیٹھے تھے۔
"تو نکاح کرتے وقت تمہیں علم نہیں تھا کہ ایک دن انہیں بڑا بھی ہونا ہے؟" ان کے طنزیہ کہنے پر سرفراز علی جز بز ہوئے۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا بھائی صاحب! تب وقت اور حالات اور تھے۔ تب میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ بیچ میں چودہ سال حائل ہیں اور ان چودہ سالوں میں کیا، کیا ہو چکا ہے۔ وہ اگر میں جانتا ہوں تو لاعلم تو آپ بھی نہیں ہیں۔" سرفراز علی کی بات وہ بے حد خاموشی سے سن رہے تھے۔
"جہاں تک بات ان دونوں کی ہے تو یہ فیصلہ اب ان دونوں کو کرنا ہوگا۔ یہ ان دونوں کی زندگی کا فیصلہ ہے اور ان دونوں کی مرضی سے ہی ہوگا۔" سرفراز علی نے بے بسی سے کہا۔
"میرے بیٹے کی مرضی اس رشتے کو نبھانے میں ہے سرفراز! تب ہی میں یہاں موجود ہوں اور جہاں تک ریحا کی بات ہے تو بھلے وہ بڑی ہو چکی ہے۔ پھر بھی ہے تو تمہاری بیٹی ہی نا۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تو سرفراز علی پہلو بدل کے رہ گئے۔ جبکہ آسیہ بیگم کی پیشانی پہ پڑی شکنیں مزید گہری ہوئی تھیں۔
"بہرحال تم پوچھ لو اس سے۔ پھر دیکھتے ہیں۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر سرفراز علی سے ہاتھ ملا کر وہ باہر نکل آئے۔ جہاں شاہان کا بھیجا ہوا ڈرائیور ان کا منتظر کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

"جاہل گنوار۔ صحیح کہتے ہیں، یہ لوگ جتنا بھی پڑھ لکھ جائیں اندر سے ان پڑھ جاہل ہی رہتے ہیں۔" بہت غصے سے کہتے ہوئے اس نے اپنا چرمی بیگ صوفے پر پھینکا۔ پھر خود بھی صوفے پر گر کر لمبے لمبے سانس لے کر اپنا غصہ کنٹرول کرنے لگی۔
"پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔ جیسے تمام دنیا اس کے باپ کی جاگیر ہی تو ہے۔ ایڈیٹ۔" سیاہ سینڈل سے پاؤں کو آزاد کرواتے وہ اپنی بھڑاس بھی نکال رہی تھی۔
"ہاؤ سویٹ۔" سیڑھیوں سے اترتی نیہا مسکرائی۔ "کتنے پیارے انداز میں میری سویٹ سسٹر میرے پیارے سے دولہا بھائی کو یاد کر رہی ہے۔" وہ ٹیرس سے ریحا کو شاہان کی گاڑی سے اترتا دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ چکی تھی۔ "ویسے ریحا!" اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس ریحا کو دیتے ہوئے ایک نظر اس کے غصیلے چہرے پر ڈالی۔ "آئی ہیو آنیوز فور یو۔" پانی پی کر گلاس ٹیبل پر رکھتی وہ نیہا کی طرف متوجہ ہوئی۔
"اسی جاہل گنوار ایڈیٹ ظالم وغیرہ وغیرہ نے آج اپنے فادر کو ممما پاپا کے پاس بھیجا تھا۔ اس مطالبے کے ساتھ کہ اس کی کیوٹ اور سویٹ سی مسز کو اس کے ساتھ رخصت کیا جائے۔" وہ بہت آرام سے بتاتی ٹی وی آن کر چکی تھی۔
"واٹ؟" وہ اچھل پڑی۔ "اس کی ہمت کیسے ہوئی؟" غصے سے اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا۔
"پلیز سسٹر! تم یہی بات ممما پاپا سے کہو۔ مجھے بور مت کرو۔" نیہا نے ایک پل کو نظر ٹی وی سے ہٹا کر اس کے سرخ چہرے پر ڈالی۔
"ہوں۔" ایک لمبی سی سانس لے کر اس نے خود کو کمپوز کرنا چاہا۔
"ممما اور ڈیڈ کہاں ہیں؟" اس نے نیہا کی طرف دیکھا۔
"انکل شیرازی کی طرف گئے ہیں۔" اس نے چینل تبدیل کرتے ہوئے بتایا۔
"ویسے ریحا!" کچھ دیر کی چینل سرچنگ کے بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے خاموش بیٹھی ریحا کو مخاطب کیا۔ "آئی تھنک! تمہیں مما' پاپا کے بجائے شاہان سے بات کرنی چاہیے۔" وہ اب ریحا کی جانب متوجہ تھی۔

"ناٹ بیڈ آئیڈیا۔" اپنے سینڈل ہاتھ میں تھامے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں پوچھتی ہوں آپ نے اسی وقت انکار کیوں نہیں کیا؟" آسیہ بیگم نے غصے سے کہتے ہوئے سرفراز علی کی جانب دیکھا۔

"ایسے ایک دم کیسے انکار کردیتا۔ وہ لوگ کتنے ہٹ دھرم اور ضدی ہیں' تمہیں علم تو ہے۔" سرفراز علی نے بے بسی سے کہا۔

"تو کیا ہم اپنی بیٹی اس جہنم میں بھیج دیں گے؟" آسیہ بیگم کی بات پر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"وہ میرا بھانجا ہے آسیہ! اس میں حرج بھی کیا ہے۔ اگر ہم۔۔۔"

"واہ سرفراز صاحب! واہ۔۔۔ جب بات آپ کی بہن کی تھی تو حرج تھا اور اب میری بیٹی کی دفعہ کوئی حرج نہیں۔" وہ ان کی بات کاٹ کر غصہ سے بولیں۔ "کیا صرف اچھی شکل اور بے تحاشا دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ انسان کا اخلاق' کردار' اس کی تربیت' ان سب کی کوئی اہمیت نہیں؟"

"وہ اس رشتے کو بنانا چاہتا ہے آسیہ۔" انہوں نے اس کا دفاع کرنا چاہا۔

"اچھا!" آسیہ نے طنز سے انہیں دیکھا۔ "وہ آپ کا بھانجا ہی نہیں' اس گھر کا داماد بھی ہے۔ مگر پچھلے چودہ برسوں میں اس نے ایک بار بھی اس گھر کی دہلیز پار نہ کی اور زبیدہ آپا کے بیٹے کی شادی میں آپ کو دیکھ لینے کے باوجود وہ کیسے مغرور انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھا رہا تھا۔ آپ سے ملنا تک گوارا نہیں کیا تھا اس نے۔ رشتوں کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ رشتہ نبھانا نہیں چاہتا۔ اپنی ضد پوری کرنا چاہتا ہے۔ مان لیجئے سرفراز! وہ جن لوگوں کے ہاتھوں پلا بڑھا ہے۔ جن لوگوں نے اس کی تربیت کی ہے۔ وہ انہی جیسا ہے۔ ضدی' مغرور' انا پرست' ہٹ دھرم اور خود کو خدا سمجھنے والا۔ اور میں ایسے شخص کے ساتھ اپنی بیٹی رخصت کرکے اسے رول نہیں سکتی۔ آپ بھائی صاحب کو انکار کردیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت احسن کے ساتھ اس کے فلیٹ پر تھا۔ باہر گہری ہوتی رات کے باوجود وہ بے حد آرام سے بیٹھا تھا۔ اس کا ارادہ فی الحال شاہان ولا جانے کا نہیں تھا۔

"سچ سچ بتا' تو اسے پسند کرتا ہے؟" احسن کی بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا۔

"لگتا ہے تجھے چڑھ گئی ہے جگر!" اپنی سبز خمار آلود آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑتے اس نے کہا۔ "اسی لیے کہتا ہوں شاہان علی سے مقابلہ لگا کر مت پیا کر۔"

"تو جب تو اسے پسند نہیں کرتا۔ اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس سے نباہ نہیں کرنا چاہتا تو شادی کیوں کررہا ہے؟" اب کی بار احسن نے تھوڑا جھنجلا کر پوچھا تھا۔

"میں کہاں کرنا چاہتا ہوں جگر۔۔۔ شادی تو ہوچکی ہے۔ اور ویسے بھی خوامخواہ کی فکریں اپنے چھوٹے سے دماغ پر سوار مت کریں۔"

اس کی بات پر احسن نے کندھے اچکائے۔ تب ہی اس کا سیل بجنے لگا۔ مگر وہ بے نیاز بنا ہوا تھا۔

"یار! فون اٹھالے۔" احسن نے اس کی توجہ بجتے ہوئے سیل کی طرف دلائی تھی۔

"یہ ٹائم تیرا ہے۔ اس میں سے کچھ پل بھی کسی اور کو دے کر میں خیانت نہیں کرسکتا۔" اس کی بات پر احسن نے قہقہہ لگایا۔

"دیکھ! میں تیری بیوی یا محبوبہ نہیں ہوں' جسے تو ڈائیلاگز سے متاثر کرنا چاہ رہا ہے۔ آنکھ کھول کر اور ہوش و حواس قائم رکھ کے دیکھ۔ میں تیرا دوست ہوں۔"

"تیرا کیا خیال ہے۔ میں اپنے حواسوں میں نہیں؟" اس نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"انداز تو ایسے ہی ہیں۔ اچھا! اب یا تو اسے اٹھالے یا آف کردے۔"

اس نے ایک بار پھر اس کی توجہ سیل کی طرف مبذول کی جو مسلسل بجے جارہا تھا۔ اس نے کوفت سے سیل اٹھا کر آف کرنا چاہا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر آن کرلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کتنی ہی دیر سے اسے کال ملا رہی تھی۔ مگر وہ فون اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔

"پتا نہیں کہاں گیا ہے جاہل انسان۔" سیل ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کرتے وہ بڑبڑائی۔ وہ ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ بے چینی اس کے ہر انداز سے ظاہر ہورہی تھی۔ جبکہ پاس بیٹھی نیہا خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً" دوسری طرف سے فون ریسیو کرلیا گیا تھا۔

"کیا سمجھتے ہو تم خود کو؟" وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

"تمیز سے۔ اس لہجے میں شاہان علی سے کبھی اس کے باپ نے بات نہیں کی۔ پہلی دفعہ ہے' معاف کررہا ہوں۔ مستقبل میں خیال رکھنا۔"

وہ اس کی پہلی بات پر ہی اسے ٹوک چکا تھا۔ مغرور لہجے میں اس نے کہا تو وہ چڑ گئی تھی۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔ میں مستقبل میں آپ سے کبھی بات کروں گی۔" اس نے چڑ کر غصے سے کہا۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ آپ کو بتا دوں۔ مجھے مستقل آپ کا ساتھ قبول نہ تھا۔ نہ آج ہے اور نہ آنے والے کل میں ہوگا۔ ہم زندگی کے کسی بھی موڑ پر ساتھ نہیں چل سکتے۔ ہمارے راستے الگ تھے اور الگ رہیں گے۔ سو پلیز! آپ اپنے دل سے اس طرح کے تمام خیالات نکال دیں اور دوبارہ اپنے بابا جان کو ہمارے گھر مت بھیجئے گا۔ کیونکہ مجھے آزادی چاہیے۔"

فون بند ہوا تو اس نے سیل کان سے ہٹا کر جیب میں ڈال لیا۔

☼ ☼ ☼

تین بجے کا وقت تھا' جب وہ گھر میں داخل ہوا۔ وہ سامنے ہی اس کے منتظر بیٹھے تھے۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔" اس نے ذرا حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"کہاں تھے تم؟" انہوں نے اس کے سوال کے جواب میں سوال کیا تھا۔

"اس دنیا ہی میں تھا۔" لاپروائی سے سر جھٹک کر اس نے جواب دیا۔

"میں نے پوچھا' کہاں تھے تم؟" انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔ تو شاہان ہلکے سے مسکرایا۔

"چلیں! ٹھیک ہے۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ میں کہاں تھا اور کیا کررہا تھا۔ پھر کیا کرسکتے ہیں آپ؟ کچھ بھی نہیں۔" اس نے اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دیا تھا۔ "سو خوامخواہ پریشان مت ہوا کریں۔ جائیں آرام کریں جاکر۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

"میں تو آرام کرلوں گا شاہان! مگر تم ایک بات سن لو۔" سیڑھیاں چڑھتے شاہان کو انہوں نے پیچھے سے پکارا۔

"سرفراز نے انکار کردیا ہے۔ ریحا کو طلاق چاہیے۔"

ان کی بات پر وہ واپس مڑا۔ "بس اتنی سی بات؟" وہ ہولے سے ہنسا۔ "دے دوں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔"

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔ تو وہ بھی ایک گہری سانس لیتے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

وہ مین روڈ پر تھا۔ جب اس کا سیل فون بجا تھا۔ نمبر دیکھے بغیر ہی اس نے سیل کان سے لگایا۔ مگر دوسری

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف سے آنے والی "ہیلو" کی آواز نے اسے اچھا خاصا مشتعل کردیا۔

"کون؟" وہ دانستہ انجان بن گیا۔

"آواز بھی بھول چکے ہو کیا؟" دوسری طرف سے خاصے طنزیہ انداز میں کہا گیا تو اس کے بے حد سرخ لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیلی۔

"میں نے تمہاری فضولیات سننے کے لیے کال نہیں کی۔" وہ جھنجلا گئیں۔

"تو کیوں کی ہے؟ میری محبت میں تو ہرگز نہیں کی۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ مگر وہ نہیں معلوم جس کی وجہ سے کی ہے۔ وہ وجہ بھی بتادیں ڈیر مام!"

"تم ریحا کا پیچھا چھوڑ دو۔ آزاد کردو اسے اس رشتے سے۔" وہ ان کی بات سن کر ہلکا سا مسکرایا۔

"تو بھتیجی کی محبت میں آپ کو مجھ سے بات کرنا پڑی۔ ابھی تو آپ خود کو میری ماں کہہ رہی تھیں۔ کیسی ماں ہیں آپ؟ اپنے بیٹے کے دل کی خوشی چھین لینا چاہتی ہیں؟"

"وہ تمہارے دل کی خوشی نہیں ہے۔ اور یہ بات مجھ سے زیادہ تم بہتر جانتے ہو۔ اس لیے آزاد کردو اسے۔ اور کرلو اپنے باپ کے خاندان سے۔ اپنی کسی پھپھو، تایا، چچا کی بیٹی سے شادی جو تمہارے جیسی اور تمہارے مینٹل لیول کی ہوگی۔"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "ایک بات تو ابھی اور اسی وقت کلیئر کرلیں۔ میں اپنے باپ کے خاندان سے شادی کروں نہ کروں، اپنی ماں کے خاندان سے کی ہوئی شادی ضرور نبھاؤں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

☼ ☼ ☼

ہلکے سبز رنگ کا سوٹ پہنے، بالوں کو کیچر میں جکڑے، وہ خاصی مصوف سی تھی۔

بیڈ پر بکھرے کپڑوں کو الگ کرتے ہوئے اس نے سیاہ بیگ میں رکھا۔ وہ پندرہ دنوں کے لیے کراچی جارہی تھی جہاں اس کی کزن کی شادی تھی، جو اس کی صرف خالہ زاد ہی نہیں بہت اچھی دوست بھی تھی۔ اس کی شادی میں شرکت کے لیے گھر سے بس وہی جارہی تھی۔ پاپا آفس کی وجہ سے اور مما، پاپا کی وجہ سے نہیں جارہی تھیں۔ جبکہ نیہا کا فائنل سمسٹر چل رہا تھا۔ لے دے کے ایک وہی بچتی تھی سو خوشی خوشی تیار ہوگئی۔ ابھی وہ اپنی پیکنگ کررہی تھی۔ جب نیہا اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں چند پیکٹس تھے، جو اس نے لاکر ریحا کے پاس رکھے۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"مما نے دیے ہیں حورعین کے لیے۔" نیہا وہیں اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"سیٹ کنفرم ہوگئی؟" ریحا کے اشارہ کرنے پر وہ اس کا گولڈن پاؤچ اٹھا کر دیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آف کورس!" پاؤچ اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے بیگ میں رکھا۔ پھر بیگ بند کرکے ایک طرف رکھ کر وہ مطمئن سے انداز میں بیٹھ گئی۔

"ویسے ریحا! تمہیں کیا لگتا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا؟" اپنے بالوں کو کیچر سے آزاد کرواتے اس نے ناسمجھی سے نیہا کی جانب دیکھا۔

"وہ کون؟"

"شاہان اور کون؟" نیہا کے کہنے پر اس نے سر

جھٹکا۔

"اگر اس میں شرم و غیرت ہے تو یقیناً"۔۔۔"

"بٹ ریحا! مما کہہ رہی تھیں کہ وہ بہت ضدی انسان ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی جلدی اور آسانی سے تمہاری جان چھوڑ سکتا ہے۔" نیہا خاصی پریشان تھی۔

"ڈونٹ وری نیہا! وہ کیا کرسکتا ہے بھلا؟" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت فریش موڈ کے ساتھ بیٹھا ان کے ساتھ ناشتا کررہا تھا۔

"آپ آفس آئیں گے کیا؟" اورنج جوس کا گلاس اپنے سامنے رکھتے اس نے ان سے پوچھا۔

"نہیں! مجھے کہیں اور جانا ہے۔" اخبار لپیٹ کر رکھتے وہ بولے۔ ان کی بات پر سر ہلا کر وہ جوس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" انہوں نے چائے کا گھونٹ لے کر اس سے پوچھا تو وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"کس بارے میں؟"

"ریحا کے بارے میں۔"

ان کی بات پر وہ ایک لمحہ خاموش ہوا تھا۔ وہ پچھلے ہفتے سے اس سے اس بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ ہر بار بہت خوب صورتی سے ٹال جاتا تھا۔

"سوچ لیں گے پاپا! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" انہیں جواب دیتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلتا ہوں۔" رسٹ واچ پر وقت دیکھتا، وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس کے مبہم سے رویے پر الجھتے احسن کے سامنے آبیٹھے۔ جب سے انہوں نے ان لوگوں کے طلاق کے مطالبے کے متعلق بتایا تھا، وہ خاموش تھا۔ ان کے بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کچھ بتا نہیں رہا تھا کہ اس کا کیا ارادہ تھا۔ احسن سے۔۔۔ تمام باتیں بیان کرکے انہوں نے اپنی الجھن اس سے بانٹی تھی۔

"مجھے اس کی خاموشی سے ڈر لگ رہا ہے احسن! ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوجائے اور وہ بنا کوئی ردعمل ظاہر کیے یوں خاموشی سے بیٹھ جائے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، کیا ارادہ ہے اس کا؟"

"آئی ڈونٹ نو انکل!" احسن نے خاصے شرمندہ لہجے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "ایکچوئلی انکل! اس کے دل و دماغ میں کس وقت کیا چل رہا ہوتا ہے یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ وہ اپنے اندر کی بات کسی سے شیئر نہیں کرتا۔ میں نے ایک، دو بار کوشش بھی کی ہے۔ مگر وہ بہت آسانی اور خوب صورتی سے دامن بچا جاتا ہے۔" احسن کی بات سن کر وہ اور پریشان ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ کب سے کمرا بند کیے خود اذیتی کے عالم میں تھا۔

"تو ڈیر اماں جان! آپ نے اتنے سالوں بعد یاد بھی کیا تو میری محبت میں نہیں، میرے لیے نہیں، بلکہ اپنی پیاری بھتیجی کے لیے۔" سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے اس نے تلخی سے سوچا۔

"اس لیے کہ میں آپ کی پیاری بھتیجی کو آزاد کردوں۔ کیونکہ وہ نازوں پلی، نازک سی ریحا علی مجھ جیسے پتھر دل کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔"

تلخی سے سوچتے ہوئے وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے چلے جارہا تھا۔

"تو میں پتھر دل ہوں اماں جان!" وہ زہر خند لہجے میں بڑبڑایا۔ "تو مجھے پتھر دل بنایا کس نے؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"بہرحال اماں جان آپ کی یہ خواہش تو پوری نہیں ہوسکتی۔ کم از کم میری زندگی میں تو ہرگز نہیں۔" تلخ سے انداز میں خود کلامی کرتے وہ آخر میں ہولے سے مسکرایا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سفید کاٹن کی پینٹ پر سلیولیس ہلکے گلابی رنگ کی قمیص پہنے اس نے میچنگ پونی سے بال باندھ رکھے تھے۔ لکڑی کے جھولے پر بیٹھے ہوئے اس نے سیل پر جاذب کا نمبر ملایا۔

"ہائے جاذب! کہاں ہو تم۔ میں بزی رہی تو تم دونوں کو بھی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک کال ہی کرلو۔" جیزی کے کال ریسیو کرتے ہی وہ بلا توقف شروع ہوچکی تھی۔

"مجھے کہاں جانا تھا' بس یہیں تھا۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"اچھا سنو! میں کچھ دنوں کے لیے کراچی جارہی ہوں تو ابھی تم لوگ آجاؤ۔ انجوائے کریں گے۔"

اس کی بات پر وہ کچھ پل کے لیے خاموش ہوا تھا۔

"آئم سوری ریحا! بٹ اٹس ناٹ پاسبل۔" چند لمحوں بعد وہ بولا۔

"اوکے! تم ثومی کو کال کرو۔ میں بھی وہیں آجاتی ہوں۔" اس نے وال کلاک پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بوکھلا گیا۔

"نو ریحا! پلیز تم مت آنا۔"

"کیا مطلب؟ کیوں نہ آؤں؟" وہ جھولے سے اٹھتے اٹھتے رہ گئی۔

"ریحا میں۔۔۔" وہ کوئی بھی وجہ بتانے سے قاصر تھا۔

"جاذی! مجھے بتاؤ' تمہارے اس طرح کے رویے کی کیا وجہ ہے؟" وہ الجھ گئی۔

جاذب اس کی بات کے جواب میں خاموش رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی نتیجے پر پہنچی تھی۔ "اوہ! کہیں تم شاہان کی وجہ سے تو نہیں۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کے خاموش ہوگئی۔ دوسری طرف پھیلی چپ غالباً اعتراف ہی تھا۔

"او مائی گاڈ! تم اتنے ڈرپوک بھی ہوسکتے ہو۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

"میں بزدل نہیں ہوں ریحا۔" وہ اس کی بات پر تڑپ اٹھا۔

"تو پھر اور کیا ہو؟" وہ طنز سے بولی۔

"اس نے ممی' ڈیڈی کو دھمکی دی ہے کہ میں نے کبھی تم سے کسی بھی قسم کا رابطہ رکھا تو وہ مجھے ختم کردے گا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں ریحا! اور وہ میرے لیے کتنے پوزیسو ہیں' یو نو اٹ!" ناچار اسے حقیقت بتانا پڑی۔

"ممی نے رو' رو کر مجھے کہا ہے میں تم سے کبھی نہ ملوں' نہ بات کروں۔" ساری بات بتا کر وہ خاموش ہوگیا۔ ادھر ریحا کا غصے اور شرمندگی سے برا حال تھا۔ اس کی وجہ سے جاذب اور اس کے والدین کو کتنی ذہنی اذیت اٹھانی پڑی تھی۔ وہ شرمندہ ہوگئی تھی اور یہ شاہان علی۔۔۔ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا باپ آیا تھا۔ تمہاری وجہ سے بہت پریشان تھا۔" وہ ان کے سامنے آکے بیٹھا ہی تھا' جب انہوں نے کتاب سے نگاہ ہٹائے بغیر اسے مطلع کیا تھا۔

"میری وجہ سے؟" اس نے لہجے میں مصنوعی حیرانی پیدا کی۔ "میں بے چارہ بھلا کسی کو کیا پریشان کرسکتا ہوں۔ خوامخواہ کا وہم پال رکھا ہے انہوں نے۔"

"خوامخواہ کا؟" انہوں نے اس سے اگلوانے کی کوشش کی۔

"میں کیا کروں' کچھ کرتا تو بھی انہیں پریشانی ہوتی۔ نہیں کیا تب بھی پریشان ہیں۔" ایک ہاتھ سے بال سنوارتا وہ معصومیت سے بولا۔

"وہ تمہارا باپ ہے۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔

"اور آپ ان کے باپ ہیں۔" اس نے بھی انہیں یاد دلایا۔ تب وہ کتاب بند کرکے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"وہ الیکشن میں حصہ لینا چاہتا ہے۔"

"واقعی؟ میری تمام نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔" اس نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"اسے ڈر ہے تم اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کردو۔" انہوں نے اس کے باپ کی پریشانی کی اصل

وجہ بھی بتادی۔

"اور میں سوچتا تھا' وہ میرے لیے پریشان ہیں۔" دل نے یہ کہا تھا۔ مگر زبان سے کچھ اور ادا ہو رہا تھا۔

"میں غریب' مسکین سا بندہ' ہر گھڑی روزی' روٹی کے چکر میں پھنسا رہتا ہوں۔ میں نے کیا پرابلم کھڑی کرنی ہے کسی کے لیے۔" اس نے کچھ شرارت سے کہا تو وہ بھی زیر لب مسکرائے' مگر بہ ظاہر سنجیدگی سے پوچھنے لگے۔

"تم غریب ہو؟"

"کیا آپ نہیں جانتے؟"

"جو کلائی پہ گھڑی باندھ رکھی ہے ذرا اس کی مالیت بتاؤ گے؟" اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے انہوں نے پوچھا تو وہ ذرا آگے جھکا تھا۔

"یہ آپ نے انکم ٹیکس والوں سے کب سے دوستی گانٹھ لی ہے؟" اس کا اشارہ تایا فاروق علی کی طرف تھا جو انکم ٹیکس میں بہت اہم سیٹ پر تھے۔ "ویسے آپ انہیں بتادیجیے گا۔ میں ہر سال ٹیکس بڑی باقاعدگی کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔ چاہیں تو ریکارڈ چیک کرسکتے ہیں۔" وہ بات دوسری طرف لے جانا چاہتا تھا اور یہ وہ بہت اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ تب ہی اصل بات کی طرف خود ہی آگئے تھے۔

"تو ریحا علی نے شاہان علی سے طلاق مانگ لی ہے؟"

"بہت برا کیا۔" ان کی بات کے جواب میں اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب اسے شاہان علی جیسا دوسرا کہاں ملے گا۔"

"تو تم نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" اس نے اپنی سبز آنکھیں اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟"

☼ ☼ ☼

"ریحا!"

اپنی سوچوں میں الجھی وہ ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ اپنے کمرے سے نکلتے سرفراز علی نے اسے پکارا۔ وہ چونک گئی۔

"جی پاپا!" وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ایسے کیوں بیٹھی ہو بیٹا۔" انہوں نے اس سے شفقت سے پوچھا۔ وہ شاہان کی حرکت کی خبر دے کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے مسکرائی۔

"یونہی پاپا! تھوڑا بور ہو رہی تھی۔"

"کوئی اور تو پرابلم نہیں نا بیٹا؟" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

"نو پاپا!" اس نے مسکرا کر انہیں یقین دلایا۔

"اپنے پاپا کے ہوتے کبھی بھی فکرمند یا پریشان مت ہونا بیٹا۔ تمہارے پاپا ہر قدم' ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں۔" اس کے سر کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"آئی نو پاپا!" اس نے اپنا سر ان کے کندھے پر رکھا۔

"کیا خیال ہے بیٹا! آج ڈنر باہر نہ کریں؟" ان کی بات پر اس نے ان کے کندھے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"رئیلی پاپا۔"

"آف کورس مائی چائلڈ!" وہ مسکرا کر بولے تو وہ فوراً اٹھی تھی۔

"میں نیہا کو بتاتی ہوں۔" وہ اس کی خوشی دیکھتے ہولے سے مسکرائے تھے۔

☼ ☼ ☼

بہت عرصے بعد اس نے آج روحینہ کے فلیٹ کی طرف رخ کیا تھا۔ روحینہ کو یہ فلیٹ بھی خود اسی نے لے کر دیا تھا۔ وہ اسے اپنے سامنے دیکھتے ہی کھل اٹھی

"آج تو ہمارے بخت کا تارہ چمک اٹھا' جو آپ ہمارے پاس تشریف لائے۔ ویسے یہ احسان اتنے دنوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد کیوں؟" وہ خوشی سے اس کے سامنے بچھی جارہی تھی۔

"ہر چیز اس کی ضرورت کے وقت ہی استعمال کی جاتی ہے۔" صوفے پر پھیل کر بیٹھتے وہ بولا تو وہ ہنس دی۔

"گویا ہم آپ کی ضرورت بن چکے ہیں؟" وہ بہت ناز سے اٹھلائی۔

"ہو سکتا ہے۔ مگر میں ضرورت کو عادت نہیں بننے دیتا۔ کیونکہ ضرورت کہیں سے بھی پوری کی جاسکتی ہے۔ عادت بدلنا خاصا مشکل اور بعض دفعہ ناممکن ہوجاتا ہے۔" اس نے اس کے ناز کو خاک میں ملانا چاہا تھا۔

"آپ نہ بھی بتاتے تو ہم جانتے تھے۔ کیونکہ ہم آپ کے الفاظ اور عادت ہی کو نہیں آپ کو بھی حفظ کر چکے ہیں۔"

اس کے گھنے سیاہ بالوں میں اپنی لانبی انگلیاں پھیرتے وہ ہولے سے مسکائی تھی۔

"خوب! تو جاننے کا دعوا ہے؟" اپنی خمار آلود سبز آنکھیں اس کے خوب صورت سراپے پہ جماتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہماری اوقات کہاں کہ ایسا دعوا کر سکیں۔ آپ تو ہمارے دل میں بستے ہیں۔ آپ کو تو وہ بھی نہیں جانتے جو خود آپ کے دل میں بستے ہیں۔"

اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"میرے دل میں کہاں کوئی بستا ہے؟" اس نے روحینہ کی بات جھٹلائی۔

"جانے دیجئے صاحب! انجان ہی سہی، مگر ہم اتنے بھی بے خبر نہیں۔"

"جاننے کا دعوا بھی ہے۔ انجانے پن کے قصے بھی سناتی ہو۔ تم ہو کیا چیز؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں، بس آپ کے قدموں کی دھول۔" وہ اٹھلا کے بولی۔

☆ ☆ ☆

"میری طرف سے خالدہ کو بہت سا ایکسکیوز کرنا بیٹا! اور اپنا بہت سا خیال رکھنا۔ کھانے پینے میں لاپروائی بالکل مت برتنا۔" وہ مسلسل ہدایت دے رہی تھیں۔

"میں چھوٹی بچی نہیں ہوں مما!" وہ تھوڑا جھنجلائی۔

"میرے لیے تم آج بھی چھوٹی سی بچی ہی ہو۔" اس کی پیشانی چومتے انہوں نے پیار سے کہا۔

میرون کیپس کے ساتھ سیاہ پاجامہ پہنے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ایرپورٹ تک چلتی، مگر فائزہ نے اچانک آنے کا پروگرام بنالیا تو بیٹا! اچھا نہیں لگتا۔ اب اسے منع کروں تو؟"

"کوئی بات نہیں مما! اور ویسے بھی میں کون سا سات سمندر پار جارہی ہوں یا بہت سارے سالوں یا مہینوں کے لیے۔"

ڈرائیور نے اس کا سامان گاڑی میں رکھ دیا تھا۔

"او کے مما!" وہ ان کے گلے لگ گئی۔

"مس یو بیٹا!" انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "اور ہاں جاتے ساتھ ہی اپنی خیریت سے آگاہ کر دینا۔"

وہ سر ہلا کر گاڑی میں آبیٹھی۔

☆ ☆ ☆

وہ خاموش سی بیٹھی باہر کے نظاروں میں مگن تھی۔ جب گاڑی ایک جھٹکے سے بند ہوئی تھی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"پتا نہیں بی بی! چیک کرتا ہوں۔" وہ گاڑی سے باہر نکل کر اب بونٹ پر جھکا ہوا تھا۔ وہ کوفت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ پھر شیشہ نیچے کیے اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ صبح ساڑھے دس کا ٹائم تھا اور اس وقت صبح والی افراتفری تو نہیں تھی۔ پھر بھی روڈ پر اچھی خاصی گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ان کی گاڑی جہاں بند ہوئی تھی۔ یہ جگہ اسلام آباد ایرپورٹ سے تقریباً

چالیس منٹ کی ڈرائیو پر تھی۔

"بی بی!" وہ سامنے نظر آتے ایک ریسٹورنٹ پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ جب ڈرائیور نے اسے پکارا تھا۔ وہ نظروں کا زاویہ تبدیل کرتی اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"گاڑی میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ گاڑی جیسے ہی اسٹارٹ ہوتی ہے۔ فوراً بند ہوجاتی ہے۔" وہ نظریں جھکائے بتا رہا تھا۔

"تو اب کیا ہوگا؟" اس نے رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

"بی بی! میں نے گلزار کو فون کیا ہے۔ مگر اس کو گیراج سے یہاں تک آتے کم از کم گھنٹہ لگ جائے گا۔"

اس نے دوبارہ گھڑی دیکھی اگر وہ بابا کو کال کر کے دوسری گاڑی منگواتی تو بھی کم از کم گھنٹہ لگ سکتا تھا اور یہاں سے آگے چالیس منٹ کی مزید ڈرائیو۔ جبکہ اس کی فلائٹ بارہ بجے کی تھی۔ اس نے خاموشی سے حساب لگایا۔

"یہاں سے کوئی کیب نہیں مل سکتی؟" یہی آخری حل تھا، جو اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

"میں کوشش کرتا ہوں بی بی!" وہ گاڑی سے ہٹ کر آکھڑا ہوا۔ وہ بہت بے چین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد وہ اس کے پاس آیا۔

"بی بی!" اس نے اس کے شیشے پر ذرا سا جھکتے ہوئے اسے پکارا۔ "میں نے ایک گاڑی روکی ہے، دو میاں بیوی ہیں۔ وہ بھی ایرپورٹ ہی جارہے ہیں، ان کے کسی عزیز نے آنا ہے۔ وہ آپ کو لفٹ دے سکتے ہیں۔"

ڈرائیور کی بات پر اس نے اپنی گاڑی سے چند فٹ آگے کھڑی سفید کرولا کو ایک نظر دیکھا اور نیچے اتر آئی

"تم میرا سامان نکالو۔" ڈرائیور نے مستعدی سے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔

وہ ڈرائیور کے پیچھے چلتی ہوئی اس سفید کرولا کے پاس آگئی۔ ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کھولا تھا۔ جہاں ایک خاتون پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ چالیس سال کی بہت سادہ سے حلیے والی عورت نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ بھی مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم!" اس نے مسکرا کر سلام کیا تھا۔ وہ بھی مسکرا کر جواب دیتی سامنے کی طرف دیکھنے لگیں۔ آگے بیٹھے شخص نے گاڑی بڑھالی تھی۔ تقریباً" دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس نے گاڑی دوسری سمت موڑلی۔

"یہ کیا؟" اس نے حیرت سے ساتھ بیٹھی خاتون سے پوچھا۔ "انہوں نے گاڑی دوسری طرف کیوں موڑلی ہے؟" اس کی بات کے جواب میں دوسری طرف خاموشی تھی۔

"میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ۔۔۔"

"شش!" اس عورت نے اپنے لبوں پر انگلی رکھ کے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس عورت کے انداز پر اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

☆ ☆ ☆

پورے راستے وہ سوچتی آئی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن جیسے ہی اس بڑے سے سفید گیٹ کے سامنے گاڑی آکھڑی ہوئی تو تمام بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

"شاہان علی نے اپنی اصلیت دکھائی دی۔ وہ گھٹیا پن پہ اتر آیا ہے۔" گیٹ وا ہوتے ہی گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ جہاں سامنے ہی وہ پلر سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ کچھ اور لوگ بھی تھے وہاں گاڑی کے رکتے ہی وہ اس طرف چلا آیا۔ اس کے آتے ہی آگے بیٹھا مرد اور پیچھے بیٹھی عورت اتر کر چلے گئے۔ گویا وہ اس سے ملے ہوئے تھے۔ صرف وہی نہیں، خود اس کے باپ کا رکھا ہوا ڈرائیور بھی۔

شاہان نے دروازہ کھولا تھا۔

"میں تمہیں بہت عزت سے یہاں لانا چاہتا تھا۔ مگر عزت تمہیں اور تمہارے باپ دونوں کو راس

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں آئی۔" وہ ذرا سا جھکا کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک شاک کے عالم میں بیٹھی تھی۔

"اب نیچے آجاؤ۔ یہ سب لوگ تمہارے استقبال کے لیے بے تاب کھڑے ہیں۔" اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا تھا تو اس نے نظریں اٹھا کر سامنے کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا۔

بہت عرصے بعد نظر آنے والے ان چہروں کو وہ ابھی تک پہچانتی تھی۔ سب سے آگے زینب بجنہیں بچپن میں وہ سب آپی کہتے تھے۔ بہت محبت لیے وہ کھڑی تھیں۔ ان کے بعد بہت سرخ و سفید رنگت والے بہت رعب و دبدبے والی مضبوط شخصیت شاہان علی کے بڑے ابا۔ ان کے چہرے پر بھی اس وقت نرم سی مسکراہٹ تھی۔ ان دونوں سے چند فٹ کے فاصلے پہ کھڑی شاہان علی کی بڑی تائی اور چھوٹی چاچی اس کی دو' تین کزنز اور اس کی اکلوتی پھپھو صاحبہ۔ ان سب چہروں پر اس کے لیے نفرت اور بے زاری تو تھی ہی مگر ایک اور چیز بھی تھی اور وہ تھا تجسس۔ اس تماشے کو دیکھنے کا' جو ابھی وہاں برپا ہونے والا تھا۔ ان لوگوں کے چہروں سے نگاہ ہٹا کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ شاید اپنا کوئی حمایتی' کوئی مددگار نظر آجائے۔ مگر وہ شاہان علی کی حویلی تھی۔ وہاں اس کا راج اس کا حکم چلتا تھا۔ وہاں رہنے والے تمام فراد اس کے اپنے تھے۔ وہاں اس کا کوئی حمایتی' کوئی مددگار نہیں تھا۔ وہاں کوئی بھی احتجاج' کوئی بھی ہنگامہ سوائے آپ اپنا تماشا بنوانے اور وہاں موجود لوگوں کو اس تماشے سے محظوظ کرنے کے کچھ اور نہ ہوتا۔

اسے بہت طریقے' بہت سمجھ سے چلنا تھا۔ اس نے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔ اسے ایسا کچھ بھی نہیں کرنا تھا' جو اسے اس کی ذات کو مزید تماشا بناتا۔ "ایک منٹ۔" شاہان نے ہاتھ میں تھامی سیاہ چادر جو چھوٹے شیشوں سے مزین تھی' اس کی گود میں پھینکی۔

"اترنے سے پہلے اسے اوڑھ لو۔ کیونکہ جو لباس تم نے پہنا ہوا ہے' یہ تمہارے ہاں بھلے ہی فیشن کی علامت سمجھا جاتا ہو۔ ہمارے ہاں بے ہودگی اور بے غیرتی سمجھا جاتا ہے۔" طنز سے کہتا وہ اب سیدھا کھڑا تھا۔

ریحا نے ایک نظر گود میں پڑی سیاہ چادر کو دیکھا۔ جی تو چاہ رہا تھا' اس چادر سمیت یہاں موجود ہر شے بشمول شاہان علی کے تیل چھڑک کر آگ لگا دے۔ مگر یہ وقت جذباتیت دکھانے کا نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے گود میں پڑی سیاہ چادر اوڑھ کر باہر قدم نکالا۔

"بسم اللہ!" زینب آپی محبت سے کہتی آگے بڑھی تھیں۔ "کیسی ہو میری جان؟" بہت محبت سے اسے گلے لگاتے انہوں نے پیار سے پوچھا۔

اس نے ہولے سے سر ہلایا۔ وہ اسے تھامے بڑے ابا کے سامنے لائی تھیں۔ جنہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ پھر فروا' فروا' سب سے مل کر وہ زینب آپی کے ہمراہ اندر آگئی۔ انہوں نے اسے صوفے پر لا بٹھایا تھا۔

وہ ششدر سی بیٹھی تھی۔ وہ گھر سے خالہ کے گھر کراچی جانے کے لیے نکلی تھی اور یہاں شاہان علی کی حویلی آپہنچی تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ جب وہ حویلی پہنچی تھی اور اب چار بج رہے تھے۔ زینب آپی اسے یہاں کمرے میں لائی تھیں۔

"تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا سا آرام کرلو۔" زینب آپی اسے کہہ کر باہر چلی گئیں۔ اس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ دیوار کے ساتھ رکھا ہلکے آسمانی رنگ کی بیڈ شیٹ والا بیڈ' بیڈ کے بالکل سامنے رکھا ڈریسنگ ٹیبل' اس کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ رکھی لکڑی کی تین کرسیاں' ایک دیوار کے ساتھ بنی وارڈروب۔ کمرا بہت سادگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔

کمرے سے ہوتی اس کی نگاہ ایک طرف رکھے اپنے سامان کی طرف اٹھی تھی۔ بہت تیزی سے اس نے اپنا سفید بیگ اٹھایا تھا۔ پھر جلدی سے زپ کھول کر

اس نے سیل نکالنا چاہا۔ مگر پرس میں سب کچھ ویسا ہی پڑا تھا' سوائے سیل فون کے۔ اس نے سارا پرس بیڈ پر الٹ دیا تھا۔ ہیئر برش' لپ اسٹک' ٹشوز کے پیکٹ' سکارف' ایک چھوٹا اور سیاہ والٹ' سب کچھ تھا۔ سیل فون نہیں تھا۔ تو اس کا سیل فون نکال لیا گیا تھا۔

کب۔۔۔ جب اب سے آدھ گھنٹہ پہلے اس سے پرس لے کر اندر رکھا گیا تھا۔

"اب کیا کروں؟" تمام چیزیں واپس رکھ کے اس نے تھک کر سوچا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت سرشار سا برآمدے کے آگے لگی سفید گرل کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے موبائل پکڑ کر کان سے لگایا ہوا تھا۔ وہ دوسری طرف سے کسی کے فون اٹھانے کا منتظر تھا۔ آسیہ بیگم نے سیل پر نظر آتے ریحا کے نمبر کو خوشی سے دیکھتے کال ریسیو کی تھی۔

"ہاں میری جان! پہنچ گئی ہو؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیسی ہیں میری پیاری سی ساسوماں؟" دوسری طرف سے آتی آواز نے انہیں حیران کردیا۔

"تم؟" ان کے تم میں حیرت بھری الجھن تھی۔

"تمہارے پاس ریحا کا سیل کیسے آیا؟"

"ہاہاہا۔" اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ "میرے پاس آپ کی ریحا کا سیل ہی نہیں' آپ کی پیاری سی ریحا بھی ہے اور یہی بتانے کے لیے میں نے آپ کو کال کی ہے کہ آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوتی رہیں۔"

"کیا بکواس ہے یہ؟" انہوں نے اشتعال سے پوچھا۔ "ریحا تو کراچی گئی ہے۔ تمہارے پاس کیسے ہوسکتی ہے؟" وہ ان کے مشتعل ہونے پر محظوظ ہوا تھا۔

"بہت بھولی ہیں آپ مامی جی۔ جب اس کا اتنا پیار کرنے والا شوہر یہاں پر ہے تو وہ کراچی جا کر کیا کرے گی۔ وہ تو یہاں ہے میرے پاس۔۔۔ میرے قریب۔" بہت لطف لیتے ہوئے کہتا وہ انہیں زہر لگ رہا تھا۔

"تم؟" بہت غصے سے انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر اس نے فوراً انہیں ٹوک دیا۔

"پلیز مامی جی! ابھی کافی کام ہیں' جو مجھے کرنے ہیں۔ باقی تفصیلی بات تو بعد میں ہوگی۔" اس نے مسکرا کر فون بند کردیا۔

☆ ☆ ☆

وہ بے حد پریشان سی بیٹھی تھی۔ بہت سا سوچنے کے باوجود بھی اسے یہاں سے نجات یا فرار کی کوئی راہ نہیں سجھائی دے رہی تھی۔ ہر راستہ بند گلی میں آکھڑا ہوا تھا۔ اسے یوں بے بس کردیا گیا تھا کہ بہت کچھ چاہنے کے باوجود بھی وہ کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ تقدیر نے اسے شاہان علی جیسے ظالم انسان کے سامنے لا پھینکا تھا۔ بیڈ کراؤن سے سر ٹکائے وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی۔ جب وہ مضبوط قدموں سے چلتا اندر آیا۔ اس نے لاک لگایا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور اپنے سامنے کھڑے شاہان علی کو دیکھ کر وہ بری طرح پریشان ہوگئی۔

وہ یہاں کیوں آیا تھا؟ اس سوچ نے اس کے اندر بے چینی سی بھر دی۔ وہ چلتا ہوا بیڈ پر اس کے سامنے آبیٹھا پھر جیب سے ڈبیا نکال کر سگریٹ سلگائی۔ گہرا سا کش لے کر اس نے ریحا کی طرف دیکھا۔

"چہ چہ چہ۔۔۔ تو ریحا شاہان علی بے خبری میں ہی ماری گئی' افسوس۔" وہ اس کی بے بسی پر مسکرایا۔

"یہ جو آپ نے کیا ہے نا! اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔" چوکنے سے انداز میں بیٹھی وہ اسے آنے والے وقت سے ڈرانے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔۔۔ "ویل ڈیئر مسز! یہ جو تمہارا سر پھرا ہے نا' یہ ہر کام ہر قسم کے نتائج سے بے پروا ہو کر کرتا ہے۔ صرف اپنے دل کی مان کر۔ اب کیا کیا جائے۔" اس نے کہنیوں تک کف الٹتے ہوئے اسے دیکھا۔ "یہ تو ایسا ہی ہے۔ خیر! ابھی ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

باتوں کو چھوڑو۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ان لمحوں کی خوب صورتی کو محسوس کرو۔"

ایک دم سے اپنا انداز تبدیل کرتے اس نے ریحا کی سفید کلائی تھام لی وہ بپھر گئی۔

"ڈونٹ ٹچ می۔" غصے سے کہہ کر اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کے یوں غصہ ہونے پر وہ اور بھی مشتعل ہوگیا۔ ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچتے اس نے طنزیہ اسے دیکھا۔

"ورنہ کیا کرو لوگی تم؟" اس نے اسے اپنے بے حد قریب کرلیا تھا۔

"میں صرف یہی نہیں اور بھی بہت کچھ کرسکتا ہوں اور کروں گا بھی۔" بہت غصے سے کہتے شاہان کی سانس اس کے رخسار سے ٹکرا رہی تھی۔

"اور تم کچھ نہیں کرسکتیں۔۔۔ پر کاٹ دیے ہیں تمہارے۔۔۔ بے بس ہو تم۔۔۔ بالکل بے بس۔" ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہتے ہوئے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

☆ ☆ ☆

نم آنکھوں سے چھت کو دیکھتی وہ اپنی بے بسی پہ ماتم کناں تھی۔ اپنی بے بسی پہ اپنی ہار پہ افسردہ ریحا علی کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ٹوٹ کر گرے تھے اس نے کروٹ بدلی تو نظر دائیں پہلو میں سوئے شاہان علی کے چہرے سے ٹکرائی۔ کیسی جیت رقم تھی اس کے مغرور نقوش سے سجے پتھریلے چہرے پہ اس وقت اپنی اسی جیت کے نشے میں دھت وہ بہت بے خبر سا سو رہا تھا۔ تقدیر نے اسے اس پتھر دل انسان کے ہاتھوں مجبور کردیا تھا۔ یہ پتھر دل انسان جس کے لیے صرف اس کی اپنی عزت، اپنی انا، اپنی خوشی، اپنی ضد ہی اہم تھی۔ دوسروں کی مرضی و خوشی ان کے احساسات و جذبات کچھ بھی اس کے لیے اہم نہیں تھا اور اپنی "میں" کے نشے میں چور یہ شخص اس کا نصیب بن گیا تھا۔

وہ تقدیر کی اس ستم ظریفی پر شکوہ کناں تھی۔ بند آنکھوں اور کالے سیاہ بکھرے بالوں والے شاہان علی کو دیکھ کر اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ کاش! وہ اس شخص کا کچھ بگاڑ سکتی۔ بہت تھک کر سوچتے وہ بستر سے اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

زینب آپی ان دونوں کا ناشتا کمرے میں ہی لے آئی تھیں۔ شاہان بہت مزے سے اورڈٹ کر ناشتا کر رہا تھا جبکہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے خاموش سی بیٹھی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر اس وقت بے انتہا شکستگی اور ہار پھیلی ہوئی تھی۔

"ناشتا کرلو نا ریحا!" آپی نے اسے پیار سے مخاطب کیا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے آپی۔"

"نہیں ریحا! تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ ایسے تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ کچھ کھالو جان!" وہ بہت پیار سے اصرار کر رہی تھیں۔

"پلیز آپی! میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"نہیں جان! کھانے سے انکار نہیں کرتے ناشکری ہوتی ہے۔" زینب آپی بہت نرم مزاج کی تھیں اور بے تحاشا نرمی اس وقت ان کی آواز میں گھلی ہوئی تھی۔ تب ہی شاہان نے انہیں مزید اصرار سے روکا۔

"رہنے دیں آپی! بے چاری ریحا پہلے ہی صدمے سے دوچار ہے اور تنگ نہ کریں۔" مسکراتے لہجے میں وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ آنکھوں میں آنے والی بے ساختہ نمی اس نے سر جھکا کر چھپائی۔

"ذرا اس کے دل بے قرار کو سنبھلنے دیں۔ خود ہی کھالے گی۔" ٹشو سے ہاتھ صاف کرکے، وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ آپی اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ اطلاع ملتے ہی بہت صبح ہی حویلی پہنچ گئے تھے اور اب وہ بڑے ابا کی اسٹڈی میں ان کی عدالت میں

کھڑا تھا۔ "کیوں لے کر آئے ہو اسے یہاں اور اس طرح سے؟" انہوں نے بہت غصے سے پوچھا۔

"بیوی ہے وہ میری۔ میں اسے یہاں رکھوں یا چاند پر میری مرضی۔" سیاہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے وہ بہت اطمینان سے کھڑا تھا۔

"اور جہاں تک اس طرح لانے کی بات ہے تو اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"مرضی؟" انہوں نے طنز سے دوہرایا۔ "اس کی مرضی بھی پتا کی تھی، جسے یوں زبردستی یہاں لائے ہو؟" ان کے طنز پر وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"شاہان علی کے لیے دوسروں کی نہیں، صرف اس کے اپنے دل کی مرضی اہم ہوتی ہے۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ باہر نکل گیا۔

"یہ آپ کی دی ہوئی شہہ ہے، جو وہ اتنا خود سر ہوگیا ہے۔" انہوں نے جھنجلا کر خاموش بیٹھے بڑے ابا کو مخاطب کیا۔

"نہیں احسان علی! یہ میری شہہ نہیں۔ تمہارا اپنا ماضی ہے، جو تمہارے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔" بڑے ابا کی بات پر وہ حیران رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

وہ اندر داخل ہوتے ہی اس کی سمت چلا آیا۔

"ہیلو۔" اس نے موبائل اس کی سمت بڑھایا تو وہ جو اپنے سامنے بیڈ پہ پھیلے لہنگے اور دوسرے سامان کو بے توجہی کے ساتھ دیکھ رہی تھی، چونک گئی۔

"اپنے گھر بات کرلو۔"

وہ موبائل اس کی طرف بڑھا کر باہر نکل گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے نیہا کا نمبر ملایا۔ نیہا اس کی آواز سنتے ہی رو پڑی۔ خود اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

"کیسی ہو؟" نجانے کتنی دیر گزر گئی تھی، جب نیہا نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے بمشکل خود کو سنبھالا "مما، پاپا کیسے ہیں؟"

"مما بہت ٹینس ہیں۔۔۔ ریحا! رو رو کر انہوں نے اپنے حال برا کرلیا ہے۔ مجھ سے تو انہیں سنبھالا بھی نہیں جا رہا۔" نیہا نے بتایا۔ اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔

"اور پاپا؟" آنسو قطرہ قطرہ پھر گرنے لگے۔

"پاپا؟" نیہا ایک لمحہ خاموش ہوئی۔ "یو نو ریحا! شاہان نے جو کچھ کیا ہے، اس میں پاپا کی رضا شامل ہے۔" نیہا کے دکھ بھرے انداز سے کہنے پر اسے کرنٹ لگا تھا۔

"واٹ؟ کیا کہہ رہی ہو نیہا! تم پاگل تو نہیں ہوگئیں؟"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ریحا! اگر میں کسی اور سے سنتی۔ مگر میں نے خود اپنے کانوں سے پاپا کو شاہان سے بات کرتے سنا ہے۔" نیہا کی بات پر وہ اندر سے ڈھے گئی۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے نیہا! پاپا ایسا کیوں کریں گے؟" اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"تمہیں یقین نہیں ہے ریحا! تو آج غالباً" تمہارا ولیمہ ہے نا۔۔۔"

"ہاں! مگر۔۔۔"

"تو پاپا آئیں گے۔ تم خود پوچھ لینا ان سے۔"

"پاپا یہاں آئیں گے؟" اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"ہاں! وہ شاہان سے یہی کہہ رہے تھے۔" نیہا کی بات پر وہ بالکل چپ رہ گئی تھی۔

"ریحا!" نیہا نے اسے پکارا۔ وہ اب اسے حوصلہ دینا چاہ رہی تھی۔ "کچھ بھی ہو، اس شخص کو کوئی بھی لمحہ کراس مت کرنے دینا۔" اس کی بات پر وہ تلخی سے مسکرائی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے نیہا۔۔۔ جو شخص مجھے میری مرضی کے خلاف یہاں حویلی لاسکتا ہے، وہ میرے ساتھ اور کچھ نہیں کرسکتا۔ اس شخص کی کوئی لمحہ نہیں ہے نیہا۔۔۔" بہت دکھ سے کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس نے۔۔۔ کاش ریحا! میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔"

"میں جہاں کھڑی ہوں نا نیہا! وہ یہاں پر میں خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتی تو کوئی دوسرا بھلا کیا کر سکتا ہے۔ تم بس مما کا بہت سا خیال رکھنا اور ہاں! کوشش کرنا کہ انہیں پتا نہ چلے کہ شاہان کے اس عمل میں پاپا کی رضا بھی شامل ہے ورنہ ان کا اعتبار ٹوٹ جائے گا۔"

☆ ☆ ☆

آج دن میں اس کا ولیمہ تھا۔ بہت مختصر نوٹس پر بھی ولیمہ کے بہت اعلا انتظامات کیے گئے تھے۔ اندر باہر پھیلی چہل پہل سے بے نیاز وہ اس وقت بیڈ کے ایک کونے پر ٹکی تھی۔ سی گرین کلر کے لہنگے میں ملبوس ریحا کو بیوٹیشن تیار کر کے جا چکی تھی اور اس لہنگے اور دیدہ زیب مہنگے کے ساتھ زیورات اور دوسرے لوازمات سے سجی وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی اور اس کے دلکش حسن کو چار چاند سوگواریت نے لگائے تھے۔ سوگواریت میں لپٹا حسن۔۔۔ اتنا دلکش منظر تھا کہ ایک پل اندر آتا شاہان علی بھی ٹھٹک کر رہ گیا تھا' دوسرے ہی لمحے وہ اندر بڑھا تھا اور اس کے پیچھے آتے سرفراز علی بھی۔۔۔ وہ کمرے کے وسط میں آ کے ٹھٹکا را اس نے بے اختیار سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

"پاپا!" وہ اک لمحے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ دوڑ کر ان کے گلے آ لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے اپنا سر ان کے سینے سے ٹکایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں تھا جو یوں۔۔۔ آپ بس ایک بار کہتے پاپا! تو میں ہنسی خوشی اس شخص کے ساتھ رخصت ہو جاتی۔"

شاہان انہیں اکیلا چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔ تب بہت سارو چکنے کے بعد اس کے لبوں سے شکوہ بر آمد ہوا تھا۔

"تمہاری ماں کبھی نہیں مانتی بیٹا۔" انہوں نے بہت پر ملال سے انداز میں کہا۔ "میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا بیٹا۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئے تھے۔

"بعض فیصلے بڑے اذیت ناک ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ اس لیے خوشی سے یا ناخوشی سے ہمیں انہیں نبھانا پڑتا ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں اس کے تمام رخ ہی نہیں دیکھنے چاہئیں۔ بلکہ ہمیں اس کے ان اثرات کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے' جو ہمارے اس فیصلے کے نتیجے میں نہ صرف ہماری۔ بلکہ ہم سے وابستہ بہت سارے دوسروں لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور فیصلہ کرتے وقت صرف اس وقت' اس لمحے کو نہیں' آنے والے وقت کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارا اٹھایا ہوا کوئی قدم یا کیا ہوا کوئی فیصلہ صرف آج نہیں آج سے پانچ دس سال بعد یہ اثرات سامنے لائے گا میں نے ان ساری چیزوں کو نظر انداز کیا اور بہت غلط کیا اپنے ساتھ ہی نہیں تمہارے ساتھ بھی۔۔۔ بیٹا! زندگی بعض دفعہ ہمیں ایسے مجبور کرتی ہے کہ ہم چاہنے کے باوجود وہ سب کرتے ہیں جو یہ کروانا چاہتی ہے۔ میں نے بھی بہت مشکل میں ایسا کیا۔ تمہیں معلوم ہے بیٹا! میں نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟ تمہاری پھپھو کی وجہ سے۔"

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"پھپھو کی وجہ سے۔۔۔؟"

"ہاں!" انہوں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"اس کی بے رنگ زندگی نے مجھ سے ایسا کروایا۔ اس کی اداسی' اس کا اکیلا پن مجھ سے برداشت نہیں ہو تا بیٹا! میں کتنی اذیت محسوس کرتا ہوں۔ جب جب اس کی زندگی کے متعلق سوچتا ہوں۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ یونو بیٹا! احسان نے آج تک اسے طلاق نہیں دی۔ آج بھی اسے اپنے نام کا پابند کر رکھا ہے۔۔۔ اور شاہان بھی اسی کا بیٹا ہے۔ انا اور ضد میں اس سے بھی چار ہاتھ آگے۔ وہ تمہیں کبھی آزاد نہیں کرتا۔ مجھے اس بات کا علم تھا اور اگر ہم عدالت کے ذریعے طلاق لے بھی لیتے تو پھر بھی میں تمہاری زندگی برباد ہونے سے روک نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ہمارے خاندان میں بیوہ' طلاق یافتہ کی کبھی دوسری شادی نہیں

کی جاتی۔ یہ میرے خاندان کی روایت ہے اور میں اسے توڑ نہیں سکتا تھا بیٹا! اسی لیے تمہاری زندگی کو بے رنگ ہونے سے بچانے کے لیے مجھے یہ سخت اور مشکل فیصلہ کرنا پڑا۔"

وہ تھک کر خاموش ہوئے تھے۔ تب اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"اور اب آپ کو لگتا ہے پاپا! کہ میری زندگی اذیت ناک نہیں ہو گی؟"

"مجھے پتا ہے بیٹا! یوں ایک دم سے یہ سب قبول کرنا تمہارے لیے مشکل ہے۔ مگر رفتہ رفتہ تم اپنی لائف میں سیٹ ہو جاؤ گی۔۔۔ اور جہاں تک بات ہے شاہان کی تو میں مانتا ہوں' وہ کچھ سخت مزاج ہے' مگر مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔ تم اسے اپنی توجہ سے بدل لو گی اسے اپنی پروا سے نرم کر لو گی۔"

"وہ پتھر ہے پاپا! اور پتھر کب نرم ہوتے ہیں۔ انہیں نرم کرنے کی کوشش کرو تو یا تو وہ ٹوٹ جاتے ہیں یا توڑ دیتے ہیں۔" اپنی آنکھوں کی گیلی سطح خشک کرتے ہوئے بولی تو سرفراز علی اپنی آنکھوں کی نمی چھپا نہیں پائے تھے۔

☆ ☆ ☆

ولیمہ کا فنکشن ختم ہوتے ہی آپی زینب اور شاہان کی چچازاد ماہین اسے کمرے میں لے آئیں۔ مگر یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں وہ کل سے تھی یہ تو کوئی دوسرا کمرا تھا وال ٹو وال بچھا آف وائٹ اور گولڈن قالین' جہازی سائز بیڈ جس پر آف وائٹ بیڈ شیٹ بچھی ہوئی تھی۔ بہت بڑی سی گلاس ونڈو کے آگے پردے بھی اسی رنگ کے تھے۔ فل اسکرین ٹی وی۔۔۔ کمرے کے ایک کونے میں روم ریفریجریٹر' بہت اسٹائلش آف وائٹ صوفہ اور اس کے آگے رکھی شفاف شیشے کی میز' بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھرے ٹیبل لیمپ اور کونے میں رکھا بڑا سا گلدان کمرے کی خوب صورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔ جبکہ بیڈ کی سائیڈ پہ۔۔۔ کرسٹل اسٹینڈ پر رکھی شاہان علی کی بڑی سی تصویر کمرے کی شان تھی

وہ دونوں اسے کمرے میں چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد ڈریسنگ روم میں لباس تبدیل کرنے کے لیے چلی گئی۔ لباس تبدیل کر کے وہ باہر نکلی تو وہ سامنے ہی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ وجہ اس کی کمرے میں موجودگی نہیں۔ بلکہ یہ اس کے ہاتھ میں تھاما گلاس اور سامنے میز پر دھری بوتل تھی۔

تو شاہان علی یہ تھی تمہاری اصلیت' تمہارا اصل چہرہ۔۔۔ ٹھیک کہا تھا اس نے نیہا سے۔ اس شخص کی واقعی کوئی حد نہیں تھی۔

اس نے تنفر بھری نگاہ اس پر ڈالی' جو بے نیاز بنا بیٹھا تھا اور خاموشی سے واش روم میں گھس گئی۔ وہ واپس باہر آئی تو وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ خود بھی خاموشی سے بستر پر آ بیٹھی۔ تب ہی شاہان علی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ وہ فوراً" پرے ہوئی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"یہ مت سمجھنا شاہان علی تم پہ مرمٹا ہے۔ تمہارے جیسی ہزاروں نہیں' لاکھوں شاہان علی کے قدموں میں نچھاور ہونے کو بے تاب ہیں۔ وہ تو تم میری ضد ہو اور بس۔۔۔ تمہیں اپنے سامنے بے بس دیکھ کر جو سکون میرے رگ و پے میں اترتا ہے اس کا نعم البدل کہیں نہیں۔"

اسے اپنے پہلو میں گراتے شاہان علی نے اس کی اوقات یاد دلائی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے سے جا چکا تھا۔ وہ فریش ہو کر نکلی تو آپی منتظر تھیں۔

"آؤ! باہر ہی ناشتا کر لینا۔" وہ اسے لیے باہر آ گئیں۔ شاہان اور بڑے ابا تو صبح ہی نکل گئے تھے۔ انہوں نے خود ہی بتایا تھا۔ وہاں بہت خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ آپی اپنے ساتھ ملازمہ کو لیے کچن سے باہر آئی تھیں۔ انہوں نے ملازمہ کو اشارہ کیا تو اس نے ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ آپی اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

قریب ہی آبیٹھیں۔
چائے کا کپ ہاتھ میں تھامتے اس نے ان سے سب کے بارے میں پوچھا تھا۔
"سب لوگ یہاں تھوڑی رہتے ہیں۔ پہلے سب اکٹھے ہی رہتے تھے۔ مگر پھر بچے بڑے ہوئے تو بڑے ابا نے سب کے الگ پورشن بنوا دیے تھے۔ اس پورشن میں تو میں اور بڑے ابا ہوتے ہیں۔۔۔ یا شاہان یا چھوٹے چاچو آجائیں تو وہ یہیں رہتے ہیں۔ ساتھ والا پورشن تایا ابا کا ہے مگر وہ یہاں نہیں ہوتے اسلام آباد ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی جاب بھی وہیں ہے۔ ماہین اور سفیان بھی وہیں پڑھتے ہیں۔ وہ لوگ شاہان کے بلانے پر آئے ہوئے تھے۔ آج واپس چلے جائیں گے۔ سامنے والے دونوں پورشنز میں سے ایک تو احسان چاچو کا ہے جو کہ بند پڑا ہوا ہے دوسرا فیضان چاچو کا ہے۔ وہ یہیں رہتے ہیں۔ بچے البتہ تایا ابا کے گھر میں ہوتے ہیں۔"
"اور آپ یہاں بڑے ابا کے ساتھ ہوتی ہیں۔ آپ کی شادی وغیرہ نہیں ہوئی کیا؟" وہ بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھی تھی۔ وہ اداسی سے مسکرائیں۔
"ہوئی تھی مگر شادی کے چوتھے سال ہی حسام اللہ کو پیارے ہوگئے تھے' تب میں یہاں آگئی تھی۔ یہ پورشن میرے اماں ابا کا تھا۔ ان دونوں کے انتقال کے بعد میں اور بڑے ابا یہیں رہتے ہیں۔"
"اوہ! آئم سوری آپی!" اسے حقیقتاً" دکھ ہوا تھا۔
"اٹس اوکے؟" وہ اپنی نم آنکھیں صاف کرتی مسکرائیں۔
لنچ ٹائم تک بڑے ابا بھی واپس آگئے تھے۔
"شاہان نہیں آیا؟" آپی کے پوچھنے پر انہوں نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔
"نہیں! اسے ذرا آگے کام تھا۔ آجائے گا دو تین گھنٹوں تک۔"
وہ دو تین گھنٹوں تک تو نہیں' تقریباً" مغرب کے قریب آیا تھا۔
"آپی!" اس نے اندر آتے ہی زینب کو آواز لگائی

"جلدی سے کھانا لگوائیں۔۔۔ بے حد بھوک لگی ہے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"
وہ سر ہلا کر کچن کی جانب آگئیں جبکہ ریحا خاموشی سے صوفے پر بیٹھی تھی وہ فریش ہو کے آگیا تھا۔
"تایا ابا چلے گئے؟" کھانا کھاتے ہوئے اس نے زینب سے پوچھا۔
"ہاں! دوپہر کو ہی چلے گئے تھے۔" پھر کھانا کھاتے ہی وہ اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ کافی دیر تک زینب آپی کے ساتھ بیٹھی رہی۔ ابھی اس کا دل بیڈ روم میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر زینب آپی کو صبح جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ وہ معذرت کر کے اٹھ گئیں تو ناچار اسے بھی اپنے کمرے میں جانا پڑا۔
وہ اندر داخل ہوئی تو وہ کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ وہ سیدھی چلتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو وہ نیم دراز سا موبائل کان سے لگائے ہوئے تھا۔
"زہے نصیب۔۔۔ جو آج آپ نے ہمیں یاد کرلیا۔" اس کی آواز بے حد فریش تھی۔
"ہم آپ کو بھولے ہی کب تھے' جو یاد کرنے کی نوبت آتی۔۔۔ اور ویسے بھی کیا آپ کو معلوم نہیں آپ بھلائے جانے والوں کے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے۔" شاہان نے اسپیکر آن کیا ہوا تھا۔ اس لیے ریحا کو دوسری طرف کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ یہ بات سن کر وہ مسکرایا۔
"تو پھر اتنے دن کی غفلت کیوں؟"
"ہم نے سوچا" آپ مصروف ہوں گے۔۔۔ آپ کو ڈسٹرب کیا کرنا۔ وہ تو مبارک باد دینی تھی۔"
"تو تمہیں معلوم ہوگیا؟" اس کے سوال پر دوسری جانب ہنسی کا جلترنگ بجا تھا۔ جو پاس ہی خاموشی کی کروٹ کے بل لیٹی ریحا علی کے کانوں تک بھی پہنچا تھا۔
"کیا کیا جائے صاحب' جو دل کے قریب ہوں ان کی خیر خبر تو رکھنی پڑتی ہے نا۔" روحینہ کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ اترا۔
"ارے! آپ کو کیا لگتا ہے ہم آپ سے انجان رہ

سکتے ہیں۔" آج وہ بھی دل لگی پر اتر آیا تھا۔
"تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔"
اس نے قہقہہ لگایا۔
"تو اس بار بھی بازی آپ نے مار ہی لی؟" اس نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔
"ہم سے جیتا ہے' نہ جیتے گا کوئی
وہ تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں ماتیں اکثر۔"
ایک گہری نگاہ ریحا پر ڈال کر اس نے شعر پڑھا تو وہ سلگ اٹھی۔ اسے معلوم تھا' یہ معنی خیز گفتگو اسی کے متعلق تھی۔
"صحیح" دوسری طرف سے متاثر ہوتے ہوئے اعتراف کیا گیا تھا۔ "ویسے مزاج تو بخیر ہیں نا؟" روحینہ نے تجسس سے ریحا کے رویے کے متعلق پوچھا تھا۔
"نہ بھی ہوں تو ہمیں کرنا آتے ہیں جناب!" مسکرا کر کہتا' وہ ریحا کو اندر تک جھلسا گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔
وہ بہت محظوظ ہوتے انداز میں مسکرایا تھا۔
"ذرا نرمی سے۔۔۔ نازک مزاج لوگوں سے نرم انداز اپنانا چاہیے۔" روحینہ نے نرمی سے نصیحت کی۔
"کسی پروا؟" انجان بنتے اس نے دریافت کیا تھا۔
"کیا کہیے صاحب! آپ سے وابستہ ہر شے ہمارے لیے اہم ہے اور ہم دل سے اس کی قدر اور پروا کرتے ہیں۔"
"چلیں! آپ کی مانتے ہوئے ہم ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گے؟" معصوم سے انداز میں کہا گیا' روحینہ کھلکھلا کے ہنسی۔
"جائیے صاحب! جیسے ہم جانتے نہیں۔ من مانی آپ کی عادت نہیں' فطرت ہے۔"
"کیا کیا جائے کہ آپ دور ہو کر بھی مزاج آشنا ہیں اور جو پاس ہیں' وہ انجان ہی نہیں' بے نیاز بھی ہیں ہم سے۔" بہت بے نیاز لہجے کے کسی کونے سے ہلکا سا ملال ٹپکا تھا۔

☼ ☼ ☼

دوسرے روز وہ واپس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔
"اتنے جلدی جا رہے ہو؟" زینب آپی کے پوچھنے پر وہ مسکرایا۔
"جانا تو ہے آپی! کچھ کمانے کی بھی فکر کرنی ہے نا۔ کمائیں گے نہیں تو کھائیں گے کہاں سے؟" اس کے بے چارگی سے کہنے پر زینب آپی نے اسے گھورا۔
"ریحا کو بھی ساتھ لے جاؤ نا۔" ان کے کہنے پر اس کی پیشانی پر ہلکی سے سلوٹ ابھری۔
"جب وقت آئے گا تو ضرور۔۔۔" اس کے کہنے پر انہوں نے گہری سانس لی تھی۔
"اوکے کوشش کرنا۔۔۔ جلدی لے جاؤ۔"

☼ ☼ ☼

گہری ہوتی شام میں وہ لان کے آگے بنی تین سیڑھیوں میں سے سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پندرہ دن ہوگئے تھے اسے یہاں اس حویلی میں مقید ہوئے اور نجانے کب تک رہنا تھا۔
"شاید تمام عمر۔۔۔" اس نے بے اختیار جھرجھری لی اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا تو وہ آج حورعین کی شادی میں شرکت کے بعد اپنے گھر واپس آتی اپنی فیملی کے ساتھ۔۔۔ مما اور نیہا کو وہاں شادی کے واقعات سناتی۔۔۔ وہ سب انجوائے کرتے۔ پاپا کے ساتھ باہر جا کر آئس کریم یا کافی انجوائے کرتے۔ کیا زندگی ایسی ہی ہوتی ہے جیسے اب ہے۔ یقیناً" نہیں۔
"زندگی ہمارے ساتھ بعض دفعہ کتنی بڑی ناانصافی کر جاتی ہے نا۔" اس نے گہری پڑتی شام سے پوچھا تھا۔
"پاپا۔ آپ نے مجھے کیسی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ کیا زندگی یوں بھی گزر سکتی ہے؟" اس نے تھک کر سوچا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

☼ ☼ ☼

شاہان کو گئے تقریباً" بیس دن ہو چکے تھے اور اس نے ایک دو بار بڑے ابا کو کال کر کے خیر خیریت معلوم کی تھی اور بس... ریحا پورا دن بولائی بولائی پھرتی تھی۔ وہ گھومنے پھرنے والی ایک زندہ دل لڑکی تھی۔ جسے شاہان علی نے یہاں اس پنجرے میں قید کر دیا تھا اور اب خود بھی بھولے بیٹھا تھا۔ وہ ابھی تک اس حویلی کے طرز زندگی کی عادی نہیں ہو سکی تھی۔

مما اور نیہا سے اس کی تقریباً" روز ہی بات ہوتی تھی۔ وہ اسے وہاں سے نکل آنے کے مشورے دیتی تھیں۔ وہ بس خاموشی سے سنے جاتی تھی مگر ان مشوروں پر عمل کرنا اتنا آسان کہاں تھا۔ پاپا نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس رشتے کو نبھائے گی اور اس نے ان سے وعدہ کر لیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

☼ ☼ ☼

ریحا اور زینب دونوں ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی۔ کسی ٹی وی چینل کی برتھ ڈے سلیبریٹ کی جا رہی تھی۔ خوب صورتی سے سجائے گئے سیٹ پر بیٹھے فنکار، گلوکار، فیشن ڈیزائنر اور ان کے ساتھ بیٹھی میزبان خاتون، جو اس وقت بے حد گہرے گلے اور بغیر آستینوں کی قمیص کے ساتھ گھٹنوں سے ذرا نیچے تنگ سا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کا لباس خاصا کھلا ڈلا اور بے ہودہ تھا اور ساتھ بیٹھے مردوں کی نظروں میں سے جھلکتی حرص و ہوس۔

"توبہ!" آپی زینب نے جھرجھری لی۔ "کیسی عورت ہے۔ ہم پر تو کوئی غیر ایک نگاہ ڈال لے تو اتنا برا اور عجیب محسوس ہوتا ہے اور یہ اتنے مردوں کی خود پر پڑنے والی گندی غلیظ نگاہوں کے باوجود کیسی اکڑ کر بیٹھی ہے۔"

ان کی بات پر ریحا نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر خود کو جینز کے ساتھ سیاہ قمیص پہنے، گلے سے لپٹا چھوٹا سا اسکارف۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک منظر در آیا تھا۔ بے انتہا رش، ہر طرح کے مرد، ہر طرح کے لوگ اور ان لوگوں کے بیچ چلتی وہ گلابی سیلولیس قمیص اور تنگ سا پاجامہ پہنے لڑکی۔ جس پر نہ جانے کتنے لوگوں کی گندی غلیظ نگاہیں پڑی ہوں گی۔ جیسے ابھی آپی نے ٹی وی اسکرین پر نظر آتی لڑکی کے متعلق کتنی نفرت و حقارت سے بات کی تھی۔ بالکل ایسے ہی بازار میں چلتی ریحا کے متعلق کتنے لوگوں نے اور کس طرح سے بات کی ہوگی۔ وہاں کھڑے لڑکوں نے، مردوں نے پتا نہیں کس طرح اسے ڈسکس کیا ہوگا۔ اس کے ظاہری حلیے کی وجہ سے کتنے لوگوں نے اس کے کردار کو بھی غلط سمجھا ہوگا۔ اسے، اس کے ماں، باپ اس کے خاندان کو گھٹیا سمجھا ہوگا۔ اگر کسی انسان کے ظاہری حلیہ سے اس کے خاندان، اس کے کردار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ تو اب تک اس کے متعلق کیسے اندازے لگائے جاتے ہوں گے۔

"عورت کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس پر اٹھنے والی ہر نگاہ احترام اور عزت میں لپٹی ہوئی ہو۔" زینب آپی کے کہنے پر وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے گاؤں سے آئے تقریباً" مہینہ ہو گیا تھا اور ابھی بھی اس کا حویلی جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ تیار ہو کے نیچے آیا تو احسان صاحب ناشتے کی میز پر اس کے منتظر تھے۔

"گاؤں کب جا رہے ہو؟" ان کے استفسار پر اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"فی الحال کوئی پروگرام نہیں۔ کیوں، آپ جا رہے ہیں؟" جواب دیتے ساتھ ہی اس نے پوچھا تھا۔

"میرا نہیں، تمہارا جانا ضروری ہے۔ جسے اپنا پابند بنا کے وہاں چھوڑ آئے ہو۔ کچھ اس کی بھی خبر لو۔ ہیوی ہے وہ تمہاری۔ اس کا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری

ہے۔" ان کی بات سن کر وہ ہنس پڑا۔

"ایسی باتیں آپ کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں بابا! سوا پنا اور میرا ٹائم ضائع مت کیجیے۔"

وہ ہنس کر کہتا چلا گیا تھا اور وہ ششدر سے بیٹھے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے چند جوڑے، جو اس کے پاس تھے، بکھرائے بیٹھی تھی۔ جینز شرٹس اور شادی اٹینڈ کرنے کے لیے جو ڈریسز بنوائے تھے، سب ہی آدھی آستینوں اور بغیر آستینوں کے تھے اور وہ جو اب تک اسی طرح کے لباس بہت خوشی اور پسند سے پہنتی تھی۔ اب یہی لباس پہننے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی۔ مگر ہوتا ہے نا! بعض دفعہ کوئی ایک لمحہ، کوئی ایک بات، کوئی ایک واقعہ انسان کی سوچ کی تبدیلی کی وجہ بن جاتا ہے۔ ایسا ہی اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہی کپڑے جو وہ اب تک پہنتی آئی تھی۔ اب وہی بے ہودہ اور نحش لگ رہے تھے۔

"ارے ریحا! کیا کر رہی ہو؟" زینب نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ اس نے جواباً" اپنی مشکل بتائی تھی۔

"تو پرابلم ڈیئر۔ ابھی شاہان کو کال کرتے ہیں کہ اپنی مسز کے لیے زبردست سی شاپنگ کر کے لاؤ۔" زینب نے چٹکی بجائی۔

"نہیں پلیز۔ اس سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے فوراً" سے پیشتر منع کیا تھا۔

"ارے! ضرورت کیوں نہیں؟ مسز ہو تم اس کی ذمہ داری ہو۔" اس کے منع کرنے کے باوجود زینب نے شاہان کو کال ملا لی تھی۔ وہ زینب کو سیل پر مصروف چھوڑ کر باہر آ گئی تھی۔

سامنے ہی شاہان کے بڑے ابا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ چادر جو شاہان نے پہلے دن اسے دی تھی سلیقے سے اوڑھ رکھی تھی۔ مزید درست کرتے انہیں سلام کیا تھا۔ وہ شفقت سے مسکراتے جواب میں سر ہلانے لگے تھے۔

"ہاں بھئی! وہ نالائق کب تک آئے گا؟" انہوں نے شاہان کے متعلق پوچھا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ جواباً" کچھ کہتی زینب چلی آئی تھیں۔

"ریحا! یہ لو شاہان تمہارا ناپ وغیرہ پوچھنا چاہ رہا ہے۔" زینب نے زبردستی موبائل اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ بڑے ابا کی وجہ سے اس نے سیل کان سے لگا لیا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ سامنے دیوار پر دے مارے۔

"زینب آپی بھی نا..." بہت کوفت سے اس نے سوچا تھا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" بڑے ابا اور زینب آپی کی وجہ سے اسے ناچار کہنا پڑا۔

"اگر میں کہوں کہ تمہاری تمام تر بددعاؤں اور کوسنوں کے باوجود بالکل ٹھیک اور اچھا تو..." بھاری آواز میں کہتا وہ اسے سلگا گیا۔

"تو میں کہوں گی کہ آپ واقعی بہت سخت جان ہیں۔ بالکل اپنے سخت دل کی طرح۔" سائیڈ پر آ کر اس نے بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ اس نے قہقہہ لگایا۔

"تم کیسی ہو؟"

"اگر میں کہوں، آپ کے تمام مظالم کے باوجود زندہ اور بہت خوش۔ تو..." اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"میں تو خود یہی چاہتا ہوں کہ تم زندہ اور خوش رہو۔" مسکراتے لہجے میں اس نے کہا تو لب بھنچ گئے۔ پھر اس نے اس سے ناپ وغیرہ پوچھا تھا۔

"میں تمہارے لیے شاپنگ کر لوں گا۔ مگر کیا تم اسے قبول کر لو گی؟" اس کے لہجے کے طنز کو بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا اس نے۔

"کیا کروں اس کے سوائے کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔" چڑ کر کہتے اس نے فون کر دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن ہی وہ بے تحاشا شاپنگ بیگز کے ساتھ حویلی آ پہنچا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اتنے دن کیوں لگائے شاہان۔ پتا ہے کتنا مس کیا ہم نے تمہیں۔" آپی زینب کی بات پر اس نے ایک گہری نظر سپاٹ سا چہرہ لیے ریحا پر ڈالی۔

"واقعی؟" گہری نظر سے اسے دیکھتا وہ آپی سے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل۔۔۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے آپی! آپ کے بھائی کو ہر جگہ ہی مس کیا جاتا ہے۔" گاہے بگاہے اس پر نظر ڈالتا وہ آپی سے بول رہا تھا۔

"کتنا خوش فہم بندہ ہے تو بہ!" دل ہی دل میں اس نے کوفت سے کہا۔

☼ ☼ ☼

"تو کرلی تم نے اپنی مرضی؟ دکھادی ہٹ دھرمی؟ تم نے ثابت کردیا شاہان! کہ تم احسان علی کے بیٹے ہو۔" فون سے آتی آواز میں بے انتہا غصہ تھا۔

وہ اپنی ماں کی بات پر تلخی سے مسکرایا۔

"نہیں ڈیر مما! میں نے ثابت کردیا کہ میں حمیرا علی اور احسان علی کی اولاد ہوں۔ ان ہی کی طرح ضدی' انا پرست اور صرف اپنے لیے سوچنے والا۔ آپ ہر مرتبہ مجھے ہی کہتی ہیں نا کہ میں ضدی ہو۔ انا پرست ہوں۔ مجھے جھکنا نہیں آتا۔ میں اپنی ذات سے ہٹ کر بھی کسی دوسرے کے متعلق نہیں سوچ سکتا؟ تو مما جان یہ سب کچھ تو میں نے اپنے والدین سے سیکھا ہے۔ اپنے باپ سے ضد لی ہے میں نے۔۔۔ تو اپنی ماں سے انا بھی لی ہے ——— صرف اپنے متعلق سوچنا بھی میں نے آپ سے سیکھا ہے۔ اپنی ذات کے متعلق سوچتے آپ نے ایک بار بھی اس آٹھ سال کے بچے کے متعلق سوچا تھا' جو کوئی اور نہیں۔۔۔ آپ کا اپنا بیٹا تھا۔ آپ کا اپنا خون۔ کس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آپ وہاں سے نکل آئی تھیں۔ اپنی انا' اپنی ضد کے باعث ایک بار بھی آپ نے نہیں سوچا' آپ کا بیٹا کس کے سہارے رہے گا۔ اس کا خیال کون رکھے گا۔ اس کے کھانے پینے اس کی اسکولنگ' اس کی تربیت' ان سب چیزوں کی فکر کون کرے گا۔ وہ آٹھ سال کا بچہ جو اپنی ماں سے لپٹ کر سوتا ہے' اپنی ماں کے جانے کے بعد رات کو ڈر لگنے پر کس کے ساتھ لپٹ کر سوئے گا؟ اسے جب چوٹ لگے گی تو روتا ہوا کس کے پاس جائے گا۔ جس ضدی شخص کو آپ نے چھوڑا تھا تو اپنے بیٹے کو اس شخص کے پاس کیوں چھوڑ دیا۔ ایک پل بھی یہ نہیں سوچا کہ وہ ضدی انسان آپ کے بیٹے کی کیسی تربیت کرے گا۔ مگر نہیں آپ کو صرف اپنی ذات سے غرض تھی۔ یہ خود غرضی میں نے اپنی ماں کے عمل سے ہی سیکھی تھی۔ آپ کہتی ہیں میں سخت دل ہوں۔ کیا کبھی آپ نے سوچا' مجھے ایسا کس نے بنایا؟"

بہت ٹوٹے ہوئے انداز میں کہتا وہ فون بند کرچکا تھا۔ باہر کھڑی ریحا دبے پاؤں واپس مڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ مدہوش سا بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ حرام مشروب پینا اس کی عادت تھی یا نہیں' مگر آج اس نے اپنے اندر پھیلے غم سے گھبرا کر پی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ بے خبری سے سوئے شاہان کی آنکھیں بند تھی۔ اس کے سیاہ بال اس کے ماتھے پہ بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے چہرے پر ہر وقت پھیلی مغروریت اور سختی اس وقت مفقود تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا دلکش چہرہ اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ آج اس سے وہ شاہان علی کے لیے اپنے دل میں نفرت نہیں' کچھ اور محسوس کررہی تھی۔ ترحم' ہمدردی۔۔۔ پتا نہیں کیا۔ آج وہ اس کے اندر چھپے ایک دوسرے شخص سے انجانے میں ہی آگاہ ہوئی تھی اور اس آگاہی نے اسے عجیب سے محسوسات سے دوچار کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ بالکل نارمل سا اٹھا تھا اور ناشتا کرتے ہی واپسی کے لیے پر تول رہا تھا۔

"کچھ دن تو رہتے نا یار! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔"

بڑے ابا کے اصرار پر وہ انہیں اپنی مجبوری بتانے لگا انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ریحا نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ بڑے ابا کے ساتھ بیٹھا وہ وہی مغرور سا شاہان تھا۔

☼ ☼ ☼

رات سے لے کر اب تک وہ یوں ہی ایک زاویے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ عجیب ٹوٹے انداز میں۔۔۔ کسی نے ان کی پوری ہستی کو ہلا دیا تھا۔ کون؟ ان کا اپنا بیٹا۔ اپنا خون۔ جسے انہوں نے ہمیشہ احسان علی کا بیٹا جانا۔ اپنی کوکھ سے جنم دینے والے بیٹے کو انہوں نے صرف احسان علی کا خون جانا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھیں۔ وہ احسان علی کا خون ہے۔ اسی کی ضد' اسی کی انا لے کر وہ اس دنیا میں آیا ہے۔ سو جب احسان علی کو چھوڑا تو اس بیٹے کو بھی چھوڑ دیا۔ جو ان کا اپنا سگا بیٹا تھا۔ انہیں ہمیشہ لگتا تھا' ان کے ساتھ ظلم ہوا' زیادتی ہوئی۔ احسان علی نے حمیرا علی کے ساتھ زیادتی کی' ظلم کیا' پر آج انہیں لگ رہا تھا' زیادتی' ظلم اور ناانصافی تو احسان علی اور حمیرا علی نے کی اپنے بیٹے شاہان علی کے ساتھ۔ جس کے چند الفاظ نے ان سے ان کی ذات کا زعم چھین لیا تھا۔ وہ پورے قد سے ڈھے گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

حمیرا اپنے ماں' باپ کی سب سے آخری اولاد تھیں۔ ان سے پہلے ان کے دو بڑے بھائی تھے۔ سرفراز اور شہزاد۔ حمیرا شروع سے ہی اپنے ماں' باپ کے ساتھ بھائیوں کی بھی لاڈلی تھیں اور اسی لاڈ پیار کے باعث وہ کچھ لاپروا سی تھیں۔ ماں' باپ کی شفقت کے سائے تلے پلتے کب بچپن چھوٹا اور جوانی نے انگلی تھامی۔ پتا بھی نہ چلا تھا۔ ہاں! مگر ان کی اٹھان غضب کی تھی۔ گوری رنگت' بڑی بڑی آنکھیں' ریشمی زلفیں اور لانبا قد۔ وہ بے حد حسین تھیں۔ تب ہی تو پہلی نظر پڑتے ہی احسان علی دل ہار گئے تھے۔

احسان اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ کچھ کھلنڈری اور لاپروا طبیعت کے ساتھ بلا کے ضدی بھی تھے' جو ٹھان لیتے بس کر گزرتے تھے۔ نہ راہ میں آنے والی مشکلوں کی فکر' نہ نتیجہ کی پروا۔ جو من میں آتا۔ بس وہی کر گزرنے کی دھن لگ جاتی تھی۔ حمیرا علی کو دیکھنے کے بعد فوراً" ماں' باپ سے ضد کی کہ شادی کرنی ہے تو بس حمیرا سے۔

حمیرا' ابا کے گہرے دوست کی بیٹی تھی' جن کی شرافت اور انداز کے وہ خود بھی معترف تھے۔ خود حمیرا بھی انہیں بے حد پسند تھی۔ مگر احسان کی طبیعت کے پیش نظر وہ رشتہ مانگنے سے ہچکچا رہے تھے۔ مگر احسان اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ تب مجبوراً" ابا اور اماں جان کو اپنا دست سوال دراز کرنا پڑا تھا۔ حمیرا کے والد کو اپنے دوست سے زیادہ عزیز بھلا کون تھا۔ تب ہی جھٹ سے اپنی لاڈلی کا ہاتھ احسان علی کے ہاتھ میں دے دیا۔ بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی اور شادی کے بعد احسان علی کو پتا چلا تھا کہ محبت کی راہ میں وہ تنہا نہیں' بلکہ حمیرا بھی ان کے ساتھ ہم سفر ہیں۔

زندگی کی خوشیوں میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ جب چاند سے چہرے والا شاہان علی نعمت بن کر ان کے گھر آنگن میں اترا تھا۔ کتنے دن تک خوشیاں منائی جاتی رہی۔

شاہان علی کی صورت خدا نے جو انہیں تحفہ دیا تھا۔ اسے پاکر حمیرا اللہ کے حضور شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔ اس کے ساتھ لگ کر اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے وہ اپنے ساتھ ساتھ احسان سے بھی کچھ غافل سی ہوگئیں۔

مسئلہ یہیں سے شروع ہوا تھا۔ ننھے شاہان کو سلا کر وہ خود ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ احسان ابھی تک گھر واپس نہیں آئے تھے۔ پچھلے چند دنوں سے وہ لیٹ آنے لگے تھے۔ شاہان کی طبیعت پچھلے کچھ دنوں سے خراب رہی تھی۔ سو وہ توجہ نہ دے سکیں۔ مگر آج۔۔۔ ساڑھے بارہ سے اوپر کا وقت ہورہا تھا۔ مگر احسان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ پریشانی سے کبھی وال کلاک اور کبھی بند دروازے کو دیکھتی تھیں۔ ڈیڑھ بجے احسان

WWW.PAKSOCIETY.COM

واپس آگئے۔ مگر بیگانہ ہونے حواس اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ۔۔۔ حیرتوں کے کئی پہاڑ حمیرا پر ٹوٹے تھے۔

"احسان آپ نے نشہ کیا؟" حیرت سے وہ انہیں دیکھ رہی تھیں۔ جو آتے ساتھ ہی بے سدھ پڑے تھے۔ دوسرے دن انہوں نے حمیرا سے معافی تلافی کی تھی۔

"آئم سوری یار! وہ دوستوں نے زبردستی پلا دی۔ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

ان کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ مگر وعدہ تو ہوتا ہی ٹوٹنے کے لیے ہے' سو بہت جلد ٹوٹ گیا اور پھر یہ ان کا معمول بن گیا۔ ہر دوسرے' تیسرے دن وہ ہوش و حواس گنوائے گھر لوٹتے۔ پہلے پہل تو معافی بھی مانگ لیتے۔ شرمندہ ہوتے۔ مگر اب اکھڑنے لگے تھے۔

"ہاں کرتا ہوں نشہ' کرلو جو تم نے کرنا ہے۔" حمیرا کے کچھ کہنے پر وہ ہتھے سے اکھڑے تھے۔ "بیوی ہو بیوی بن کر رہو تو بہتر ہے۔ ورنہ۔۔۔"

بہت غصے سے دھمکی دیتے وہ باہر نکل گئے۔ تب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

انہی دنوں جب شاہان پانچ سال کا تھا۔ حمیرا کو اپنی والدہ کی بیماری کی اطلاع ملی تھی۔ وہ فوراً" چلی آئیں۔ اماں نے بہت محبت سے ان سے اپنی آخری خواہش بیان کی تھی۔ ریحا کو اپنی بہو بنانے کی' جو چار سال کی تھی۔ تب سرفراز بھائی کے ساتھ حمیرا نے بھی اپنی ماں کی آخری خواہش پر سر جھکا دیا تھا۔ حویلی سے بہت دھوم دھام کے ساتھ وہ لوگ آئے تھے اور ریحا کا نکاح شاہان کے ساتھ کر دیا گیا۔ اس رشتے سے سب ہی بہت خوش تھے۔ خود حمیرا بھی جن کی جان اپنی پیاری سے بھتیجی میں تھی۔ اماں کے انتقال کے بعد وہ تین ماہ تک ابا کے گھر رہی تھیں۔ اس عرصے میں احسان فقط چند بار ہی ان سے ملنے آئے تھے۔ تین ماہ بعد وہ سوگوار سی لوٹ آئیں۔

احسان کی ابھی تک وہیں روش تھی۔ بلکہ اب ان کی ضد' ان کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گھر میں آئے روز جھگڑے ہونے لگے۔ احسان اگر ضدی تھے تو کم وہ بھی نہیں تھیں۔ ماں' باپ نے بہت لاڈ پیار سے پرورش کی تھی۔ کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے نہ چھوا تھا تو اب وہ احسان کی جلی کٹی کیسے سن لیتیں یا ان سے دب جاتیں۔ دوبدو لڑائی ہوتی۔ ان دونوں کے جھگڑوں کی وجہ سے شاہان بہت سہما سہما رہتا۔ وہ بہت چپ چپ رہنے لگا تھا۔ مگر دونوں کو ہی پروا کب تھی۔

جانے ان کے بیچ سے وہ محبت کہاں اٹھ گئی تھی' ایک دن وہ گھر لوٹے تو نہ صرف نشے میں تھے' بلکہ حمیرا کا حق بھی کسی اور کی جھولی میں ڈال آئے تھے۔ تب حمیرا نے آخری فیصلہ کر لیا۔ بہت غصے سے احسان علی کے گھر کو چھوڑتے ہوئے انہوں نے شاہان کو بھی چھوڑ دیا۔

"اگر گھر سے قدم نکالا تو شاہان کو بھول جانا۔" احسان علی نے دھمکی دی۔

"ہاں! بھول جاؤں گی۔ وہ بھی تمہارا بیٹا ہے' تمہارا خون' تمہارے جیسا ہی ہوگا۔" غصے سے اپنا سامان نکالتے انہوں نے بھی چلا کر کہا۔

ان کے آنے کے بعد شاہان اکثر انہیں فون کر کے روتے ہوئے ان سے واپس آنے کی منت کرتا تھا۔

"مما پلیز واپس آجائیں' مجھے آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔" وہ روتے ہوئے ان سے التجا کرتا۔

"مما! پاپا رات کو لیٹ آتے ہیں اور مجھے تنہا سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ آپ واپس آجائیں' پلیز مما۔"

مگر حمیرا پر ان کی انا چھا گئی تھی۔ وہ کیوں واپس جائیں۔ احسان علی جیسے ضدی انسان کے ساتھ انہیں اب اپنی زندگی نہیں گزارنی۔ ہٹ دھرمی سے سوچتی وہ شاہان علی کو بھلائے ہوئے تھیں۔ اپنی انا کے پرچم کو بلند رکھنے کے لیے انہوں نے اپنے شاہان علی کو چھوڑ دیا۔

کیسی ماں تھیں وہ؟ مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں بھلا؟ مائیں تو اپنے اولاد کے لیے اپنی زندگی' اپنی خوشی' اپنا آرام' اپنا چین' سکون سب تج دیتی ہیں۔ اپنی ذات پر

بہت سے عذاب سہ جاتی ہیں کہ ان کی اولاد سکون سے رہے۔ مگر وہ کیسی ماں تھیں؟

شروع شروع میں شاہان انہیں فون کرتا۔ ان کی منتیں کرتا۔ ان سے واپس آنے کی التجا کرتا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ جیسے ان سے مایوس ہو گیا۔ وہ اسے تسلی دیتی تھیں۔ اسے فون پر پیار بھی کرتی تھیں۔ مگر وہ اس کی باتیں مان نہیں سکتی تھیں۔ تب اس نے بھی ان کے بغیر جینا سیکھ لیا تھا۔ پر یوں تنہا جیتے جیتے وہ بہت سخت ہو گیا تھا۔ انا پرست اور ضدی من مانی کرنے والا تب وہ جب بھی اس کی ضد کی' اس کی ہٹ دھرمیوں کی کوئی نہ کوئی داستان سن کر خود اسے کال کرتی تھیں" تو تم ثابت کر رہے ہو اپنے ہر عمل سے شاہان علی کے تم احسان علی کے بیٹے ہو۔" وہ ان کے طنز' ان کی تلخ کلامی سنتا اور خاموش رہتا تھا۔ مگر آج جانے کیا ہو گیا تھا کہ اس نے انہیں آئینہ دکھا دیا تھا اور اس آئینے میں نظر آتی اپنی شکل انہیں اتنی بھیانک نظر آرہی تھی کہ وہ اسے ایک نظر نہیں دیکھ پا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اسے شہر گئے دو دن ہو گئے تھے اور اس کے جانے کے بعد بھی وہ اسی کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ شاہان علی جس سے اس کا نکاح چار سال کی عمر میں کر دیا گیا تھا۔ چار سال کی وہ بچی جسے اس وقت لفظ نکاح کا مطلب بھی نہیں پتا تھا اور شاہان علی جو اس کی پھپھو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جو بہت پہلے اپنی مما کے ساتھ ان کے گھر آیا کرتا تھا۔ جس کے ساتھ وہ کھیلتی تھی۔ جو اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ مگر پھر پھپھو ان کے گھر آکر رہنے لگی تھیں۔ مگر شاہان ان کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ پھر وہ ان کے گھر کبھی نہیں آیا تھا۔ کیوں؟ یہ سوال اس نے بہت دفعہ مما سے' پھپھو سے' پاپا سے پوچھا تھا۔ مگر انہوں نے کوئی ایسا جواب نہیں دیا تھا جو اس کی تسلی کروا سکتا۔ میٹرک تک آتے آتے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا نکاح اس کے پھپھو زاد شاہان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ شاہان کیسا ہے۔ اس کا مزاج وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ بہت پہلے ان کے گھر آیا تھا اور اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ اس کی شکل تک بھول چکی تھی۔ اس کے مستقبل کو لے کر پھپھو اور مما دونوں ہی پریشان رہتی تھیں۔ پھپھو جو شہزاد چاچو کی فیملی کے ساتھ لاہور چلی گئی تھیں وہاں سے فون کر کے اکثر بھائی کو ریحا کی جان شاہان سے چھڑوانے کا کہتی تھیں۔

"وہ تمہارا بیٹا ہے حمیرا؟" ایک بار پھپھو کی کسی بات کے جواب میں انہوں نے کہا تھا۔

"نہیں ہے وہ میرا بیٹا۔ وہ احسان علی کا بیٹا ہے۔ اسی جیسا انا پرست' اکھڑ مزاج۔۔۔ میری زندگی تو تباہ ہو گئی۔ مگر میں ریحا کی زندگی تباہ نہیں ہونے دوں گی۔"

کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ ان کی باتوں سے ریحا کے ذہن میں شاہان علی کا جو خاکہ بنا تھا اس میں رنگ زبیدہ آنٹی کے بیٹے فرہاد بھائی کی شادی میں خود شاہان نے ہی بھرے تھے۔ وہ ایک اور کزن کے ساتھ کھڑی باتوں میں مشغول تھی۔ جب سفید کاٹن کے لباس میں ملبوس اونچا پورا شاہان علی اس کے سر پر آکھڑا ہوا تھا۔

اس نے کئی تقریبات میں اسے دور سے دیکھا تھا۔ مگر یوں قریب سے دیکھنے پر وہ اس کی شان دار وجاہت سے متاثر ہو گئی تھی۔ وہ اپنی سبز آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ نظریں جھکا گئی تھی۔ تب اس نے انتہائی سرد آواز میں اسے اندر جانے کا کہا تھا۔ تلخ انداز میں غصہ سے بولتا شاہان علی اسے حیرت کے سمندر میں دھکیل گیا تھا۔

اور اس کے بعد وہ لوگ جتنی بار بھی ملے شاہان علی کے سرد و مغرور انداز نے اس کے اندر غصہ بھرا تھا۔ وہ اس سے چڑنے لگی تھی۔ اس کی روک ٹوک سے اسے غصہ آنے لگا تھا۔ وہ کون ہوتا تھا اسے یوں روک ٹوک کرنے والا؟ اس نے غصے سے مما سے پوچھا تھا اور یہی بات مما نے پاپا سے کہی تھی۔

"P بھی سے اس کا یہ حال ہے۔ مجھے اپنی بیٹی کو حمیرا کی طرح عذابوں کے حوالے نہیں کرنا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ ☆ ☆

وہ کب سے اس کی شان دار سی تصویر پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ تو کیا شاہان علی کے مزاج کی تلخی اس کے اندر کی تشنگی کی وجہ سے ہے۔ ماں، باپ کی عدم توجہ نے اسے ایسا بنا دیا ہے؟ وہ تنہا بیٹھی شاہان علی کی ذات کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی۔

"وہ ایسا کیوں ہے آپی؟" وہ اس نے الجھن زینب کے سامنے رکھ دی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے ریحا؟" انہوں نے جواباً اس سے پوچھا۔

"میں اس کی ذات کے بہت سارے پہلوؤں سے آگاہ نہیں، آپ تو سب جانتی ہیں نا۔" اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پتا ہے ریحا! یہ جو میاں، بیوی کے لڑائی جھگڑے، ان کی ناچاقی ہوتی ہے نا، یہ خود ان کی زندگی تو ڈسٹرب کرتی ہے، مگر یہ سب سے زیادہ اور برا اثر ان کی اولاد پر ڈالتی ہے۔ ماں، باپ کے لڑائی جھگڑے، بچوں کی نفسیات پر، ان کے ذہن پر کتنا برا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ والدین جان جائیں تو بہت کچھ برداشت کرلیں۔ خاموشی سے سہ لیں۔۔۔ مگر یوں کبھی دوبدو لڑائی نہ کریں، والدین کے درمیان ہونے والی جنگ چاہے انا کی ہو، حقوق کی ہو، معاشی یا گھریلو مسائل کی وجہ سے ہو، بچوں پر دو طرح سے اثر ڈالتی ہے۔ ایسے بچے جن کے ماں، باپ یوں آپس میں اختلاف کے باعث لڑیں جھگڑیں، ایسے بچے یا تو بہت دبو قسم کی شخصیت بن کے ابھرتے ہیں۔ وہ زندگی اور اس کی مشکلات کا مقابلہ نہیں کرپاتے یا پھر وہ بہت نڈر، جھگڑالو، ضدی قسم کے انسان بن کر ابھرتے ہیں جن کے دل میں کسی دوسرے کے لیے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی غرض کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں ہی خطرناک ہوتی ہیں۔

شاہان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ بھی اپنے والدین کے اختلاف، ان کے لڑائی جھگڑوں کی نذر ہوا۔ تمہیں پتا ہے جب حمیرا چاچی روٹھ کر گئی تھیں، تب بڑے نے احسان چاچو کو اتنا سمجھایا تھا کہ وہ چاچی کو منا کر لے آئیں۔ مگر وہ ضد پر اڑ گئے تھے کہ خود گئی ہے، خود ہی آئے اور بیوی کو کیا حق کہ وہ شوہر سے یوں ضد لگائے۔ کاش وہ یوں ضد نہ باندھتے یا چاچی ہی کچھ برداشت سے کام لیتیں تو آج شاہان کی شخصیت اتنے الجھاؤ کا شکار نہ ہوتی۔"

☆ ☆ ☆

انا کی زمین پر رہنے والو، چلنے والو، ٹھہرنے والو!
انا کی زمین پر اونچا سا محل بنانے والو!
اپنی سوچ کے کسی خیال میں یہ بھی رکھنا
انا کی زمین پر گھر بنانے والوں کو اس میں تنہا ہی رہنا پڑتا ہے
اپنا سارا جیون اکیلے ہی جینا پڑتا ہے
انا کی زمین پر محبت کا بیج بونے والو!
اپنی سوچ کے کسی خیال میں یہ بھی رکھنا
انا کی زمین پر لگے محبت کے پیڑ پر
وصل کا پھول کبھی نہیں کھلتا
سو اگر
تنہا نہیں رہنا ہے، اکیلے نہیں جینا ہے
وصل کا پھول کھلانا ہے تو۔۔۔
دیا کوئی جلانا ہے تو۔۔۔
اپنے انتظار کو لاحاصل ہونے سے بچانا ہے تو۔۔۔
انا کی زمین کو چھوڑ کر محبت کی زمین پر آنا ہوگا
میں اور میں کا کھوکھلا نعرہ چھوڑ کر
ہم اور تم کا گیت سہانا گانا ہوگا!

☆ ☆ ☆

عجیب سے دن آگئے تھے۔ خشک اور بیزاری بھرے دن۔ جب سورج کو ڈوبنے کی بہت جلدی ہوتی ہے، جب شام ڈھلتے ہی سیاہ تاریکی ہر چیز اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ جب انسان خوامخواہ ہی اداس پھرنے لگتا ہے۔ وہی دن تھے۔ اداسی بھرے دن اور سلگتی شامیں۔۔۔ وہ بہت خاموش سی بیٹھی پتوں کو درخت سے جدا ہوتا دیکھ رہی تھی۔ یہی پتے جب سبز تھے تو درخت نے کیسے اپنے وجود سے لگا کر رکھے تھے اور جیسے ہی خشک ہوئے تھے کیسے گرا دیا تھا۔ زمین پر قدموں تلے یہ خشک پتے اس کی اداسی میں اضافہ کررہے تھے۔

کون عمر بھر کسی کا ساتھ دیتا ہے فرازؔ
خشک پتوں کو تو درخت بھی گرا دیتے ہیں

شام گہری ہونے لگی تو وہ اٹھ کر اندر آگئی تھی۔ اور اسی رات زینب آپی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے شاہان کو یاد کیا تھا۔

"شاہان کو گئے کتنے دن ہوگئے؟"

"بارہ دن۔" ان کی بات پر بے اختیار ہی اس کی زبان سے نکلا تو وہ خود بھی ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔

یہ اس نے کب سے اس کے جانے کے دن گننے شروع کردیے تھے۔ اس نے خفگی سے اپنے دل سے پوچھا تھا۔

وہ بیڈ کے وسط میں اس کی تصویر رکھے اس پر اپنی نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ جب زینب آپی نے اندر جھانکا۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ قریب آکے بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"شاہان کے بغیر اداس ہو؟" ان کے سوال پر وہ نظر جھکا کر رہ گئی۔

"ایک بات کہوں ریحا! محبت کرو نا تو پھر اسے نبھانے کا ڈھنگ بھی آنا چاہیے۔ محبت احسان چاچو اور حمیرا چاچی نے بھی کی تھی۔ مگر اسے نبھا نہیں پائے۔ مگر تم اسے نبھانا۔" اس نے سر اوپر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"محبت کرتو ہر کوئی لیتا ہے۔ پر اسے نبھانا کوئی کوئی ہے۔ تم ان کوئی کوئی میں شامل ہوجانا۔" اس کی کالی آنکھوں میں یک دم نمی بھری تھی۔ پتا نہیں اپنی محبت کے آشکار ہونے پر یا اپنی بے بسی پر۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، وہ کبھی بدل سکتا ہے؟" بہت مایوسی سے اس نے سوال کیا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرائیں۔

"یہ جو محبت ہوتی ہے نا، اس میں دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ تبدیل ہونے یا تبدیل کرنے کی۔ محبت میں یا تو آپ خود ایسے بن جاتے ہیں جیسا آپ کا محبوب آپ کو دیکھنا چاہتا ہے یا پھر آپ اپنی محبت سے دوسرے کو تبدیل کرلیتے ہیں۔ جیسا آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ محبت تو انسان سے بہت کچھ کروا سکتی ہے اور کروا لیتی ہے۔ بس انسان کو محبت کرنے کا فن آنا چاہیے۔"

☆ ☆ ☆

وہ آج بہت دنوں بعد واپس آیا تھا۔ وہ بھی بڑے ابا کے اصرار پر۔

اور اس بار وہ اسے ساتھ لے کر جارہا تھا اور اس بات پر بڑے ابا اور زینب آپی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بے حد خوش تھی۔ زینب آپی نے اسے ساتھ لگا کر چپکے سے کہا تھا۔

"عورت اگر چاہے نا تو مرد کو اپنی مٹھی میں قید کرسکتی ہے۔ تم بس صبر اور حوصلے کے ساتھ اسے جیتنے کی کوشش کرنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی میں آبیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے شاہان ولا آئے۔ تقریباً ہفتہ ہوگیا تھا۔ ایک بار جا کر وہ مما، پاپا اور نیہا سے بھی مل آئی تھی۔ روتی ہوئی مما کو اس نے بڑے حوصلے اور ضبط کے ساتھ اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے نصیب کے لکھے کو دل سے قبول کرچکی ہے۔ پورا دن سرفراز ولا میں گزار کر وہ واپس شاہان ولا آگئی تھی۔ شاہان علی کی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہ صبح کا گیا رات کو آتا تھا۔ ریحا سے اس کا رویہ بہت لیا دیا اور بے نیازانہ تھا۔ وہ جیسے اسے یہاں لا کر بھول گیا تھا۔ البتہ احسان علی اس کے ساتھ بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

☆ ☆ ☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ باتھ روم میں تھا۔ ریحانے اس کے کپڑے نکال دیے تھے۔ وہ اس کے کپڑوں کا' اس کے کھانے پینے کا' اس کی ضروریات کا خیال رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کی ٹائی' ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ جب وہ باہر آیا تھا۔ ریحا کے ہاتھ میں اس کی ٹائی تھی جو اس نے جھپٹی تھی۔

"میری کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانے یا میرے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" درشتی سے کہتا وہ پلٹ گیا تھا۔ تب وہ آنسو پیتی آگئی تھی۔ جتنا وہ نرمی سے پیش آرہی تھی وہ اتنا ہی تلخ ہوتا جارہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کھانے کی میز پر وہ تینوں موجود تھے۔

"میں نے آج فرسٹ ٹائم بریانی بنائی ہے آپ ٹرائی کرکے بتائیں' کیسی بنی ہے؟" اس نے گرم گرم چاولوں سے بھری ڈش ٹیبل پر دھری تھی۔

"تمہاری بیٹی نے بنائی ہے تو اچھی ہی ہوگی۔" احسان صاحب نے مسکرا کر کہا تھا۔

اپنی پلیٹ میں ڈالنے کے بعد انہوں نے شاہان کی پلیٹ میں ڈالنا چاہا تھا جب اس نے ہاتھ اٹھا کر روکا تھا اور پھر صفیہ کو پکارا تھا۔

"کچھ اور بنا ہوا ہے؟" اس کے پوچھنے پر صفیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ "جی سبزی بنی ہوئی ہے اور۔۔۔"

"ٹھیک ہے میرے لیے وہی لے آؤ۔ ساتھ میں ایک دو روٹیاں بنالینا۔"

وہ جی اچھا کہہ کر چلی گئی تھی۔ ریحا اور احسان صاحب خاموشی سے بیٹھے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ آج پھر پینے میں مصروف تھا۔ ریحا اسے دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا گلاس چڑھاتے وہ نجانے کس بات سے فرار چاہ رہا تھا یا کون سا غم غلط کرنے کی کوشش میں تھا اسے تیسرا گلاس بھرتے دیکھ کر اس سے صبر نہیں ہوسکا تھا تب ہی بستر سے اٹھ کر اس کے ہاتھ میں تھاما ہوا گلاس چھیننے کی کوشش کی تھی۔ شاہان نے بہت حیرت اور پھر غیض سے اسے دیکھا تھا۔

"اپنی حد میں رہو۔" اس نے بے انتہا غصے سے کہا تھا "حد کراس کرنا بھی آپ ہی سے سیکھا ہے۔"

وہ بے خوفی سے بولی تھی۔ آج وہ اس سے اس کے غصے سے ڈری نہیں تھی۔ ٹھیک ہے وہ اس پر غصہ کرے گا چلائے گا تو وہ اپنا یہ شوق پورا کرلے مگر اسے یہ زہر اپنے اندر اتارنے نہیں دے گی۔

"کیا چاہتی ہو؟" سرخی چھلکاتی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"میں نے پوچھا' کیا چاہتی ہو؟" شاہان علی نے اپنی آنکھیں چرالی تھیں۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

پتا نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ سوال کے بدلے سوال کررہی تھی۔

"میں چاہتا ہوں تم ایک پل میں یہاں سے' میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔ گھن آتی ہے مجھ تم سے۔"

شاہان کی بات نے اسے دکھ کی دلدل میں دھکیل دیا تھا پر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

"میرے نزدیک آنے سے آپ کو گھن آتی ہے اس وہ جس سے کوئی تعلق نہیں' وہ دو ٹکے کی عورت۔۔۔" وہ سب جانتی تھی۔ وہ چونکا نہیں۔

"ہاں' وہ دو ٹکے کی عورت تم سے بہتر ہے پتا ہے کیوں۔۔۔" اس کا چہرہ اپنے دائیں ہاتھ سے جکڑ کر اس نے اپنے بے حد قریب کرتے ہوئے پھنکار کر کہا تھا۔

"کیونکہ وہ تمہاری طرح منافق نہیں ریحا علی اس کا باطن بھی اس کے ظاہر جیسا ہے اور کیا سمجھتی ہو یوں اپنا ظاہر بدل کر تم میرے دل میں کوئی جگہ پا سکو ہو۔ کبھی سوچنا بھی مت۔"

ایک جھٹکے سے اسے چھوڑتا وہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا اور پیچھے اپنے دکھوں پر اپنی بے وقعتی پر رونے کے لیے وہ تنہا رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج پھر وہ خاصا لیٹ واپس آیا تھا وہ سامنے ہی کھڑے اس کے واپس آنے کے منتظر تھے۔

"کیوں کررہے ہو ایسا شاہان؟" اس کے روبرو کھڑے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

اس نے کندھے جھٹکے "پتہ نہیں۔"

جس طرح تم کررہے ہو نا ایسے کامیابی نہیں صرف تباہی اور بربادی مقدر بنتی ہے۔" وہ تلخ سے انداز میں مسکرایا۔ "کامیابی کی چاہ بھی کسے ہے؟"

وہ تمہاری ہر زیادتی کے باوجود تمہاری منتظر ہے شاہان مت اذیت دو اسے۔"

انہوں نے بہت تھکے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"میں نے ایک بار پہلے بھی آپ سے کہا تھا ایسی باتیں آپ کے منہ سے اچھی نہیں لگتی بابا جان۔"

اس کی بات پر انہوں نے بہت دکھ بھرے انداز میں اس کی سمت دیکھا تھا۔

"جانتا ہوں۔" وہ تھکے تھکے سے وہیں سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ "اسی لیے چاہتا ہوں جو غلطی میں نے کی وہ تم کبھی نہ کرو' میں تمہیں اس غلطی' غلطی میں چھپی تباہی' تباہی کے بعد ہونے والے دکھ' دکھ میں پوشیدہ پچھتاوے اور پچھتاوے کے بعد ہونے والی مسلسل اذیت سے بچانا چاہتا ہوں اس اذیت سے جو پچھلے کئی برسوں سے میرا مقدر بنی ہوئی ہے میں غلط تھا شاہان اسی لیے آج خالی ہاتھ کھڑا ہوں میں نہیں چاہتا کل تم بھی میری جگہ کھڑے ہو۔"

☆ ☆ ☆

"میں روحینہ سے شادی کررہا ہوں۔" وہ نہ اس سے پوچھ رہا تھا نہ بتا رہا تھا وہ تو دوسری طرف موجود احسن کو آگاہ کررہا تھا۔

وہ اپنی جگہ پہ کھڑے کھڑے ہی زلزلوں کی زد میں تھی اس کے خوب صورت چہرے پر یکدم ہی ڈر خوف پھیل گیا تھا شاہان علی نے ایک نگاہ قریبی کھڑی ریحا پر ڈالی اور باہر نکل گیا تھا۔

وہ اس کے ساتھ یوں بھی کرسکتا تھا ایسی سزا بھی دے سکتا تھا کب سوچا تھا اس نے یہ۔۔۔ اس نے اپنے اور اس کے بیچ بہت فاصلے رکھے تھے مگر یوں وہ اتنی دور چلا جائے گا اسے کب معلوم تھا کیا وہ اپنے حق کے لیے ذرا سی جنگ بھی نہیں لڑے گی نہیں وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی کبھی نہیں۔۔۔ اپنے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے اس نے مضبوطی سے سوچا تھا۔

وہ اپنا موبائل نیچے ہی چھوڑ کر اوپر اپنے بیڈ روم میں گیا تھا اور کچن سے اسے دیکھتی ریحا کے لیے یہ بہترین موقع تھا وہ تیر کی تیزی سے باہر نکل آئی تھی اس کا موبائل اٹھا کر اس نے جلدی جلدی روحینہ کا نمبر سرچ کیا تھا بہت تیزی کے ساتھ وہ نمبر اپنے سیل میں محفوظ کرکے وہ واپس پلٹ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"جی کون؟" شاہان کے جانے کے بعد اس نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر کھڑی ہوئی وہ روحینہ کا نمبر ڈائل کرکے دوسری طرف سے فون اٹھانے کی منتظر تھی۔

"مسز شاہان علی؟" دوسری طرف سے پوچھے گئے سوال کا اس نے بہت خود اعتمادی سے جواب دیا تھا۔

دوسری طرف ایک پل کے لیے خاموشی چھا گئی خاموش کیوں ہوگئیں؟ تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں تمہیں کال کرسکتی ہوں یا پھر تمہیں لگتا ہے کہ تم شاہان کو مجھ سے چھین لوگی اور میں خاموش رہوں گی؟"

اس نے طنز سے کہا تو دوسری سمت پہلی خاموشی ٹوٹی۔

"جو تمہارا ہے اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا البتہ جو تمہارا ہے ہی نہیں وہ کوئی لاکھ چاہ کر بھی تمہیں دے نہیں سکتا۔" روحینہ کی بات نے اس کے اندر

WWW.PAKSOCIETY.COM

آگ لگادی تھی۔
"طنز کررہی ہو؟" اس نے سلگ کر پوچھا۔
"نہیں حقیقت بیان کررہی ہوں۔" دوسری طرف سے بہت نرمی سے کہا گیا تھا۔
"خیر ہمیں یاد کرنے کا مقصد؟"
"ملنا چاہتی ہوں میں تم سے تم آؤ گی یا میں آؤں؟" اپنے غصے پر ضبط کرتے اس نے کہا تھا۔
"ہمارے گھر کے دروازے ہر وقت اور ہر کسی کے لیے نہیں کھلتے مگر تمہارے ساتھ جس شخص کا حوالہ ہے نا اس کے لیے گھر تو کیا دل تک کے دروازے کھلے ہیں جب چاہو آجاؤ۔"

☆ ☆ ☆

براؤن کلر کے کپڑوں میں ملبوس اس نے ہلکا سا میک اپ کیا اور ڈرائیور کے ساتھ اس سے ملنے چلی آئی تھی۔ بے حد غصے کے عالم میں وہ روحینہ کے گھر داخل ہوئی تھی جی چاہ رہا تھا لمحوں میں اس عورت کو ختم کر ڈالے سادگی سے سجے ڈرائنگ روم میں بیٹھی وہ غصے اور بے چینی سے روحینہ شاہ کی آمد کی منتظر تھی۔ تبھی وہ چلی آئی تھی اور اسے دیکھتے ہی ریحا بے اختیار صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
بے حد حیرت سے کھڑی وہ اپنے سامنے موجود اس حسن کے دلکش پیکر کو دیکھے جارہی تھی۔
"کیوں ملنا چاہتی تھیں ہم سے۔" روحینہ شاہ نے سکوت توڑا تھا وہ دونوں ابھی تک آمنے سامنے کھڑی تھیں۔
"دیکھنا چاہتی تھی اس عورت کو جس کی تصویر شاہان علی کے دل پر نقش ہے۔" اس کے چہرے پر نظریں گاڑھے ریحا علی نے جواب دیا تھا۔
"ہوں!" روحینہ شاہ نے ایک گہری سانس بھری تھی۔
"ایک منٹ۔۔۔" وہ واپس مڑ گئی تھی جب کہ ریحا صوفے پر آبیٹھی تھی وہ اس عورت سے لڑنے آئی تھی اسے بتانے آئی تھی کہ شاہان علی صرف اس کا ہے مگر اب اس کے سامنے خاموش کھڑی تھی پتہ نہیں اس عورت کے وجود میں ایسی کون سے بات تھی۔
"تو دیکھو۔" وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی جب روحینہ شاہ نے اس کے قریب آکے کہا تھا۔ "یہ ہے وہ عورت جو شاہان علی کے دل پر نقش ہے۔"
اس نے نظر اٹھا کر دیکھا صاف چمکتے شیشے میں اس کے شبیہ واضح تھی۔ وہ پہلے حیران ہوئی پھر اداسی سے مسکرائی۔
"اگر میں اتنی پانصیب ہوتی تو آج یہاں تمہارے سامنے نہ بیٹھی ہوتی" اداسی سے کہتی وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی تھی۔
"اس کو ہر جگہ بس تم ہی نظر آتی ہو۔ تبھی تو میرا ہوتے بھی وہ میرا نہیں۔ میں اس کی بیوی ہوں اور اسے مجھ سے گھن آتی ہے۔" پتا نہیں وہ اس عورت سے اپنے دکھ کیوں بانٹنے لگی تھی اس عورت سے جو اس سے شاہان علی کو چھیننے کے درپے تھی
"تم۔۔۔ تم سے گناہ کا رشتہ ہے پھر بھی۔۔۔"
"ایک منٹ۔۔۔" خاموشی سے اس کی بات سنتی روحینہ شاہ تڑپ اٹھی تھی۔
"ایک بات ابھی سے ذہن نشیں کرلو ریحا علی۔ تمہارا شوہر سب کچھ ہوسکتا ہے، بدکردار نہیں ہے اور جہاں تک بات ہے اس کے دل کی تو وہ صرف تم سے محبت کرتا ہے۔"
روحینہ کی بات پر وہ تلخی سے مسکرائی۔ "اسی لیے تم سے شادی کررہا ہے؟"
"نہیں ریحا علی شاہان علی ہمارے دل کے شہنشاہ ہیں وہ پارس ہیں جو ہمارے ہوجاتے یا ہمیں چھو لیتے تو ہم سونا بن جاتے۔ ہم تو مٹی کے بنے ہیں ہمیں مٹی ہی رہنا ہے وہ ہمارے دل میں ضرور بستے ہیں پر ہمارا نصیب نہیں۔"
سامنے بیٹھی عورت کے الفاظ پر اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں بھیگتی محسوس کی تھی۔
"پھر وہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے؟" بہت ہارا ہوا انداز تھا اس کا۔

"نفرت کہاں کرتا ہے ہاں البتہ محبت میں بدگمان ہے اور انسان جب محبت میں بدگمان ہوجاتا ہے نا تو پھر اس کا رویہ اس کا انداز نفرت کرنے والوں سے بھی سخت ہوجاتا ہے اس کے دل پر بدگمانی کی دھند پھیلی ہوئی ہے جس دن تم اسے صاف کرلوگی دیکھنا اس شیشے کی طرح صاف ہوگا۔"

☆ ☆ ☆

"تم روحینہ سے ملنے گئی تھیں۔" بہت کڑے تیوروں کے ساتھ کھڑا وہ پوچھ رہا تھا۔
"ہاں" اس کی ہاں بہت واضح تھی۔ "کیوں؟" اس کی ہاں نے شاہان علی کے غضب میں اضافہ کیا تھا۔
"کیونکہ وہ میرا گھر لوٹنا چاہتی ہے میرا آشیاں بکھیرنا چاہتی ہے اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔"
اس کی بات نے شاہان کے غصے سے تنے چہرے پر تلخی پھیلی تھی "تو یہ گھر ہے؟"
"آپ کے لیے نہ سہی میرے لیے ہے۔" وہ بھی آج تن کے کھڑی تھی۔
"بڑا غرور ہے اس گھر پہ۔ اگر میں چاہوں تو پل میں توڑ سکتا ہوں۔" اس کی بات پر ریحا نے اسے آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا۔
"بس اسی بات کا زعم ہے نا آپ کو یہ بھی کرکے دیکھیں۔" وہ کچھ کہنے لگا تھا جب اس کے ہاتھ میں تھاما سیل بج اٹھا تھا۔
"ہاں آتا ہوں۔" کہہ کر اس نے سیل بند کیا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے، جب وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی وہ ٹھٹکا تھا۔
کتنا عرصہ ہوگیا تھا اس شخص کی بے اعتنائیاں، خفگیاں سہتے بس اور نہیں اسے پتہ تو چلے وہ اسے کس بات کی سزا دے رہا ہے۔
"میں نے کہا راستے سے ہٹو۔" غصے سے شاہان علی نے دروازے کے سامنے کھڑی ریحا علی کو دیکھا تھا۔
"نہیں ہٹوں گی۔" وہ بھی آج ہٹیلے پن پر اتری ہوئی تھی۔
"میرے راستے سے ہٹو بدکردار عورت!"
بہت غصے سے اسے دروازے کے سامنے سے ہٹاتا وہ چیخا تھا۔
"بدکردار۔۔۔ بدکردار عورت۔۔۔ میں بدکردار ہوں میں بدکردار۔۔۔" وہ لپک کر پھر اس کے سامنے آئی تھی "کیوں، کس لیے آپ نے مجھ پہ یہ الزام لگایا؟" حیرت کی شدت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
"بتائیں شاہان" آنسو اس کی آنکھوں سے بہت شدت سے گر رہے تھے۔ "اپنے اندر جھانکو سارے جواب مل جائیں گے؟"
نفرت انگیز لہجے میں اس نے طنز سے کہہ کر اپنے قدم بڑھائے تھے۔
"آپ نے ایسا کیوں کہا شایان میرا ماضی تو کسی صاف آئینے کی طرح آپ کے سامنے ہے، میں، میرا وجود میرا دل سب پر بس آپ کا اختیار ہے پھر کیوں کہا آپ نے ایسا۔۔۔؟"
روتے ہوئی وہ پھر سے اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔
"اچھا تو پھر جبزی کون تھا؟" بہت تلخ سے انداز میں اس نے کہا تو اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔
"جبزی" اس نے حیرت سے دہرایا تو وہ اس پر جبزی کے حوالے سے شک کررہا تھا۔ الزام لگا رہا تھا جبزی جو اس کا یونیورسٹی فیلو اور ایک اچھا دوست تھا بس۔۔۔
"میرا جبزی سے یا کسی بھی دوسرے مرد سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ صرف میرا دوست تھا۔ میں۔۔۔ میرا نکاح آپ سے ہوا تھا اور میں اس بات سے باعلم تھی پھر میں یوں کیسے کرسکتی تھی آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔" روتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھی اس کی بدگمانیاں دور کرنی کی کوشش کرتی ریحا علی کو اس نے تنفر سے دیکھا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مجھے تمہاری کہانیاں نہیں سننی۔" بہت نفرت اور بے زاریت سے کہتے وہ ایک جھٹکے سے وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت روتے ہوئے ان کے سینے سے لگی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا پاپا وہ پتھر ہے اور پتھر کب نرم ہوا کرتے ہیں وہ یا تو ٹوٹ جاتے ہیں یا توڑ دیتے ہیں دیکھیں اس نے مجھے توڑ دیا پاپا ریزہ ریزہ کر دیا۔"

شدت سے روتے ہوئے کہتی ریحا علی سرفراز علی کے سینے سے لگی ماتم کناں تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھ سے شادی کرو گی؟" اپنی سبز آنکھیں روحینہ شاہ کے وجود پر ٹکاتے اس نے پوچھا تھا۔

"جن سے محبت کی جاتی ہے نا انہیں اذیت سے انتظار کی سولی پر نہیں لٹکایا جاتا۔" ہلکے سے مسکرا کر اس نے جواب دیا تھا۔

"اسی لیے تو تمہیں اس اذیت اور انتظار سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"ہم جو کہہ رہے ہیں آپ جانتے ہیں۔"

"نہیں میں کچھ نہیں جانتا سوائے اس ایک بات یا سوال کہ تم مجھ سے شادی کرو گی؟" اس نے اپنا سوال دوہرایا تھا۔

"اگر آپ ہماری محبت میں ایسا کہہ رہے ہوتے تو شاید نہیں یقیناً" ہم خود کو اس کائنات کی خوش نصیب عورت گردانتے مگر آپ ایسا ہماری محبت میں نہیں بلکہ ریحا علی کی ضد میں کہہ رہے ہیں۔"

روحینہ کی بات پر اس نے تلخی سے سر جھٹکا تھا۔

"جو میں نے پوچھا ہے' اس کا جواب دو مجھ سے شادی کرو گی؟" وہ ایک گہری سانس لیتی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی تھی وہ منتظر سا بیٹھا تھا۔

"نہیں... باوجود اس کے' آپ کے ہماری ذات پہ بے تحاشا احسانات ہیں۔ آپ کی وجہ سے ہی ہم آج یہاں اس گھر میں محفوظ ہیں... آپ نے جس طرح اس تیخ سے ہماری عزت بچا کر ہمیں یہاں نہ صرف پناہ دی بلکہ بہت عزت سے رکھا ہم اگر تمام عمر آپ کے قدموں میں بیٹھے رہے تب بھی آپ کے احسانات نہیں چکا سکتے۔ باوجود اس کے ہمارے دل کے پہلے اور آخری مہمان آپ ہیں۔ آپ سے پہلے اور آپ کے بعد بھی کوئی ہمارے دل کے بند در کبھی نہیں کھول پائے گا اس کے باوجود بھی نہیں۔"

"محبت بھی کرتی ہو اور انکار بھی کرتی ہو۔" شاہان علی کے سوال پر وہ آنکھوں کی نمی صاف کرتی پلٹی تھی۔

"ہاں محبت کرتے ہیں' اسی لیے محبت کی بددعا سے ڈر لگتا ہے کسی کے دل میں بسی محبت کو رلانے سے ڈر لگتا ہے۔"

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی..."

"پہلے اپنے دل سے بدگمانی جھٹک کر اپنے اندر جھانکیں پھر پتہ لگے گا آپ کو آپ کے دل میں ریحا کے علاوہ کوئی نہیں اور وہ بھی صرف آپ کو چاہتی ہے۔ بدگمان مت ہوں شاہان اور انا کی یہ جنگ چھوڑ کر اس کی طرف لوٹ جائیں جو آپ کا نصیب ہے۔"

☼ ☼ ☼

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کی کہی باتیں دماغ میں گونجتی اس کے اضطراب میں اضافہ کر رہی تھیں۔

"وہ تمہاری منتظر ہے شاہان اس کے انتظار کو طول مت دو۔" بابا کی آواز ذہن میں گونجی اس نے سر جھٹک کر کسی سوچ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے شاہان جبھی تو اتنی آسانی سے یہاں ایڈجسٹ ہو گئی ہے ورنہ تمہیں کیا لگتا وہ تمہارے خوف کی وجہ سے یہاں ہے۔"

آپی نے بہت پہلے کہا تھا اور اس نے بے حد خفگی سے بنتے ہوئے انہیں جھٹلایا تھا۔

"اس سے محبت نہیں کرتے تو اسے گھر میں کیوں لا بسایا ہے؟" احسن کے سوال کے جواب میں اس نے سر جھٹکتے اسے جھٹلایا تھا۔

"میں اس کا غرور توڑنا چاہتا تھا۔"

"کیا واقعی؟" احسن کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے دل نے بھی پوچھا تھا۔

"میں' میرا وجود' میرا دل سب پر بس آپ کا اختیار ہے شاہان۔" روتے ہوئے کسی نے التجا کی تھی اس کے وجود میں اضطراب بڑھا تیزی سے موڑ کاٹتے ہوئے وہ ایک پل کو ڈگمگایا تھا اور وہی ایک پل' دھماکے کی آواز دور تک گونجی تھی۔ بیگانہ ہوتے حواس کے ساتھ اس نے بہت سے قدموں کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

یخ ٹھنڈے کوریڈور میں موجود ان سب لوگوں کے ہاتھ اس کی سلامتی مانگنے کے لیے اٹھے ہوئے تھے بڑے ابا' زینب آپی گاؤں سے آ گئے تھے اور دونوں ہی اب مصلے بچھائے اپنے رب سے اس کی زندگی کی اس کی سلامتی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ سرفراز علی بہت پریشانی سے بھاگ دوڑ کرتے ان سب کو تسلی بھی دے رہے تھے۔

حمیرا علی بہتی آنکھوں اور کانپتے لبوں کے ساتھ اپنے قریب کھڑے احسان علی سے بار بار ایک ہی سوال کیے جا رہی تھی۔

"وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا احسان' اسے کچھ ہو گا تو نہیں؟" وہ ان کا سرد ہاتھ تھامے تسلیاں دیے جا رہے تھے۔ آمنہ بیگم ہاتھ میں تسبیح لیے مسلسل مناجات میں مصروف تھیں اور ان سے ذرا ہٹ کر بیٹھی ریحا علی جو اس وقت وہاں موجود ہوتے بھی وہاں کہیں نہیں تھی۔ ڈرے دل کے ساتھ خوف اور بے یقینی کی ردا اوڑھے وہ بند آنکھوں کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ تھی۔

"مبارک ہو۔" ڈاکٹر کے ان الفاظ نے ان سب کے تن مردہ میں جان ڈال دی تھی۔ "آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے وہ اب خطرے سے باہر ہیں۔"

دل بے اختیار ہی اس رب رحمٰن کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے آج تک تمہیں کچھ نہیں دیا وہ ممتا تک نہیں جو تمہارا حق تھی اس کے باوجود میں آج تم سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔ شاہان مجھے اپنی ماں کو اس کی تمام کوتاہیوں غلطیوں کے لیے معاف کر دو بیٹا۔"

انہوں نے روتے ہوئے التجا کی تھی اس نے فوراً" ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مما..." اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

"لیٹے رہو شاہان ابھی ڈاکٹرز نے تمہیں یوں اٹھنے بیٹھنے سے منع کیا ہے۔" پاس ہی کھڑے احسان علی فوراً" آگے بڑھے تھے۔

"ریحا! شاہان کے لیے سوپ بنا دیا بیٹا؟" کمرے سے باہر آتے ہوئے حمیرا نے پوچھا تھا۔

"جی پھپھو۔" وہ کچن سے نکلی تھی۔

"اوکے تو بیٹا اندر لے آؤ۔" جی کہہ کر وہ واپس کچن کی طرف مڑی تھی۔ سوپ باؤل میں ڈالے وہ سیڑھیاں چڑھتی بیڈ روم میں آ گئی تھی جہاں شاہان کے پاس حمیرا پہلے سے موجود تھیں۔

"یہ لیں۔" اس نے ٹرے حمیرا کی طرف بڑھائی تھی۔

"ریحا میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں بیٹا۔ شاہان کو سوپ تم ہی پلاؤ۔"

حمیرا کے جانے کے بعد بستر پر اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔

وہ سوپ ختم کر چکا تو وہ واپسی کے لیے اٹھی تھی۔

"ریحا!" شایان نے پیچھے سے پکارا تھا وہ ٹھہر گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ادھر آؤ میری بات سنو پلیز۔" وہ پلٹ کر بستر کے کنارے ٹکی۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔" وہ ایک لمحے کو رکا تھا۔

"میرا نہیں خیال شاہان کے ہمارے بیچ اب کچھ کہنے اور سننے کو رہ گیا ہے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں تو جو چاہیں فیصلہ کر لیجئے گا' میں اس گھر سے چلی جاؤں گی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ریحا!" پھپھو کے پکارنے پر اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ادھر آؤ۔۔۔" وہ ان کے قریب آگئی تھی۔

"میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گی بس اتنی سی بات ہے جان۔۔۔ کہ جو غلطی میں نے کی تھی تم مت کرنا۔ انا اور ضد ان دونوں کو ساتھ لے کر جینے والے انسان ہمیشہ تنہا رہ جاتے ہیں وہ لوٹ آیا ہے ریحا! شرمندہ ہے۔ معافی کا طلب گار ہے سوالی بن کر اور سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا۔ اسے معاف کر دو بیٹا! اس گھر نے ہم سب نے پہلے ہی انا اور ضد کے ہاتھوں بے حد زخم کھائے ہیں۔ بہت جدائیاں سہی ہیں اب اور نہیں اب انا اور ضد کبھی نہیں جیتیں گے اب بس محبت جیتے گی اسے معاف کر دو بیٹا۔ محبت کا ظرف تو بہت وسیع ہوتا ہے۔"

ان کی آخری بات پر اس نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ماں ہوں بے خبر کیسے ہو سکتی ہوں۔" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے اس کی پیشانی چومنے لگیں۔

اور ریحا علی نے شاہان علی کو معاف کر دیا تھا۔ وہ لوٹ آیا تھا۔ اپنی ساری غلطیوں پر پشیمان تھا۔ پھر وہ اسے خالی ہاتھ کیسے لوٹا دیتی کہ شاہان علی اس کا شوہر ہی نہیں محبوب بھی تو تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ فون بند کر کے پلٹی وہ پیچھے کھڑا تھا۔

"کس سے بات ہو رہی تھی۔" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے اس نے عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"روحینہ سے۔" وہ مسکرا کر کہتی قریب چلی آئی تھی۔ "اس کا شکریہ ادا کرنا تھا؟"

"کس بات کا شکریہ؟" وہ حیران سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"مجھے میرا شاہان لوٹانے کا۔" کہہ کر وہ جانے لگی جب اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔

"شاہان علی تو شروع سے ہی تمہارا تھا۔ بس یہ بات تمہاری اور تمہارے شاہان علی دونوں کی سمجھ داری میں ذرا دیر سے آئی تھی۔"

"پر شکر ہے آگئی۔" اس کے بے ساختہ کہنے پر وہ بے اختیار قہقہہ لگا لیا تھا۔

"پر ایک بات تم ابھی بھی نہیں جانتیں مسز ریحا شاہان علی۔" اس کے چہرے پر آئی سیاہ لٹ کو محبت سے پیچھے کرتے اس نے کہا۔

"شاہان علی تم سے محبت کرتا ہے۔ آج سے نہیں بہت پہلے سے۔" اس کی بات پر اس نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"ایک بات تو آپ بھی نہیں جانتے مسٹر شاہان علی۔"

"کیا؟"

"وہ یہ کہ میں یہ بات بہت پہلے سے جانتی ہوں۔" اس نے شریر سے انداز میں کہا تو شاہان علی نے بے اختیار اسے خود میں سما لیا تھا۔ وہ اس کے کشادہ سینے سے سر ٹکائے سکون سے آنکھیں موند گئی تھی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تیز ہوا کے جھونکے سے حرا کے آگے دھرا کاغذ کا ٹکڑا کہیں سے کہیں اڑ جاتا لیکن عجیب بات تھی کہ وہ صرف پھڑپھڑا کے رہ گیا تھا۔ بھلا کیسے اڑ جاتا کہ وہ تو اشک ندامت سے تر بتر تھا۔ ندامت سے بھرا آنکھ سے ٹپکا آنسو اتنا بھاری تھا کہ نار جہنم کو ٹھنڈا کرنے کی طاقت رکھتا تو پھر ندامت کے آنسوؤں میں ڈوبا وہ کاغذ کا ٹکڑا بھلا کہاں اڑتا جسے حرا ندامت کے آنسوؤں سے دھندلا چکی تھی۔

"اے میرے رب! میرے گناہ بھی اسی طرح دھو دے جیسے اس کاغذ کے حروف۔" اس نے صدق دل سے ہاتھ اٹھا دیے۔

☆ ☆ ☆

دل میں ایک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

نہ جانے کتنے گناہ تھے جو تسبیح کے دانوں کے مانند یکے بعد دیگرے اڈے چلے آرہے تھے۔

"حرا! حرا! بھئی کہاں ہو تم؟" ماما کافی دیر سے اسے پکار رہی تھیں۔

"کہاں ہوتی ہوں اپنے کمرے ہی میں ہوں۔ آپ پتا نہیں کیوں ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ کہاں ہو کیا کر رہی ہو' ایسے نہ کرو' ویسے نہ کرو سچ ماما! بہت تنگ آجاتی ہوں میں۔" حرا کی زبان جو چلی تو رکنے میں نہیں آئی۔

"اچھا! بس کرو۔" ماما زچ ہو کر بولیں۔ "بابو بھائی کی بیوی کپڑے لے کر آئی تھیں۔ تمہیں دکھانا تھا کہ اپنی پسند کا خود ہی لے لو' اس لیے بلا رہی تھی۔"

"مجھے نہیں لینے بابو بھائی کے ہاں کے کپڑے' چند ڈیزائن اور گنے چنے کلر بس۔ میں خود بازار جا کر اپنی پسند کی پرنٹ لاؤں گی۔" حرا نے بے زاری سے جواب دیا۔

"مجھے تو گھر میں سہولت کے ساتھ خرید لینا زیادہ مناسب لگتا ہے۔" ماما نے اسے سمجھانا چاہا۔

"آخر کیوں؟" حرا بحث پر اتر آئی۔

صبیحہ اقبال

"تمہیں پتا ہے بازار میں انتارش ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بچانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔"

"پتا ہے۔"

میری ماما مجھے ایک برائی سے اور وقت کے زیاں سے بچانے کے لیے فکر میں تھیں مگر میں زبان درازی اور نافرمانی کر کے مزید برائی میں ملوث ہوتی جا رہی تھی۔

کتاب زندگی کے اوراق باری باری الٹ رہے تھے۔

"حرا! اذان ہو رہی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تو کیا کروں؟" ٹی وی کی جانب متوجہ حرا نے بڑی بدتمیزی سے کہا۔

"بھئی ٹی وی بند کردو اذان کا مطلب اللہ کے دربار میں حاضری کے وقت کی یقین دہانی ہے' جب اتنی بڑی ہستی کے گھر سے پکار آرہی ہو تو اسے یوں نظر انداز کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔"

ابا نے قدرے غصے اور قدرے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"لو بھلا! دن میں پانچ مرتبہ کوئی آسان ہے کہ انسان اپنے سارے کام دھندے چھوڑ' ہاتھ باندھ کر بیٹھ جائے۔" حرا کی بدتمیزی اپنی حدود پھلانگ رہی تھی۔

"اور دن بھر جو تم اس کی ان گنت نعمتوں سے فیض یاب ہو رہی ہوتی ہو؟" ابا کو بھی شدید غصہ تھا۔

"کیا میں نے یہ نعمتیں مانگی تھیں؟" حرا کی زبان کب قابو میں رہتی تھی۔

"یہ تو اس کی رحمت ہے کہ اس نے بن مانگے نواز دیا۔ شکر تو فرض ہو گیا نا۔" ابا اسے راہ راست پر لانے کی اپنی پوری سعی کر رہی تھیں۔

"ابا! اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ اسے ہماری عبادتوں کی ضرورت نہیں۔ عبادت کے لیے فرشتے موجود ہیں۔"

وہ ابھی نہ جانے اور کیا کچھ کہہ دیتی کہ ابا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"حرا! بس خاموش۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائیں اور نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئیں۔ کتنی ہی دیر تک حرا کا موڈ سخت آف رہا تھا۔

لیکن آج اپنے الفاظ کی گونج حرا کو شرمندگی سے سر نہیں اٹھانے دے رہی تھی۔

یادوں کے تھپیڑے اسے چین نہیں لینے دے رہے تھے۔

"کیا تمہارے والدین نے تمہاری پیدائش پر ڈاکٹر کو پوری فیس ادا نہیں کی تھی؟" حرا نے دور سے آتی فرح کو چھیڑا تھا۔

"کیا مطلب؟" فرح سمجھ نہ پائی۔

"دیکھو نا! اگر وہ ڈاکٹر کی پوری فیس ادا کرتے تو ڈاکٹر بھی انہیں پورے قد کاٹھ کی بچی دیتا۔"

حرا نے فرح کے چھوٹے قد کو نشانہ بنا کر مذاق اڑایا۔ فرح نم آنکھوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی حرا اور اس کا گروپ اکثر ہی کالج کی لڑکیوں کو تنقید کا نشانہ بنا کر لطف اندوز ہوتا تھا۔

"دیکھو! نغمہ کی پیدائش پر اس کی ماما نے کالے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔" نغمہ قریب سے گزری تو اس نے فقرہ کسا۔

فضا میں ایک بے باک قہقہہ بلند ہوا اور نغمہ آبدیدہ ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ نغمہ کا سانولا رنگ ہمیشہ ہی حرا اور اس کی دوستوں کے جملوں کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ دوسروں کی شکل و صورت پر جملے بازی کرنا اس گروپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

اللہ کی تخلیق پر اپنی یہ جسارت یاد آنے پر وہ کانپ اٹھی۔ جرم کی شدت کا احساس خون جگر کو آنکھوں کی راہ دکھا رہا تھا اور اس کی متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ

شور سا بپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

انسان اپنے اعمال کا خود ہی رازداں ہے۔ کون سا عمل کس نیت سے کرتا ہے' وہ خود ہی جانتا ہے۔

"حرا باجی! یہ پرپل والا سوٹ ہے نا' یہ تو میں لوں گی۔ مجھے یہ کلر بہت پسند ہے۔"

حرملا نے اس سوٹ پیس پر نگاہ پڑتے ہی خوشی سے کہا۔

"اوں ہوں! یہ پہلے میں نے پسند کیا تھا' اس لیے پہلا حق میرا ہے۔" حرا نے صاف انکار کر دیا۔

"اصولی بات تو یہ تھی کہ جب ہم سب جمع ہو جاتیں تب کپڑے کے پیس نکالے جاتے اور پسند کیے جاتے تو میں سب سے پہلے اسی کو پسند کرتی۔" حرملا نے خفا ہو کر کہا۔

"آپ نے پہلے ہی نکال کر غلط حرکت کی ہے۔" حرملا خاصی جز بز ہو رہی تھی۔

"اب تو جو ہونا تھا' ہو چکا۔" حرا نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"حرا باجی! ایسا کرتے ہیں قرعہ اندازی کر لیتے ہیں۔" حرملا کے لیے اس سوٹ سے دستبردار ہونا مشکل ہو رہا تھا۔

"نہیں کوئی قرعہ اندازی نہیں ہو گی۔" حرا اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔ حرملا دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ اور حرا صرف ہٹ دھرمی پر اڑی تھی ورنہ اسے یہ رنگ کچھ خاص پسند نہ تھا۔

"دیکھو! یہ کلر مجھ پر کتنا سوٹ کر رہا ہے۔"

عید کے دن صبح صبح اس نے وہ سوٹ پہن کر حرملا کو خاص طور پر مخاطب کیا تو خوشی کے ان لمحات میں بھی وہ آبدیدہ ہو گئی تھی اور حرا کو گویا یک گونہ سکون۔ کیونکہ ماما اکثر حرملا کی فرماں برداری کی تعریف کرتی تھیں جس سے اسے اپنی اہانت محسوس ہوتی آج گویا اس نے بدلہ لے لیا۔

لیکن اس وقت احتساب کا نشتر لیے وہ اپنی خامیوں کے پرت اٹھاتی وہ کس اذیت سے دوچار تھی اور ندامت کے آنسو کس تسلسل سے گر رہے تھے کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا آنٹی! کیا انکل اس ماہ سودا نہیں لائے گھر کا؟" دروازے میں کھڑی شہنیلا آنٹی کو دیکھ کر محض زبان کے چٹخارے کے لیے ان کی طرف جملہ اچھالا۔

"حرا! مذاق کرتے ہوئے چھوٹے بڑے کی تمیز کر لیا کرتے ہیں۔" شہنیلا آنٹی کا دل دکھا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے تحمل کے ساتھ اسے سمجھایا۔

"وہ آنٹی! دراصل اکثر ایسا ہی ہوتا ہے نا کہ آپ کبھی ماچس منگوانا بھول جاتی ہیں تو کبھی عین وقت پر چائے کی پتی یا چینی کم پڑ جاتی ہے۔"

وہ بھلا کب چوکتی تھی اور شہنیلا آنٹی جو اس کی ماما سے ایک ضروری مسئلہ بیان کرنے آئی تھیں بغیر کچھ کہے واپس چلی گئیں۔ ان کے تلملا کر جانے پر حرا ایک انداز دلربائی سے مسکرائی۔

حرا کی بے تکی چلتی زبان نے شہنیلا آنٹی کو اس وقت نہ صرف دکھی کیا تھا بلکہ غلط فیصلے کی وجہ سے ان کا مسئلہ مزید پیچیدہ ہو گیا اور شام کو انکل سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ اس کی ماما سے بات کرتیں تو یقیناً" وہ انہیں کوئی اچھی بات سمجھاتیں۔

"جہاں جھوٹ بول کر بھی آپس کے ازدواجی تعلقات کو بہتر بنانے کی اجازت ہو وہاں میری مداخلت کی وجہ سے۔"

اسے شدید احساس جرم نے خون کے آنسو رلا دیا تھا۔

"مینا آنٹی! یقیناً" انکل آپ کو خرچہ نہیں دیتے۔" حرا آج صبح ہی صبح تھوڑا سا نمک لینے کے لیے آنے والی پڑوسن کے سامنے بول پڑی۔

"بیٹا! منگوانا بھول گئی تھی' ورنہ تمہیں ہرگز زحمت نہ دیتی۔" مینا خالہ نے وضاحت کی۔

"تو یاد رکھا کریں نا۔ ایسا کریں' لکھ لیا کریں' لیکن آپ کے گھر پنسل کب ہو گی آپ کے بچے تو ہیں نہیں کہ کاغذ پنسل ہو۔ اب آپ کو پنسل لینے کے لیے بھی ہمارے ہاں آنا پڑتا۔"

وہ تمسخرانہ مسکرائی تو مینا خالہ بغیر نمک لیے نم آنکھوں کے ساتھ واپس ہو گئیں اور حرا نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

"وہ مومن نہیں جس کے ہاتھ اور زبان سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔" پیچھے سے آتی ابا نے حرا کو ٹوکا تھا۔

آج تک جن الفاظ کی کھٹک کانوں کے پردوں سے ٹکرانے کے باوجود شعور میں کوئی ارتعاش پیدا نہ کر سکی تھی شاید ہدایت کے اسی لمحے کی منتظر تھی توبہ گناہ کی تاریکی میں طلوع ہونے والے سورج کی مانند ہے اور حرا کی زندگی میں یہ سورج طلوع ہوا چاہتا تھا۔ تقویٰ خود احتسابی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے آنسوؤں کی روانی اس خشک سالی سے بہتر تھی' جس میں جھاڑ جھنکار پھل پھول رہے تھے۔

☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم منصلحتاً بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے، جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے

وصول کرپاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کررہا ہے۔
اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔
حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنارہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔
رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہوجاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہوکر بہو اور اس کے گھر والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہوجاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہوکر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔
اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہوکر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کرکے اس کے سارے راستے بند کردیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کردیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

آخری قسط

"یہ... کیا کہہ رہے ہیں آپ عدیل۔" وہ کانپ کر بولی۔
عدیل کا یہ رویہ دیکھ کر بشریٰ کے حواس ایک دم سے ساتھ چھوڑ گئے۔ اگرچہ ذکیہ نے اسے خوب ذہنی طور پر تیار کرکے بھیجا تھا اور اس سے یہ بھی کہا تھا کہ عدیل کو نسیم اور فوزیہ ٹھیک ٹھاک پٹی پڑھا چکی ہوں گی۔ شاید تمہارے سامنے اس کا روپ وہ آئے، جو تم نے عدیل سے کبھی متوقع نہیں کیا۔
لیکن ایسے روّیے کی توقع اسے بہرحال نہیں تھی۔
"امی نے تو ان کو کہلوا بھیجا تھا کہ ابھی نہیں... مگر..." وہ اس کی شعلے اگلتی نظروں کی تاب نہ لاکر رحم طلب نظروں سے نسیم کو دیکھتے ہوئے ہکلا کر بولی۔
ایک زناٹے دار تھپڑ بشریٰ کو اس کے قدموں سے اکھاڑ گیا۔
"عدیل!" وہ پتھرائی نظروں سے گال پر ہاتھ رکھے بس اسے دیکھے گئی۔
وہ اس والے عدیل کو تو پہچان ہی نہیں پارہی تھی۔
"جاؤ! اور اپنی ماں کو جاکر پیغام دے دو میری طرف سے... بلکہ نہیں... پیغام دینے کی کیا ضرورت ہے اب... کیوں امی؟" وہ استہزائیہ انداز میں یوں ماں کی طرف مڑ کر صلاح لینے کو بولا۔ جیسے اس سارے معاملے پر پہلے بہت کچھ طے پایا جاچکا ہے۔
"عدیل پلیز! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش..." وہ پھر سے خود کو سنبھال کر بولی۔
مثال اس کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ جیسے اسے اپنے ہونے سے کسی مضبوطی کا احساس دلا رہی ہو۔

کوشش کررہی ہو۔
"تم خود اپنی ماں کے پاس پیغام بن کر جاؤ گی... بس" وہ جیسے سارے مسئلے کا حل نکال کر چٹکی نہ بجاتے ہوئے بھی مزہ سا لے کر بولا۔
"ہاں تو ڈھٹائی اور بے شرمی، بے غیرتی دیکھو۔ ان لوگوں کی کون سی فرمائش نہیں پوری کی میرے بیٹے نے... ان کی بیٹی کی... پھولوں کی سیج پر بٹھا رکھا ہے نواب زادی کو... کسی ملکہ رانی کی طرح لاڈ اٹھاتا ہے... کہیں کوئی کمی چھوڑی عدیل نے۔"
عدیل کے روّیے نے نسیم کو جیسے نئی زندگی، نئی توانائی دے دی تھی۔ وہ ایک دم سے کھڑے ہوکر یوں دھاڑ کر بولیں۔ جیسے بیس سال پہلے ان کی دھاڑ اور گھن گرج سے پورا سسرال کانپا کرتا تھا۔ آج تو اتنے سالوں بعد ایسا جما جمایا میدان ملا تھا کھل کر کھیلنے کو۔
"تو کیا کمی ہے میری فوزیہ میں؟ اللہ نہ کرے کوئی عیب ہے اس میں؟ کوئی کبڑی، کوئی لنگڑی لولی ہے، اندھی کانی ہے یا خدانخواستہ ہاتھ پیروں میں کوئی نقص ہے؟ ایسی تابع دار، فرماں بردار، سگھڑ، خاموش طبع ہر وقت بڑوں کی جی حضوری کرنے والی میری بے زبان بیٹی۔ ابھی تو اس کی معصومیت کا قہر اللہ ان ظالموں پر بھی ضرور نازل کرے گا۔ جنہوں نے اس باکردہ پہ گھر بیٹھے ایسا داغ لگایا۔ خدا ان کی نسلوں کو برباد کرے گا۔ کچھ سلامت نہیں بچے گا ان کا۔ نہ گھربار، نہ عزت و آبرو، نہ جان و مال۔ کیڑے پڑیں گے جیتے جاگتے ان کے جسموں میں۔" وہ قہر بھرے انداز میں بغیر سوچے، دیکھے بھالے بولتی چلی گئیں۔
"امی... قسم لے لیں۔ میں نے بات کی تھی امی سے۔ مثال سے پوچھ لیں... میں نے عمران سے بھی کہا تھا۔" بشریٰ بے اختیار نسیم کے سامنے روتے ہوئے گڑگڑا کر دونوں ہاتھ باندھ کر بولی۔
نسیم نے نفرت بھری نظروں سے اس اجاڑ صورت کو دیکھا۔
"نہیں! ابھی اتنی تو نہیں اجڑی۔ جتنی میری فوزیہ اجڑ چکی ہے۔" انہوں نے سیاہ دل کے ساتھ سوچا۔
"تو کر ابھی اپنی ماں کو فون۔ بلا اس کا نمبر اور کہہ اس سے کہ ابھی الٹے پیروں آکر میری فوزیہ کا ہاتھ مانگے۔ ورنہ یہیں کھڑے کھڑے میرا بیٹا تجھے تین حرف بول دے گا۔ پھر وہ شادیانے بجا کر بہو بیاہ لائے۔" وہ عدیل کو مان بھری نظروں سے دیکھ کر تنتنے سے بولیں۔
"امی...!" بشریٰ سن سی رہ گئی۔
"منگنی کردی ہے۔ مطلب بات طے ہوگئی ہے تو..." اس کی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ اس حشر کی گھڑی سے کیسے نپٹے۔
"سن لیا؟ دیکھ لی اپنی بیوی کی محبت اور تابع داری؟ اسی پر جان چھڑکتے تھے نا تم؟ اس ناگن کو کیا فائدہ ہوا یوں محبت کے کٹورے بھر بھر دودھ پلانے کا، جو تیری عزت نہ رکھ سکی تیری لاج کو اپنی اس چلتر ماں اور مکار بھائی کے سامنے نہ سنبھال سکی۔ ارے لعنت ہے عدیل! تیرے یوں جورو کے غلام بنے رہنے پہ۔ ہم دونوں ماں بیٹی کو کہیں سے زہر کی پڑیا لادے۔"
وہ اپنے سینے پہ دو ہتڑ مار کر بال نوچ کر جاہلوں کی طرح بین کرنے لگیں۔
"تو تم اپنی ماں کو فون نہیں کروگی کہ وہ آکر اس رشتے کو قائم کرے؟" عدیل سرد نگاہوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بشریٰ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"عدیل!" اس کے خشک لبوں سے سرگوشی نکلی۔
"کرو فون۔" عدیل نے سیل اس کی طرف بڑھایا۔
"آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو پوری بات بتاتی ہوں۔" اس نے آنکھوں میں خاص الفت پیدا کرتے ہوئے اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑا۔
"کرو فون۔۔۔ یہ لو۔۔۔ نمبر میں نے ملا دیا۔" وہ دھاڑا۔
اور بجلی کی سی تیزی سے اس نے ذکیہ کا نمبر بھی ملا دیا۔ بشریٰ اسے یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا' ذکیہ فون اٹھائیں گی نہیں یا اٹھا کر بھی انجان بنی بات کو نہ سمجھنے کا ڈھونگ کرتی رہیں گی۔ کیونکہ فوزیہ کو وہ مر کر بھی بہو نہیں بنا سکتی تھیں۔ وہ تو شاید بشریٰ کے بگڑے گھر کا سوچ کرنے کے لیے تیار ہو بھی جاتیں۔ لیکن عمران۔۔۔
بشریٰ کو اس سے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔
"کرو بات۔۔۔ کہو ان سے دس منٹ میں یہاں پہنچ کر فوزیہ کے ساتھ نکاح پڑھوائیں۔ ابھی اور اسی وقت۔۔۔ کرو بات۔" وہ زور سے دھاڑا۔ بشریٰ پتھر کی طرح کھڑی رہی۔
عدیل نے اس کی گردن سے بالوں کی مٹھی بھری اور سیل اس کے کان سے لگا دیا۔
بشریٰ کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔
"دیکھ کیسی حرافہ ہے۔ ڈھیٹ زمانے بھر کی۔ نہ شوہر کی حیا' نہ ساس سسر کا کوئی ڈر' خوف یہی سمجھے ہوئے ہے نا کہ دو چار گالیاں' گھونسے اور تھپڑ ہی لگیں گے نا تو کوئی بات نہیں۔۔۔ کھا لے گی۔۔۔ مصیبت تو ٹل جائے گی نا پھر سے شوہر کو اسی طرح مٹھی میں کر کے الو سیدھا کرتی رہوں گی۔" نسیم' عدیل کے غصے اور غیرت کو ہوا دیتی جا رہی تھیں۔
"چھوڑیے بھائی! لعنت بھیجیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا اور میں ایسا رشتہ ان پتھروں سے جوڑنا بھی نہیں چاہوں گی۔ جن کے دل میں میری ذرا سی قدر' ذرا سی محبت بھی نہیں ہے۔ زور' زبردستی سے بھلا تم کیا میرا یہاں رشتہ جوڑو گے۔ مجھے بخش دو تم سب۔۔۔ مت بناؤ میرا تماشا۔ ہر ایک کے آگے مجھے مت ڈالو۔ میں اتنی فالتو تو نہیں گری پڑی ہو گئی ہوں؟" فوزیہ کہتے کہتے ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی۔
"فوزیہ! میری بچی' تجھ پر سارا کچھ وار دوں۔ تو کیوں گری پڑی ہونے لگی؟ تیری ماں تجھ پہ قربان۔" نسیم اسے سنبھالتے دہری ہو کر رونے لگیں۔
"تو تم نہیں بات کرو گی؟" عدیل کا غصہ کسی درجہ کم نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہوتا بھی کیسے۔ دونوں وقفے وقفے سے اس میں تیل جو ڈال رہی تھیں۔
"عدیل! اس طرح فون پہ بات۔۔۔" بشریٰ نے سمجھانا چاہا۔
"بات کرو۔" وہ بگلوں کی طرح دھاڑا۔
"نہیں۔۔۔ نہیں کروں گی۔" بشریٰ کو لگا بس اس میں اتنی ہی برداشت تھی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ وہ اپنے بال اس سے چھڑا کر اسے پرے دھکیل کر زور سے چلائی۔
مثال سب کی چیخوں اور خونخوار شکلوں سے ڈر کر صوفے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔
اس کی صرف آنکھیں ان کو دیکھ رہی تھیں۔
وہ جو اس کے سب سے پیارے رشتے تھے اور وہ ان کی سب سے پیاری۔۔۔

اس کا باپ' جو اس پر جان چھڑکتا تھا۔
اس کی ماں' جو مثال کی خاطر اپنے بچے کا قتل بھول گئی تھی کہ کہیں اس کی مثال کو باپ سے دوری کا غم نہ سہنا پڑ جائے۔ وہ اپنی انا اور ضد پر پیر رکھتی پھر سے اس کے باپ کے گھر واپس آ گئی تھی۔
اس کی دادی' جو کہتی تھیں۔ مثال میری جان ہے۔ میری شہزادی ہے۔ یہ سب کچھ مثال کا ہی تو ہے۔
اور اس کی پھپھو' جس نے سلائی' کڑھائی سیکھی تو سب سے پہلے مثال کے کپڑے سیے۔ اس کے خوب صورت فراکوں پر کڑھائی کی۔ اس کے لیے ننھے ننھے سویٹر بنے اور ایک پیاری گلابی رنگ کی اونی ٹوپی بھی بنائی اور جب سوڈ میں ہوتی تو مثال گڑیا کے لیے پیارے پیارے کپڑے بھی سی دیتی۔
اور اس وقت یہی پیارے رشتے اسے لگا' اس پر پل پڑیں گے اور اس کا خون چوسنا شروع کر دیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کے منہ سے ہلکی' ہلکی چیخیں نکلنے لگیں۔ جنہیں اس نے منہ کے آگے ننھا سا ہاتھ رکھ کر روک لیا۔
"طلاق دیتا ہوں۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت طلاق۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔۔۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ میرے گھر سے۔۔۔ میری زندگی سے۔" اس نے مٹھائی کی ٹوکری کو زور سے لات مار کر دور پھینکا اور ایک دم سے جیسے تیز زلزلے کے بعد گہرا سکوت چھا جائے۔
ایک دھڑام دھڑام کی آوازوں کے بعد گمبھیر خاموشی ہو جائے۔ بہت خون خرابے کے بعد کرفیو لگ جائے۔ بالکل ویسی چپ' ویسی بے آواز خاموشی تھی۔ جس میں سانسوں کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔
مثال نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا۔
اسے لگا شاید وہ اس کا خون پینے لگے ہیں۔ وہ اور بھی کٹھڑی بن گئی۔
مگر وہ سب تو مجسموں کی طرح یوں اپنی اپنی جگہ پہ جمے کھڑے تھے۔ جیسے کسی پری یا جادوگر نے انہیں اپنے جادو کے زور سے پتھر کا بنا دیا ہو۔
اس کی ماں کا تو منہ بھی کھلا تھا اور آنکھیں اتنی پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے پھٹ جائیں گی۔
سیل فون اس کے قدموں کے پاس گرا تھا۔ جانے کس کے ہاتھ سے چھوٹ کر۔
مثال نے ڈری ڈری نظروں سے فون کو دیکھا۔

اردو خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول
شائع ہو گئے ہیں
☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو — راحت جبیں — قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں — فائزہ افتخار — قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں — لبنیٰ جدون — قیمت: 250 روپے
خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر
منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

بشریٰ۔۔۔ بشریٰ۔۔۔ عدیل۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔ کس نے فون کیا ہے۔۔۔ مثال؟ ذکیہ کی حیرت بھری چیختی آواز اس سے آرہی تھی۔

مثال بس فون کو دیکھے گئی۔

بشریٰ آدھی صوفے پر' آدھی زمین پر لڑھک کر بے ہوش ہو گئی۔

مگر کسی نے اسے پکڑنے کی یا تھامنے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ پاپا نے بھی نہیں۔

"مما۔۔۔ مما۔۔۔ مما! اٹھیں نا۔۔۔ مما! میری طرف دیکھیں۔۔۔ پاپا! دیکھیں۔ مما کو کیا ہوا۔۔۔ مما! آنکھیں کھولیں۔۔۔ مما۔۔۔ پاپا! دیکھیں نا۔" وہ سارا ڈر' خوف بھلا کر بے اختیار ماں سے لپٹ کر اسے بمشکل کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے باپ سے فریاد کرنے لگی۔

"ڈھکوسلا کر رہی ہے مکار۔ سارے فن میں طاق کر کے بھیجا ہے ماں نے۔ خس کم جہاں پاک۔" نسیم نے یوں نفرت بھرے انداز میں بے ہوش بشریٰ کو دیکھا جیسے اسے پیروں سے ٹھوکریں مار کر بہت دنوں کی نفرت اور غصہ نکالا ہو۔

"نہیں عمران میرا وہم نہیں ہے۔" ذکیہ نے بے قرار ہو کر موبائل فون کو دیکھا اور پھر سے نمبر ملانے لگیں۔

"جب وہاں سے کوئی بول نہیں رہا۔ فون نہیں اٹھا رہا تو کیوں بار بار نمبر ملا کر ان فضول لوگوں کو ان کی اہمیت کا احساس دلا رہی ہیں؟ وہ لوگ ہیں ہی اس قابل کہ انہیں اگنور کیا جائے۔ دو چار دن اس طرح خاموش رہیں گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے بے حس انداز میں کہتے ہوئے ذکیہ کے ہاتھ سے سیل فون لیا اور ایک طرف صوفے پر اچھال دیا۔

ذکیہ کو پہلی بار بہت کچھ ہو جانے کا دھڑکا سا ہوا۔ انہوں نے زور سے سر جھٹکا۔

"وہم ہے یہ۔۔۔ کچھ نہیں ہو گا۔" وہ خود کو تسلی دینے کو بڑبڑائیں۔

"امی! چائے تو پلوائیں۔ سر میں درد ہونے لگا ہے۔ یہ آپی کا آنا بھی آج کل درد سر بنتا جا رہا ہے۔" عمران نے ریموٹ ہاتھ میں لے کر چینل پر چینل بدلتے ہوئے کچھ بے زاری سے کہا۔

"عمران! جب میرے فون پر کال آئی عدیل کی تو دوسری طرف کافی شور تھا۔ جیسے بہت سے لوگ مل کر بول رہے ہوں یا چیخ رہے ہوں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

وہ خود کو تسلی' دلاسا سب دے چکیں تو جیسے بے بس ہو کر بولیں۔ عجیب طرح کی بے بسی تھی ان کی آنکھوں میں۔

"اوفوہ امی! فضول کا سین کری ایٹ نہ کریں۔ کچھ بھی نہیں ایسا۔ غلطی سے مثال نے نمبر ملا دیا ہو گا اور پھر سیل کہیں ڈال کر اپنے کھلونوں میں مصروف ہو گئی ہو گی۔ پلیز آپ زیادہ ٹینشن نہیں لیں۔ صبح بشریٰ آپی سے بات کر لیجئے گا۔" عدیل نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

ذکیہ متذبذب سی بیٹھی رہ گئیں۔

"اب کیوں ایسے بیٹھی ہیں۔" مڑ کر ماں کی سوگوار سی شکل کو دیکھ کر کچھ کوفت سے بولا۔

"عمران! ایک دفعہ تم بشریٰ کے نمبر پر فون کرو۔ میں اس سے بات کر لوں تو مجھے قرار ملے گا۔" وہ کچھ لجاجت سے بولیں۔

عمران نے بے زاری سے ان کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے سیل اٹھا کر بشریٰ کا نمبر ملانے لگا۔

"لیجئے۔۔۔ کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ آپی صاحبہ اپنی روٹھی نند اور ساس صاحبہ کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی ہوں گی۔ کیا سڑی شکل ہے اس فوزیہ کی۔ میں تو کہتا ہوں اس۔۔۔ کیا نام تھا' جس سے اس کا نکاح ہوا تھا۔ ہاں! یاد آیا

ظہیر۔ اچھی قسمت تھی اس کی' جو سنتے میں چھوٹ گیا۔ ماں کی طرح فسادی طبیعت ہے اس کی۔" ذکیہ تاسف سے عمران کو دیکھ کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ کتنی دیر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اسے پتا نہیں چلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اردگرد سارے میں گمبھیر چپ تھی۔

کچھ دیر پہلے کا وہ بھیانک منظر اس کی نظروں کے سامنے پوری جزئیات کے ساتھ گھومنے لگا۔

عدیل کا سرخ بھبھوکا چہرہ' خونخوار آنکھیں اور چنگھاڑتا لہجہ اور پھر جو کچھ اس نے کہا۔ بشریٰ کے منہ سے سسکی سی نکلی۔

سب کچھ ختم کرتے وہ تین جملے۔ لمحہ بھر کو اس کا دل بند سا ہوا۔ بائیں بازو اور سینے میں درد کی تیز لہر نے سر اٹھایا۔

اور دوسرے لمحے وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی مثال اس کے اس جھٹکے سے صوفے سے لڑھکنے لگی۔

وہ پچھلے ستائیس منٹوں سے نیم بے ہوش ماں کے ساتھ جڑی بیٹھی اس کی براؤن قمیص پر بنے بلیک اینڈ براؤن ڈیزائن میں چمکتے موتیوں پر نگاہ جمائے بہت کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے یاد تھا۔ عدیل نے جب یہ سوٹ بشریٰ کو لے کر دیا تھا تو وہ شام بھی ان کی زندگی کی یادگار شاموں میں سے ایک تھی۔ بشریٰ اور مثال کی پسند کی ڈھیروں شاپنگ کی گئی تھی۔ لیکن یہ سوٹ عدیل نے اپنی پسند اور بہت محبت سے بشریٰ کو خرید کر دیا تھا۔

بشریٰ کو یہ پسند بھی بہت آیا تھا۔

اگلے ہی مہینے اس نے ویک اینڈ پر اسے پہن بھی لیا تھا اور وہ تینوں ڈنر کے لیے باہر بھی گئے تھے۔ پاپا نے مما کے لیے پھولوں کے گجرے بھی خریدے تھے اور آج یہی سوٹ۔۔۔ جس کا نیا پن ابھی ماند نہیں پڑا تھا۔ مگر اس کے رنگ ان موتیوں کی چمک جیسے سب کچھ بجھ سا گیا تھا۔

اس گہرے رنگ میں بشریٰ کا روپ سنولایا ہوا' اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔

لیکن اسے ابھی تک امید تھی کہ پاپا کا غصہ کچھ دیر میں کم ہو جائے گا تو وہ پہلے کی طرح مما کی دل جوئی کرنے چلے آئیں گے۔ بلکہ فوراً" سے پہلے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل پہلے کی طرح۔

مگر اسے نہیں پتا تھا۔ اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگر کچھ بچا بھی ہے تو وہ پہلے کی طرح تو بالکل بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کم از کم اس ننھی بچی کے لیے تو کبھی بھی نہیں۔

لیکن وہ ایک آس سی نظروں میں لیے یک ٹک اوندھی پڑی ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔

"مما!" اس نے آہستہ سے ماں کے ہاتھ پر اپنا ننھا ہاتھ رکھا۔

بشریٰ سوجی ہوئی آنکھوں' ستے ہوئے چہرے کے ساتھ خالی خالی نظروں سے سب طرف دیکھ رہی تھی۔

چند ہی لمحوں میں سب کچھ اجنبی ہو چکا تھا۔۔۔ بالکل اجنبی۔

اس کے لیے یہاں رکنے یا ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں بچا تھا۔ سب جواز' سب بہانے ایک دم ختم ہو گئے تھے۔ وہ گھر اس کے لیے اتنا ہی اجنبی ہو چکا تھا۔ جتنا اس کی شادی سے پہلے اس کے لیے تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب اس کے لیے یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
اس نے مثال کا ننھا ہاتھ مضبوطی سے اپنی مٹھی میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ذرا سا ٹھیک کر کے وہ اٹھنے لگی۔
اس کے قدموں کے پاس رنگ برنگی مٹھائی کے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ جسے لات مار کر عدیل نے الٹا دیا تھا۔
اس نے جمود بھرے اس ماحول کو دیکھا اور مثال کو لے کر باہر کی طرف چل پڑی۔ اسے اپنا ہینڈ بیگ بھی اٹھانا یاد نہیں رہا تھا۔
یاد تو وہ اب کچھ بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک خالی خالی نظر سب طرف ڈالی۔
وہ تینوں جانے کون سے کمرے میں تھے۔
عدیل شاید اوپر تھا۔ بشریٰ کے دل میں نفرت کی ایک تیز لہر دوڑی۔
اس نے کچھ اور بھی مضبوطی سے مثال کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر گیٹ کی طرف بڑھی۔
"مما۔۔۔ ہم کہاں جا رہے ہیں اس وقت۔۔۔ اوپر۔۔۔ اپنے گھر۔۔۔" مثال ماں کو اٹھتے اور یوں چلتے دیکھ کر ہی کچھ مطمئن ہو چکی تھی۔ اوپر کا راستہ یوں بھی باہر سے اوپر جاتا تھا۔ سو وہ یہی سمجھی۔
بشریٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے لے کر گیٹ سے ذرا فاصلے پر رک کر اس نے مڑ کر دیکھا۔
عدیل اس کے سامنے کھڑا تھا۔
بشریٰ نے ایک زخمی نفرت بھری نظر اس پہ ڈالی اور رخ پھیر کر جانے لگی۔
عدیل نے ایک جھٹکے سے مثال کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے پیچھے کر لیا۔
"یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔" وہ دبی ہوئی آواز میں غرا کر بولا۔
"تم اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔" وہ چیخ کر بولی۔ "چھوڑو اسے۔۔۔ یہ میری بیٹی ہے۔ میں تم جیسے جانوروں کے پاس تو اسے ایک لمحہ کو نہیں چھوڑوں گی۔" وہ سارے لحاظ' مروت ایک طرف کر کے زور سے بولی۔
"یہ صرف میرے پاس رہے گی۔ تمہارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ بھی جواباً اسی نفرت سے بولا۔
"چھوڑو اسے۔۔۔ مثال! چلو میرے ساتھ۔" وہ مثال کو کھینچتے ہوئے بے قابو تنفس کے ساتھ بولی۔
"مثال کو تو تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتیں۔ یہ تمہارے ساتھ رہے اور تم جیسی بدزبان' ڈھیٹ اور بے لحاظ بنے۔ یہ میں کبھی نہیں چاہوں گا۔ تمہیں یہاں سے اکیلے ہی جانا ہوگا۔" عدیل اسے دیکھ کر سرد لہجے میں بولا۔
"چھوڑو میری بیٹی کو ورنہ میں شور مچا کر سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی اور تم لوگوں کی اصلیت سارے زمانے میں کھول دوں گی۔۔۔ تم۔۔۔ کیا ہو۔۔۔ تمہارا اصل۔۔۔" بشریٰ غصے' بے بسی' نفرت لاچاری اور رنج کے عجیب سے مقام پر آ کر کھڑی تھی۔ اس سے کچھ بھی نہ ڈھنگ سے بولا جا رہا تھا۔ نہ سوچا جا رہا تھا۔
وہ بس دیوانہ وار مثال کو اپنی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔
"تم سارا محلہ کیا' سارا شہر بھی اکٹھا کر لو تو بھی۔۔۔ مثال کو تو میں تمہیں چھونے بھی نہیں دوں گا۔ نکلو یہاں سے۔"
عدیل کی آنکھوں میں زمانے بھر کی حقارت اور لہجے میں دھتکار تھی کہ بشریٰ کو لگا' وہ اس دنیا کی ذلیل ترین اور گری ہوئی عورت ہے۔
"چھوڑو اسے۔ یہ میری بیٹی ہے۔" آنسوؤں کی روانی کی شدت میں اسے اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔
وہ مثال کو کھینچ رہی تھی اور عدیل کی گرفت مثال کے گرد مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ مثال کو لگا' ابھی اس کا دم

گھٹ جائے گا اور وہ مر جائے گی۔ اس نے ایک دم سے رونا شروع کر دیا۔
"مما۔۔۔ مما۔۔۔ پاپا۔۔۔ چھوڑیں مجھے۔۔۔ مما!" وہ زور' زور سے رو رہی تھی۔
"عدیل! منہ پر مار اس کی چھوکری کو۔۔۔ ناگن کی اولاد' ناگن ہی نکلے گی۔ دفعان کر دے اسے بھی ماں کے ساتھ۔ تو کیوں اس منحوس کی پرورش کا درد سر اٹھاتا ہے؟" نسیم برآمدے میں کھڑی للکار کر بولیں۔
"ہرگز نہیں۔ میری زندگی میں یہ کبھی نہیں ہوگا۔ مثال صرف میرے پاس رہے گی۔ میں اس عورت کا سایہ بھی اس پہ نہیں پڑنے دوں گا۔" وہ اب مثال کو گود میں اٹھا کر مضبوطی سے بولا۔
بشریٰ دیوانہ وار اسے نوچنے لگی۔
اس کا گریبان' بازو' شرٹ کے بٹن' عدیل کا چہرہ' سب کچھ بشریٰ کی دیوانگی کی زد میں تھا۔
"اسے دفع کر عدیل! دور کر اس چھپکلی کو۔ جیسی ماں ہے' ویسی نکلے گی۔ ان کمبختوں کے خون میں نہ وفا ہے' نہ فیض۔ کل کو اس کی وجہ سے دکھ اٹھائے۔ یہ تجھے کبھی خوشی نہیں دے سکتی۔ جانے دے اسے ماں کے ساتھ۔۔۔ دور کر۔" نسیم اس کے پاس آ کر مخصوص لڑاکا انداز میں چلا کر بولیں۔
"چھوڑو اسے۔۔۔ چھوڑ دو میری بچی کو۔" بشریٰ اب باقاعدہ عدیل کو دونوں ہاتھوں سے مار رہی تھی۔
"نکلو۔۔۔ نکلو تم یہاں سے۔۔۔ جس کو لے کر آنا ہے' لے آؤ جا کر۔ میں مثال کو کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔ اب اس پہ تمہارا کوئی حق نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔" عدیل نے زور سے بشریٰ کو گیٹ کی طرف دھکا دیا۔
وہ زور سے جا کر دیوار سے لگی۔ اس کو لگا' اس کا کندھا اتر گیا۔ درد کی شدت سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ مگر وہ زخمی شیرنی کی طرح پھر سے جا کر عدیل سے بھڑ گئی۔
"میرے جیتے جی میں اپنی بیٹی تمہارے جیسے جانور۔۔۔ درندے کے حوالے نہیں کروں گی۔ دوا سے مجھے۔۔۔ مثال!" وہ بالکل ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔
"مما۔۔۔ مما۔۔۔ مجھے مما کے ساتھ جانا۔۔۔ مت ماریں مما۔۔۔ پاپا کو۔۔۔ پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ مما رو رہی ہیں۔" مثال بھی زور' زور سے روئے جا رہی تھی۔
"اسے دفع کر دے عدیل! دور کر ان نحوستوں کو۔۔۔ اپنے اوپر سے ٹال۔۔۔ ..... میرے بچے۔" نسیم اب کے مثال کو اس کی گود سے اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔
"ایسا نہیں ہو سکتا امی! میں مثال کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ اس عورت کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔" عدیل مرد تھا۔ مثال کو اس کی گرفت سے چھڑانا آسان نہیں تھا۔
بشریٰ پورا زور لگا کر' عدیل کو دھکیل دھکیل کر اب نڈھال سی ہو چکی تھی۔ مگر مثال کو یہاں چھوڑ کر جانے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔
"چھوڑ دو اسے۔ ورنہ میں ابھی پولیس کو فون کر کے بلوا لوں گی۔ وہ آخری وار کے طور پر اس کی گود سے مثال کو کھینچتے ہوئے چلائی۔
"اپنے باپ کو بھی بلا لو تو بھی تم مثال کی شکل کو ترسو گی اور اب بہت ہو گیا ڈراما۔ نکلو یہاں سے۔ کوئی جگہ نہیں ہے تم جیسی ناشکری' بدزبان عورت کی اس گھر میں۔" اس نے بشریٰ کا ہاتھ زور سے اپنے آہنی پنجے میں جکڑا اور دوسرے لمحے ٹانگ سے گیٹ کا پٹ کھول کر اس نے بشریٰ کو پوری قوت سے باہر دھکیل دیا۔
مثال کی دل خراش چیخوں نے اس کے دل کو دہلایا۔ نہ بشریٰ کے واویلے نے۔
وہ اب دیوانہ وار باہر گیٹ پیٹ رہی تھی۔
"عدیل! سارا محلہ اکٹھا ہو جائے گا۔ ابھی اس مثال کو بھیج دے اس کے ساتھ۔ بعد میں جا کر لے آنا۔۔۔ تو باپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ تیرا حق ہے اس پر۔ یہ تیرے پاس ہی رہے گی۔ ابھی تو یہ مردود تماشا لگا رہی ہے باہر۔" نسیم نے پاگلوں کی طرح گیٹ پیٹتی بشریٰ کے واویلے پر کچھ گھبرا کر عدیل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ جو کچھ کر سکتی ہے۔ اسے کرنے دیں۔ میں مثال کو نہیں دوں گا۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔" عدیل سختی سے بولا۔

"مما! مما۔۔۔ مجھے مما کے ساتھ جانا ہے۔" مثال ماں کی باہر سے آتی چیخوں پر روتے ہوئے زور سے بولی۔

تڑاخ!

عدیل نے زور سے مثال کے منہ پر تھپڑ مارا اور مثال کی آوازیں گم ہوئی۔ جیسے اب کبھی نکلے گی ہی نہیں۔

بشریٰ اسی طرح گیٹ پیٹے جا رہی تھی۔

"بھلے رات بھر یہاں کھڑی چیختی رہو۔ پولیس کو لے آؤ یا کسی کو بھی۔ مثال کی جھلک بھی تمہیں نہیں ملے گی۔" اس نے بلند آواز میں کہا اور مثال کو لے کر اندر چلا گیا۔ نسیم وہیں کھڑی رہیں۔ بشریٰ گیٹ پیٹے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات بھی اس کائنات کے اسراروں میں سے ایک ہے۔ ایک ایسا بھید' ایسا اسرار جسے ہر زمانے' ہر قرن میں اہل' عقل' اہل دانش کھوجتے رہے اور وہ اس کی حقیقت کو نہ جان سکے۔

اس کو بھی تو یہی لگتا تھا۔ وہ زمانوں سے ان سیاہ راتوں کو کھوج رہی ہے۔ اس سیاہ رات اور اپنے وجود میں اسے بہت مماثلت نظر آتی۔ اسے لگتا یہ کالی راتیں اور وہ دونوں ہم ذات ہیں۔

وہ ان سیاہ راتوں میں خود کو بہت آرام دہ محسوس کرتی کہ اس کے اردگرد ان کا وہ ان چاہا شور' سماعتوں پر کوڑے برساتی وہ ناپسندیدہ آوازیں نہیں ہوتی تھیں۔

مگر رات نے اس پہ ستم بھی بہت ڈھائے ہیں۔ یہ بھی حقیقت تھی۔ مگر وہ اس حقیقت کو جانتے بوجھتے بھی رات سے بڑی عقیدت رکھتی تھی۔

اس نے کوفت زدہ انداز میں کتاب بیڈ پر پلٹ دی۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ مگر اسے یہی امید تھی کہ شام تک سب لوگ واپس آجائیں گے تو ظاہر ہے رات کے کھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ لیکن شام سے رات ہو گئی۔ نہ کوئی واپس آیا اور کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے الماری کھولی تو بسکٹ کے ڈبے میں صرف تین بسکٹ باقی بچے تھے۔ دو دن سے اس کا گزارہ ان ہی بسکٹوں پہ تھا۔

کل دوپہر میں کالج کی کینٹین سے دو سموسے کھا لیے تھے اور رات میں چائے کے ساتھ یہی بسکٹ۔ مگر آج صبح تو کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کالج وہ گئی نہیں تھی۔

اور کھانا منگوانے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔

بہت سوچ بچار اور بھوک سے بے چین ہو کر اس نے دوسری بار چوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگرچہ اسے پتا تھا۔ اب کے یہ چوری ضرور ہی اسے سب کی نظروں میں لے آئے گی۔

لیکن بھوک سے بڑھ کر کوئی بھی عفریت طاقت ور نہیں ہوتا۔ پیسے نکالتے ہوئے وہ جان چکی تھی۔

پرس میں اب صرف دو ہی سرخ نوٹ بچے تھے۔ اس نے تو صرف دو ہی نوٹ نکالے تھے۔

ایک دم جانے کمرے کے کون سے کونے سے مینڈک کی ٹرٹر جیسی موبائل فون کی آواز گونجنے لگی۔

وہ کچھ ہراساں سی کھڑی رہی۔ فون بجتا رہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

وہ واپس مڑ کر جانے لگی کہ پھر سے فون بجنے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کسی کا ضروری فون نہ ہو۔" یہی سوچ کر اس نے صوفے کے کشنز کے نیچے ہاتھ مار کر فون نکالا۔ اسکرین پر چمکتا نام دیکھ کر اس نے زور سے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ بجتے فون کو پلکیں جھپکے بغیر دیکھتی رہی۔ اس نے آہستگی سے فون صوفے پر پھینکا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

ذکیہ گیٹ کھولے ساکت سی کھڑی رہ گئیں۔
بشریٰ ٹیکسی سے اتری تھی اور وہ جس حالت میں تھی ذکیہ کا دل بند ہونے کے لیے وہ منظر کافی تھا۔ بکھرے بال' اجڑا حلیہ' سوجا ہوا چہرہ' اندر کو دھنسی آنکھیں اور سب سے بڑھ کر لڑکھڑاتی چال۔ اس کے شانے دوپٹے سے بھی بے نیاز تھے۔ کندھے پہ نہ کوئی بیگ تھا' نہ ہاتھ میں پرس۔ کچھ بھی نہیں تھا۔
ٹیکسی والے نے اس سے کچھ کہا تھا۔ جس سے بے نیاز وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتی ماں کے پاس آگئی۔
"بشریٰ۔۔۔ میری بچی! کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟" ذکیہ نے خود کو دھوکا دینے کو یہ سوال پوچھا۔
اس کی حالت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ ٹھیک کب ہے۔
"کہیں۔۔۔ کچھ ایسا ویسا۔۔۔" ذکیہ کے دل میں منحوس سا وسوسہ ابھرا۔
"نہیں۔۔۔ نہیں! ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں جانتی ہوں۔ شاید لڑائی ہوئی ہو۔۔۔ یا یہ جھگڑ کر آگئی ہو۔" ذکیہ نے بے اختیار بشریٰ کو تھامنے کے لیے بانہیں پھیلاتے ہوئے اپنے ہی وسوسے کو جھٹلایا۔
"مثال۔۔۔ مثال کہاں ہے بشریٰ۔۔۔" وہ بچی کے بغیر کیسی ادھوری سی لگ رہی تھی۔ بے اختیار ذکیہ پوچھنے لگیں۔
"انہوں نے چھین لیا۔ اسے مجھ سے چھین لیا۔ ان ظالموں نے امی۔۔۔ میری مثال۔۔۔ مجھے نکال دیا۔۔۔ دھکے دے کر امی۔۔۔ میری بچی۔" وہ رو رہی تھی۔ مما مما کہہ رہی تھی۔۔۔ مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ انہوں نے گیٹ بند کر لیا اور میری مثال۔۔۔ امی۔۔۔" وہ ہذیانی انداز میں بے ربط سا بولتے ہوئے بے دم سی ہوئی اور ذکیہ کی بانہوں میں جھول گئی۔
"بشریٰ۔۔۔ بشریٰ! میری بچی۔۔۔ بشریٰ۔۔۔ ہوش کرو۔۔۔ عمران۔۔۔ عمران۔۔۔ باہر آؤ بیٹے۔" ذکیہ بے قابو ہو کر چیخنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"مجھے مما کے پاس جانا ہے۔ مما۔۔۔ مما۔۔۔ مت مارو میری مما کو پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ گیٹ کھول دیں۔ مما مجھے آوازیں دے رہی ہیں۔ مجھے بلا رہی ہیں۔ مما۔۔۔ مجھے ساتھ جانا ہے مما کے۔" وہ مچل مچل کر روئے جا رہی تھی۔
وہ بشریٰ سے زیادہ عدیل کی پیاری تھی۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر جب ماں' باپ میں ناراضی یا جھگڑا ہوتا تھا۔ مثال عدیل سے ہی سنبھلا کرتی تھی۔ عدیل ہی اسے بہلایا کرتا تھا۔
مگر آج تو وہ عدیل کے ہاتھ لگاتے ہی چیخنے چلانے لگتی اور بھی زیادہ مچلنے لگتی۔
وہ عدیل سے تھپڑ کھانے کے بعد کچھ دیر تو بالکل گم صم سناٹے میں چلی گئی تھی۔ مگر پھر گیٹ کے باہر سے بشریٰ کے واویلے اور چیخ و پکار نے بے قابو سا کر دیا تھا۔
"چپ کر جاؤ مثال! صبح لے جاؤں گا تمہاری ماں کے پاس۔ اب رات بہت ہو گئی ہے۔ سو جاؤ۔۔۔ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی' یوں مسلسل رونے سے۔ سو جاؤ مثال!" عدیل نے اسے ساتھ لگا کر بہلانے اور سلانے کی کوشش کی۔ درحقیقت اسے مثال کو تھپڑ مارنے پر بہت پچھتاوا سا تھا۔ وہ اس کے بعد سے

بار بار کر کے اس تھپڑ کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
مگر مثال کی آنکھوں میں تو جیسے اس کے لیے شناسائی ہی نہیں تھی۔
وہ عجیب بے رخ سے انداز میں ضد کیے جا رہی تھی۔ باپ کے ہاتھ لگانے پہ اور بھی شدت سے چیخنے اور چلانے لگتی۔ بہت دیر سے وہ برداشت کیے جا رہا تھا۔
یوں بھی وہ تھک گیا تھا بہت زیادہ۔
یوں جیسے وہ صدیوں سے اس ٹینشن میں مبتلا ہو اور گھنٹہ بھر پہلے جو پہاڑ اس کی زندگی میں ٹوٹا تھا۔ ابھی تو اس کا وجود اس کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ مثال کے رونے دھونے اور پریشان کرنے کے دوران وہ وقتی طور پر اس واقعے کو بر اور است نہیں سوچ رہا تھا۔ لیکن کچھ تھا' جو دل کے آر پار ہوا تھا اور اس کا زہریلا سا درد اب جیسے پورے وجود میں پھیل رہا تھا۔
وہ جیسے تھک رہا تھا۔ ٹوٹ رہا تھا اور اب صرف نیند کی دو گولیاں کھا کر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ مثال۔۔۔
اس نے دانت بھینچ کر اپنی پیاری بیٹی کو دیکھا' جو ان دونوں کی جان تھی۔ مگر اب جیسے وہ تقسیم سی ہو گئی تھی۔ اسے مثال جیسی اچھی بچی سے اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔
"مثال! میں تھک گیا ہوں بیٹا۔ بس کرو اب۔ سو جاؤ۔ صبح لے چلوں گا تمہیں تمہاری ماں کے پاس۔" وہ قصداً "بشریٰ کا نام لینے سے اجتناب برت رہا تھا کہ یہ نام لمحوں میں اس کے لیے اجنبی سا ہو گیا تھا۔ جو کچھ دیر پہلے تک اس کی رگ جاں سے بھی قریب تھا۔
"یہ میں نے کیا کر ڈالا۔" پہلی بار دل میں درد کی تیز لہر سی اٹھی۔
وہ یوں ہی بائیں طرف سے سینہ سہلانے لگا۔ مثال کے رونے میں ایک توقف کے بعد پھر سے شدت آگئی تھی۔
"مما۔۔۔ مما۔۔۔ مما! مجھے لے جاؤ ساتھ۔۔۔ مجھے مما کے پاس جانا ہے۔ مما۔۔۔" وہ آنکھیں بند کیے بار بار دہرائے جا رہی تھی۔ عدیل اسے بے بسی سے دیکھنے لگا۔
"کیا تھا اگر بشریٰ یوں ہٹ دھرمی نہ دکھاتی۔ اپنی ماں اور بھائی کو منا لیتی۔ انہیں راضی کر سکتی تھی وہ۔ مگر میں جانتا ہوں۔ وہ دل سے نہیں چاہتی تھی کہ فوزیہ اس کی بھابھی بن کر اس کی ماں کے گھر میں جائے۔ جہاں جا کر وہ آزادی کے کچھ دن گزارتی تھی۔ اس کی وہ آزادی نہ چھن جاتی۔ اگر فوزیہ وہاں چلی جاتی۔" عدیل کو بشریٰ پر نئے سرے سے غصہ آگیا۔
"لیکن کیا مجھے فوزیہ کی خاطر یوں اپنا گھر مسمار کر دینا چاہیے تھا؟ میں ہی اگر تھوڑا خود کو بشریٰ کی جگہ رکھ کر سوچ لیتا۔" اس کے ضمیر نے ملامت کی۔
"نہیں۔۔۔ میں جانتا ہوں سارا قصور' ساری غلطی بشریٰ اور اس کی پھپھا کٹنی ماں کی ہے۔ اس کا بھائی خبیث کون سا کم ہے۔ اب ان لوگوں کے ہوش اور عقل ٹھکانے آئے گی۔ جب بیٹی ماتھے پہ طلاق کا لیبل سجا کر ہمیشہ کے لیے ماں کے گھر جا کر بیٹھے گی۔ فوزیہ کا مذاق اڑاتی تھی نا اس کی ماں اور مجھے کیسا ہلکا' کیسا بے وزن لیا انہوں نے۔ داماد کی بات' اس کا کہا کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا ان لوگوں کے نزدیک۔۔۔ ایسے چکنے گھڑوں کو مزہ چکھانا تو ضروری تھا۔"
اس نے سر جھٹک کر بے رحمی سے سوچا۔
مثال کا والیوم پھر بلند ہو گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے لگا فی الحال تو وہ خود مزہ چکھ رہا ہے۔ اسے اب پھر سے سخت غصہ آنے لگا۔
دل چاہا' جوتا اٹھا کر مثال کو ٹھیک ٹھاک لگا دے۔ سارا رونا دھونا بھول کر خاموشی سے سو جائے۔ کم از کم رات بھر تو سوتی رہے۔
اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور یہ مثال۔۔۔
"یہ چپ نہیں ہوئی ابھی تک بھائی؟" فوزیہ کمرے میں آکر حقارت بھری نظروں سے روتی مثال کو دیکھ کر بولی۔
"نہیں چپ ہو رہی کسی بھی طرح سے۔ ہر طرح سے بہلا کر دیکھ لیا ہے۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ ماں کے پاس جانا ہے اور بس۔۔۔ سمجھا رہا ہوں۔ مگر۔۔۔" وہ پوری طرح سے بھر چکا تھا۔ سخت کرخت بھرے لہجے میں بولا۔
"صرف تمہاری غلطی ہے یہ بھائی! تم نے کبھی ان ماں بیٹی کو اس طرح سے ٹریٹ نہیں کیا جس طرح یہ حق دار تھیں۔ بس لاڈ اٹھائے گئے۔ فرمائشیں پوری کرتے رہے۔ کبھی اپنی کوئی بات ان سے نہیں منوائی تو نتیجہ تو یہی نکلنا تھا نا۔ انہوں نے کب ماننا سیکھا ہے تمہاری بات کو۔"
فوزیہ کو بھی یہ سب سنانے کا آج ہی موقع ملا تھا۔ سو دل کی بھڑاس خوب ہی نکالی۔
عدیل اسے بھی کچھ سخت سنانا چاہتا تھا۔ مگر پھر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔
اب اور کون رہ گیا تھا جس کو وہ سنا نہیں چکا تھا۔ فوزیہ کو اس وقت چھیڑ کر بھڑوں کے ایک نئے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔
وہ صبر کا گھونٹ بمشکل بھر گیا۔
"مما۔۔۔ مما۔۔۔ مجھے مما کے پاس جانا ہے۔" مثال کا رو' رو کر گلا بیٹھ گیا تھا۔ مگر وہ نہ اپنی ضد سے ہٹی تھی۔ نہ رونا دھونا کسی طرح کم ہو رہا تھا۔
"تم سے کہا تھا نا بھائی! امی نے کہ اس کو ماں کے ساتھ چلتا کر دو۔ یہ تمہارے لیے تو گلے کی ہڈی بن جائے گی۔ عقل میں موٹی' ماں جیسی۔ کہاں کوئی بات سمجھے گی اور ویسی ہی ضدی۔" فوزیہ کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔
"اچھا پلیز! اب تم تو یہ سب بند کرو۔ کسی طرح اسے چپ کراؤ۔ ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس کی رائٹنگ سن سن کر تھک گیا ہوں میں۔" عدیل ہر لحاظ اٹھا کر پھٹ کر بولا۔
"آؤ مثال! میرے پاس۔" کوئی نیک گھڑی تھی' جو فوزیہ کو بھائی کی تھکن کا خیال آگیا۔
مثال کو بانہوں میں لینے کو آگے بڑھی۔
مثال بدک کر اور بھی پیچھے ہو گئی۔ جیسے فوزیہ اسے مارنے پیٹنے آئی ہو۔
"کیا ہو گیا ہے مثال! کیوں روئے جا رہی ہو؟ آؤ میرے پاس۔۔۔ میں تمہیں کچھ کھانے کے لیے دیتی ہوں۔" وہ حتی الامکان لہجے میں پیار سمونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ جو اس سے ہو نہیں پایا تھا۔
"مجھے کچھ نہیں کھانا۔ مجھے صرف مما کے پاس جانا ہے ابھی۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔" وہ دیوار کے ساتھ لگ کر ضد سے بولی۔
کنپٹیوں کو دباتے عدیل نے بمشکل رگوں میں ابلتے غصے کی لہر کو دبایا۔
"اچھا! چلو نہیں رہنا۔ چلی جانا اپنی مما کے پاس۔ ابھی تو میرے پاس آؤ۔" جتاتی نظروں سے بھائی کو دیکھ کر مثال سے ذرا نرمی سے بولی۔
"نہیں! مجھے ابھی جانا ہے۔۔۔ ابھی۔۔۔" وہ ایڑیاں رگڑ کر ضد سے بولی۔
"چلو! ٹھیک ہے۔ تمہاری مما ابھی گیٹ کے باہر موجود ہیں۔ آؤ! میں لے جاتی ہوں تمہیں۔ تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔" فوزیہ اسے بہلانے کو ذرا پاس ہو کر اس کے بکھرے بال سمیٹ کر بولی۔

مثال بے یقینی سے پھوپھی کو دیکھنے لگی۔
"آؤ نا! جلدی سے۔ کہیں تمہاری ماما چلی نہ جائیں۔" فوزیہ اسے کھینچ کر بولی۔
"ہاں۔۔۔ لے جاؤ خدا کے لیے اسے یہاں سے۔ میں کچھ دیر کے لیے سکون سے سانس تو لے لوں۔" عدیل کوفت سے بولا۔
مثال نے شکایتی نظروں سے باپ کو دیکھا۔
"مما جا چکی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ گیٹ کے باہر کوئی آواز نہیں آرہی۔" وہ مرجھائے ہوئے لہجے میں آہستہ سے بولی۔ باپ کے کوفت بھرے لہجے نے اسے کچھ اور سمجھا دیا تھا۔
"اوں ہوں۔۔۔ میں آرہی ہوں نا ابھی باہر سے۔ وہ ابھی باہر ہی رہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔ آجاؤ شاباش!" فوزیہ نے اسے پیار کیا اور اس کے بال سنوارتی زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ عدیل ساکت سا بیٹھا رہا۔

☆ ☆ ☆

اسے لگا' ابھی کسی نے اس کے گال پر تھپڑ مارا ہے۔
اس نے لیٹے لیٹے بے اختیار اپنے بائیں گال پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے لب بے اختیار مسکرانے لگے۔
"اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شاید مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ اونچی آواز میں خود سے بولا۔
کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔
ملگجی روشنی باہر گلی میں لگے پول لائٹ سے آرہی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔
اندھیرے میں دور اسے وہ منڈیر تو نظر نہیں آرہی تھی۔ جہاں وہ آکر بیٹھا کرتی تھی۔ اس کا مخصوص ٹھکانا۔ مگر اس کی نظریں وہیں تک جا کر رک گئی تھیں۔ جہاں وہ بیٹھا کرتی تھی۔
اس نے انگلیوں پر دن گننے شروع کر دیے۔
"ابھی تو مزید بارہ دن باقی ہیں اس کے آنے میں۔۔۔ یہ بارہ دن کیسے گزریں گے۔ لیکن اس بار میں اسے کھوؤں گا نہیں۔ اسے خود سے دور نہیں جانے دوں گا۔ اس سے اپنے دل کا احوال کہہ ڈالوں گا۔ اس آگ کی تپش اس تک بھی پہنچنی چاہیے جس نے اتنے مہینوں سے مجھے جلا کر بھسم کر ڈالا ہے۔"
وہ دل میں بہت سے ارادے باندھنے لگا۔
"لیکن ایک کام تو میں اس کے آنے سے پہلے کر ہی سکتا ہوں کہ اس گھر اور اس گھر میں رہنے والے مکینوں کے بارے میں ضروری معلومات لے سکوں۔ بلکہ ان بارہ دنوں میں کچھ ایسی راہ و رسم بنا سکوں کہ جب وہ آئے تو کسی طرح میں بھی اس گھر کے اندر موجود ہوں۔ وہ مجھے سامنے دیکھ کر شاکڈ رہ جائے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ میں اسے یاد نہ ہوں۔" وہ کچھ یاد کر کے مسکرایا۔
"دوبارہ میرے اتنے قریب آچکی ہے کہ ہم دونوں کی سانسیں ایک دوسرے کی سانسوں میں مدغم ہو چکی ہیں۔۔۔ تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے فراموش کر چکی ہو اور جب وہ مجھے دیکھے گی تو۔۔۔ اف! وہ نظر دنیا کا خوب صورت ترین منظر ہو گا۔ جب ہم دونوں آمنے سامنے ہوں گے اور میں اس سے سب کچھ کہہ دوں گا۔" وہ آنکھیں بند کر کے مسکراتا ہوا اس منظر کو سوچنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے فی الحال انہیں نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔ یہ صبح تک اچھی نیند لے لیں گی تو کچھ بہتر حالت میں ہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

گی۔" ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد سیدھا ہو کر آہستہ سے پیچھے کھڑے عمران اور ذکیہ سے کہا۔
بشریٰ کی آنکھیں نیم وا تھیں۔
وہ نیم بے ہوش تھی۔ اس کے کان ان کی آوازوں کو سن رہے تھے۔ مگر اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ اس وقت کسی بھی قسم کا مفہوم یا معنی سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔
بس کسی بھی طرح دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جانا چاہتی تھی۔
اس کا ذہن جیسے کسی گول گول گھومنے والے جھولے میں جھولنے لگا۔
اس کی نظروں کے سامنے چنگھاڑتا "طلاق' طلاق' طلاق کے الفاظ بولتا عدیل تھا۔ ہاتھ نچا نچا کر چیختی نسیم اور نفرت بھری نظروں سے دیکھتی فوزیہ تھی اور وہ سہما ہوا مثال کا معصوم چہرہ۔ وہ اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف لپک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ "مما' مما" کہتے نیم وا ہو رہے تھے۔
"مثال... مثال... مثال... آ... آجاؤ... آؤ... مثال! میری مثال۔" وہ نیند کی غنودگی میں بڑبڑا رہی تھی۔ ذکیہ نے روتے ہوئے بیٹی کی بے بسی کو دیکھا۔
"ڈاکٹر صاحب! یہ..." عمران متفکر سا تھا۔
"شدید گہرے ذہنی صدمے میں ہیں۔ انہیں ٹائم لگے گا سنبھلنے اور اس صدمے سے نبرد آزما ہونے میں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"مثال؟" ڈاکٹر نے استفہامیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔
"ان کی بیٹی۔" عمران دل گرفتی سے بولا۔ اس درجے شقاوت اور سنگ دلی کی ان کو عدیل اور اس کے گھر والوں سے توقع نہیں تھی۔
وہ ذکیہ کے کہنے پر دو بار فون کر چکا تھا۔ بلکہ غصے میں بپھر کر خود بھی جانا چاہتا تھا۔ مگر فی الحال بشریٰ کی حالت اسے روکے ہوئے تھی۔
اس کے خون میں ابال سے اٹھ رہے تھے کہ انہوں نے کس طرح بشریٰ کو اس حال تک پہنچایا۔ اس کے ساتھ وہاں کیا ہوا' وہ سب جاننا چاہتا تھا۔
اور سب سے بڑھ کر مثال اس کے ساتھ کیوں نہیں آئی تھی۔
"نہیں عمران! ہمیں بشریٰ کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔" ذکیہ نے آنسو پونچھ کر اسے منع کیا۔
ڈاکٹر چلا گیا تھا اور بشریٰ گہری نیند سو چکی تھی۔
"امی! میں ان لوگوں کا حشر کر دوں گا۔ انہوں نے میری بہن کو لاوارث سمجھ رکھا ہے کیا؟ جانے کیا سلوک کیا ہے آپی کے ساتھ کہ وہ اس طرح واپس آئیں۔" عمران طیش میں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔
"میری بچی بے پردہ... بغیر دوپٹے کے خالی ہاتھ' خالی جھولی' خالی گود لیے گھر کے دروازے پہ یوں لٹی پٹی کھڑی تھی۔ سمجھو' میرے دل پر تو جیسے کسی نے چھریاں چلا دیں۔ نسیم تیرا بیڑا ہی غرق ہو۔ اللہ تجھے برباد کرے۔ جیسے تو میری بیٹی کی زندگی میں کانٹے بو رہی ہے۔ اللہ تیری بیٹی کے آگے لے کر آئے۔" وہ دامن پھیلا کر کوسنے لگیں۔
"مگر اس بدبخت پر کیا اثر ہوگا۔ اللہ تو اس کی بیٹی کو پہلے ہی برباد کر چکا ہے... اور کیا برباد کرے گا۔ ہائے میری بشریٰ... لا عمران! فون دے۔ میں اس عدیل سے تو خود بات کروں... میسنا... کیسے اس نے میری بچی کو اجاڑ پجاڑ کر گھر سے روانہ کر دیا۔ میرے دل میں ابال اٹھ رہے ہیں۔" وہ دہائی دے کر بولیں۔
"امی! رات کا ایک بج رہا ہے۔ اب رہنے دیں... جو ہوگا' صبح دیکھ لیں گے۔" عمران کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔

"ارے! ہماری نیندیں' ہمارا سکون غارت کرنے والے مزے سے سوئیں اور ہم کانٹوں پر لوٹیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ میں تو ان کی زندگی حرام کر دوں گی۔ نہ جئیں گے۔ نہ مریں گے۔ سارے میں دہائی ڈالوں گی۔ نمبر ملا تو بس۔" وہ آپے سے باہر ہو کر بولیں۔
عمران نے کچھ سوچا اور پھر عدیل کا نمبر ملا کر سیل ان کے کان سے لگا دیا۔
دوسری طرف سیل آف تھا۔
"کمبخت نے فون بند کر رکھا ہے۔ ملا اس نسیم کا نمبر... انہیں تو میں قبر سے کھینچ کر لے آؤں گی۔" وہ غصے میں آکر زور سے بولیں۔
"مثال... امی... عدیل!" بشریٰ نیند میں بڑبڑاتے ہوئے سسکی سی لے کر کسمسائی۔
دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔
"امی! آپی سو رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے' وہ جتنا زیادہ سکون سے سوئیں گی۔ اتنا ہی آپی کے لیے اچھا ہے۔ ورنہ خدانخواستہ نروس بریک ڈاؤن ہونے کا خطرہ ہے یا برین ہیمبرج کا۔ آپ پلیز! انہیں آرام کرنے دیں... باہر آئیں۔" وہ آہستہ آواز میں ماں کو سمجھا کر بولا۔
بیٹی کی حالت دیکھ کر ذکیہ کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔
"تم جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں بولتی اب۔ اسے آرام کرنے دوں گی۔" وہ وہیں صوفے پر نیم دراز ہو گئیں۔
"امی! اس طرح تو آپ کی طبیعت بھی خراب ہو جائے گی۔ آپ نے دوا لے رکھی ہے۔ اگر سوئیں گی نہیں تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ آپ جانتی ہیں۔" عمران نے ماں کو سمجھایا۔
"میری قسمت خراب... نہ میں جلد بازی کرتی۔ اسے مٹھائی کی ٹوکری دے کر بھیجتی۔ میں اسی گھنٹے عدیل کو گھر بلا کر اس سے خود بات کرتی۔ خدا جانے کیا ہوا ہے۔ میرے دل کو تو جیسے پنکھے لگے جا رہے ہیں۔ نیند مجھے کہاں آئے گی۔"
وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بمشکل عمران کا سہارا لے کر اٹھ گئیں۔ دونوں باہر نکل گئے۔
"کیا... کیا..." عمران کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے سیل فون گر گیا۔
ذکیہ نے بے اختیار سینہ تھام لیا۔ عمران کی حالت سے ان کا اپنا دل بیٹھنے لگا تھا۔
"گگ... کیا ہوا عمران... کیا کہا ان لوگوں نے اور یہ عدیل نے اپنا فون کیوں بند کر رکھا ہے؟ منہ کیوں کالا ہو گیا اس کا؟ چوروں کی طرح چھپ رہا ہے ہم سے۔ کیا بک رہی تھی یہ منحوس نسیم... کیا کہتی ہے تم سے فون پر۔" وہ پھولے سانس کے ساتھ کہتی چلی گئیں۔
عمران نے جھک کر گرا ہوا سیل فون اٹھایا اور اسے مٹھی میں بھینچ لیا۔
"بول نا... گونگا ہے کیا... کیا بکواس کر رہی تھی وہ ڈائن... مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا۔ بول! جو بھی کہا ہے اس نے... ورنہ میں ابھی اس کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ بے صبرے پن سے بولتی چلی گئیں۔
"سب کچھ ختم ہو گیا ہے امی! آپی کی حالت غلط نہیں تھی... اور آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم نے واقعی جلد بازی کی۔" عمران صوفے پر گر کر رنجیدگی سے بولا۔
"عمران! بول رے... ہوا کیا ہے۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔" ذکیہ چیخیں۔
"عدیل نے بشریٰ آپی کو طلاق دے دی ہے امی۔" عمران بمشکل بولا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمیرا حمید

محبت جرم

"آج رات میرے ساتھ چلو گے۔ میرے فرینڈز نے ایک پارٹی دی ہے۔" سارس سی لمبی گردن تن گئی۔ اتنی سی بات پر وہ یہ سمجھا کہ وہ اسے اب سب سے ملوانا چاہتی ہے۔

"کیوں نہیں۔" اس نے بہت جوش سے ہامی بھری۔

جس وقت وہ اس کے ساتھ پارٹی میں گیا اس کی آن بان شان کی ہوا نکل گئی۔ پارٹی اور وہاں موجود لوگ اتنے ہائی فائی اور ہائی فیشن ایبل تھے کہ ان سب میں وہ ٹاٹ کا پیوند ہی لگ رہا تھا۔ اس نے بھی برانڈڈ چیزیں ہی پہنی ہوئی تھیں۔ جینز۔۔۔ سوٹ ہینڈ بینڈز....

جیل لگے کانوں سے اوپر کی طرف کھڑے بال چمکتا دمکتا منہ، ہونٹوں پر بلائنڈ پنگ لپ اسٹک، یہاں آنے سے پہلے گھنٹہ تو اس نے باتھ روم میں ہی گزارا تھا اگلا ایک گھنٹہ ڈریسنگ روم میں۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر یہ سب کیا ہو گیا؟

وہ سب وہاں ہالی وڈ کی فلموں کے ہیرو، ہیروئن لگ رہے تھے۔ خود کو مسٹر پاکستان سمجھنے والا صرف "مسٹر" بھی نہیں لگ رہا تھا۔

جس پہلے لڑکے سے ماریہ نے اسے ملوایا اس نے پیلے رنگ کی اسکن ٹائٹ پینٹ پہن رکھی تھی۔ سفید ململ کی طرز کے کپڑے کی شرٹ جو پیچھے گھٹنوں سے اوپر تھی اور آگے سے پیٹ تک۔۔۔ اور جب وہ حرکت کرتا تو وہ ذرا سا پیٹ پر سے اوپر اٹھ جاتی۔

مکمل ناول

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیئر اسٹائل فنی تھا۔ شوز سرخ تھے۔ گلے میں رسیاں سی پہن رکھی تھیں۔ اس سب الٹے پلٹے میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ ہر لڑکی' لڑکا اپنی جگہ پر ایک الگ برانڈ بنا گھوم رہا تھا۔ سب کے اسٹائلز مختلف تھے۔ کچھ کے عجیب تھے۔ کچھ کے عجیب تر اور اس سب میں ایک ہی چیز مشترک تھی کہ وہ سب نیلی' سبز' بھوری آنکھوں والے ایک سے بڑھ کر ایک شان دار لگ رہے تھے۔

اس کے چہرے پر در آنے والے تاثرات کو ماریہ نے طنزیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھا۔

"کیا واقعی تم میرے لیے پرفیکٹ ہو؟"

اس نے بھی اس کی نظریں پڑھ لیں۔ "سیکھ جاؤں گا یہ سب بھی۔"

کچھ دیر تو ماریہ اس کے ساتھ رہی۔ پھر غائب ہو گئی۔ وہ اکیلا ہی ادھر ادھر اٹھتا بیٹھتا رہا۔ پارٹی فائیو اسٹار ہوٹل کی چھت پر تھی۔ کچھ ہی دیر میں تمام روشنیاں گل کر دی گئیں۔ خوب ہوہا ہوئی۔ آسمان پر فائر ورک سے پہلے پھول بنے۔ پھر دس سے الٹی گنتی لکھی جانے لگی۔

"نائن۔۔۔ ایٹ۔۔۔ سیون۔" سب یک زبان کان پھاڑنے لگے۔

"سکس۔۔۔ فائیو۔۔۔ فور۔" ہر نمبر الگ رنگ سے آسمان پر جگمگاتا اور پھر پھیل کر معدوم ہو جاتا۔

"تھری۔۔۔ ٹو۔۔۔ ون۔"

"اف! اتنا شور۔" عدن نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ "ون" کے ساتھ ہی ڈانس فلور کی لائٹس روشن ہوئیں۔ صرف وہ ڈانس فلور سے ذرا ہی دور تھا۔ اس کا فلور مختلف روشنیوں سے جل بجھ رہا تھا اور فلور کے عین اوپر لگا بڑا گلوب روشن ہو گیا۔ وہاں دس جوڑے کھڑے تھے۔ وہ مختلف پوزیشنوں میں پوز بنائے جامد کھڑے تھے۔ لڑکیوں نے گھٹنوں تک اونچی فراک پہن رکھی تھی۔ اونچی ٹیل اور ہیل بہت اونچی پہنی تھیں۔ فلور کی لائٹس روشن ہوتے ہی شور کچھ دیر کو تھما۔ میوزک بجنا شروع ہوا۔ میوزک کے بجتے ہی ایک ایک کر کے ہر جوڑے نے اپنا اپنا جامد پوز توڑ کر ناچنا شروع کر دیا۔

"اوہ!" عدن کا منہ کھل گیا۔ چوڑے بڑے گول فلور پر اس کی نظر ماریہ پر پڑی۔ وہ جس لڑکے کے ساتھ تھی اس کی شخصیت کے سحر کے سامنے وہ خود کو ہیچ گئی تھی۔

دو گھنٹے تک اس فلور پر ڈانس ہوتا رہا۔ ہارنے والے ساتھ ساتھ نکلتے رہے۔ دس سے چھ اور چھ سے چار رہ گئے۔ تیسرے نمبر پر ماریہ بھی باہر آ گئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ پسینے سے گیلی ہو رہی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی فراک اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی تھی۔ دونوں نے اتنے کمال کا ڈانس کیا تھا کہ عدن حسد سے جل کر خاک ہو گیا۔ یہ امریکی ہر کام میں اتنے آگے کیوں ہوتے ہیں اور اتنے باکمال۔۔۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد ریکس نے ڈانس فلور پر مون واک کی اور مون واک کرتے وہ مائیکل جیکسن کا باپ لگ رہا تھا۔ ایک طرف کھڑی ماریہ جوش سے "ہاؤ' واؤ" کرتی رہی۔ اگر عدن اس سے اتنا حسد نہ کر رہا ہوتا تو وہ بھی تالی مارتا اور "واؤ' واؤ" ضرور کرتا اس کے ایسے شان دار بے عیب ڈانس پیش کرنے پر۔۔۔

عدن کو اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ اسی لیے اسے پارٹی میں لائی تھی۔ اب اگر مذاق میں ہی سہی وہ دونوں کا ڈانس مقابلہ کروا لیتی تو سب عدن کا ڈانس دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ بہت کھرے اور کمال انداز سے ماریہ نے اسے جواب دیا تھا۔ امریکن ہیرو کے سامنے تو وہ زیرو ہی تھا نا' اپنے گروپ میں وہ بے شک باکمال تھا۔

چند مہینے وہ ماریہ کے عشق میں گھلتا رہا۔ کبھی طیش میں آ جاتا کہ ماریہ کو ضرور مزا چکھائے گا۔ یہ اس کی پہلی بھرپور بے عزتی تھی' جو کسی نے کی تھی۔ خاص کر کسی لڑکی نے۔ وہ بھولا تو نہیں' لیکن یاد کر کے تکلیف بھی ہوتی۔ جب پاپا پوچھتے۔

"ماریہ کو فون کیا۔۔۔ ہائے ہیلو کیا اس سے؟" تو وہ

نئے سرے سے آ جاتا۔

پھر وہ کبھی امریکا نہیں گیا۔ پاپا ہی اسے لے کر جاتے تھے۔ وہ سال بعد جب وہ جانے لگے اور اسے بھی ساتھ لے جانا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اگلے چکروں میں انہیں بھی اندازہ ہو گیا کہ ماریہ نامی چیز ان کے ساتھ آنے والی نہیں اور اب یہ ماریہ نامی چیز ان کے گھر آئی تھی مہمان بن کر۔ ہمیشہ کی طرح کم گو تھی۔ اپنے آپ میں ہی تھی۔ لان میں ڈنر کے دوران اس کے ڈیڈ ہی اس کی پلیٹ بھرتے رہے۔ منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کچھ کہتے تو وہ مسکرانے لگتی۔ عدن کو محسوس ہوا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔ اس کے انداز سے دھماکہ خیزی غائب تھی۔ وہ جو اسے اپنے انسان اور ماریہ ہونے پر فخر تھا۔ آج وہ فخر اس کی ذات میں سے نہیں جھلک رہا تھا۔ اسے فخر تھا کہ اس کی مام ازبکستان کی ہیں اور وہ ازبک بیوٹی ہے۔

"کتنی بار سرجری کروا چکی ہو؟" اس نے موقع ملتے ہی اس کے کان میں سرگوشی کی۔

اس نے سوالیہ انداز لیے دیکھا۔

"اب تو شاہکار بن چکی ہو۔"

ایک دم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی اور یہ پھیلی مسکراہٹ تھی جس میں طنز اور تمسخر نہیں تھا۔

"فلرٹ کر رہے ہو؟" آنکھیں ترچھی کیں۔

"آٹھ سال پہلے ایسا صدمہ ملا تھا کہ اس قابل بھی نہ رہا۔" ماریہ کی آنکھوں میں سوچ سی در آئی۔ جیسے وہ یاد کرنا چاہ رہی تھی کہ اس نے کیا کیا تھا۔

"تو وہ صدمہ تھا؟"

"صدمے سے بڑھ کر۔" اسے دیکھتے ہی سب کچھ عدن کی زبان سے نکلتا ہی چلا گیا۔ اس نے خود کو نہیں روکا۔

ماضی کا ہی سہی ریکارڈ کو خراب نہیں ہونے دینا چاہیے۔ ایک بار وہ اس میں مبتلا ہوا تھا۔ ایک بار تو ماریہ کو بھی اس میں مبتلا ہونا چاہیے تھا۔

"اوکے۔۔۔ میں جاننا چاہوں گی' کیا تھا وہ؟"

"بتانے کے لیے تو مجھے ساری عمر چاہیے۔۔۔ ہے تمہارے پاس اتنا وقت؟ ساتھ ساتھ بتاتا جاؤں گا۔"

وہ اتنی زور سے ہنسی کہ گردن موڑ کر اس کی مام اور ڈیڈ نے اسے دیکھا اور یہی کام عدن کے ماما' پاپا نے کیا۔ غلام علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ منظر بے حد حسین لگا انہیں اور اس منظر سے بنتا پس منظر بھی۔

"کمال ہو جائے گا۔" دل میں سوچا۔ "کمال ہی ہو جائے گا۔"

ڈنر کے بعد ان کے اصرار کے باوجود وہ ان کے گھر نہیں رکے۔ اگلے دن عدن ہوٹل چلا گیا۔ ماریہ کو لے کر مختلف جگہیں گھمائیں اور وہ ساتھ ساتھ رہی۔ ہنس بھی دیتی تھی۔ بول بھی لیتی تھی۔ چند دن وہ اسے ایسے ہی لیے گھومتا رہا۔ دو بار اس کے مام ڈیڈ پھر ان کے گھر آ گئے۔ عدن سے بھی لمبی لمبی باتیں کیں۔ ادھر ادھر کے کئی سوال پوچھے۔

"اب آگے کیا کرو گے؟" انداز ایسا تھا کہ کتنے پانی میں ہو میاں؟

"اپنا اسپتال بناؤں گا۔ اسی کے لیے پلاننگ کر رہا ہوں۔"

"سرجن نہیں بننا؟"

"اس کے بارے میں چند سال بعد سوچوں گا۔"

"یعنی ابھی پیسے بنانا چاہتے ہو۔ اپنے باپ پر گئے ہو۔" عدن کو برا تو لگا۔ لیکن ان کے مقام (دولت کے مقام) کو دیکھ کر خاموش ہی رہا۔

"شادی کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟"

"کوئی نہ کوئی تو مجھے پسند کر ہی لے گا۔" بہت بھونڈے انداز سے انکساری دکھائی گئی۔

"تمہاری بھی کوئی پسند ہو گی؟" سگار کو منہ میں لیا اور تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"جو تھی' اسے بتا دیا تھا۔" آنکھوں کا زاویہ ذرا دور بیٹھی ماریہ کی طرف موڑا۔ وہ دونوں اردو میں بات کر رہے تھے اور ماریہ اردو بہت کم سمجھتی تھی۔

انہوں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور کمال انداز سے نظریں واپس موڑیں کہ وہ جان نہ سکے کہ وہ اس کی نظر کے تعاقب میں گئے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کالج کے زمانے میں تمہارے باپ کے بہت معاشقے چلے تھے۔" اتنا کہہ کر وہ جتاتی قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"اپنے بارے میں بتاؤ! کیا کیا، کیا کالج میں؟" اتنا کہتے انداز سرگوشی جیسا ہوگیا۔ جیسے دو دوست آپس میں بیٹھ کر رازداری کی باتیں کرتے ہیں۔

عدن کو اندازہ ہوگیا کہ اس انسان نے امریکا میں اسٹورز کی چین کیسے بنالی۔ نظر کی نظر پر تھی ان کی۔

"چلو! جوانی میں سب چلتا ہے۔ کیا خیال ہے؟" بہت عقل والے انسان تھے۔ سیدھی طرح بات بھی نہیں کررہے تھے اور سب سیدھے جواب بھی لے رہے تھے۔

اس نے ناچار سر ہلا دیا۔ ماریہ سے متعلق اشاروں میں بھی ابھی کوئی بات نہیں کی تھی اور خود سارے اشارے اکٹھے کررہے تھے۔

"تمہاری ایک بات مجھے پسند ہے۔ تم میں تحمل بہت ہے۔ میری اور غلام علی کی بہت بار لڑائی ہوئی۔ لڑائی بھی کیا... صرف میں ہی لڑا۔ لیکن غلام علی نے جی جان سے دوستی نبھائی۔" پھر جتاتی قہقہہ بلند ہوا۔ "وہی تحمل مجھے تم میں نظر آرہا ہے۔"

نہ جانے یہ تعریف کا کون سا انداز تھا۔ عدن خوش نہیں ہوسکا۔

اس رات وہ واپس گئے تو غلام علی غلام نے عدن کو بڑھ کر سینے سے لگالیا۔

"ڈیر سن... مبارک ہو۔"

وہ سمجھا ہی نہیں۔

"تم نے کیا جادو کیا ہے آغا پر؟ وہ خود کہہ گیا ہے تمہارے اور ماریہ کے لیے۔ مجھے امید تو تھی، لیکن اس طرح کی، بہت سی امیدیں وہ دلائے رکھتا ہے۔ بہت بار میں نے اسے اپنا پارٹنر بننے کے لیے کہا۔ لیکن بنا نہیں۔ اس بار... مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ... کہہ رہا تھا امریکا میں ہی اسپتال بن جائے گا۔"

جو کچھ ہورہا تھا، وہ عدن کے سامنے ہی تھا۔ لیکن اس اچانک خبر پر وہ بوکھلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ماریہ کبھی نہیں مانے گی۔ اب وہ کیسے مان گئی، کس وجہ سے؟

"ہوسکتا ہے انہوں نے ماریہ سے نہ پوچھا ہو۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آغا کچے کام کرتا ہی نہیں ہے۔"

عدن بہت سی کیفیات کا ایک دم شکار ہوا۔ پہلی کیفیت حیرانی کی تھی۔ خود پر حیرانی۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ تو ماریہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا اور اتنے سال وہ ماریہ کو ہی دوسری لڑکیوں میں ڈھونڈتا رہا ہے۔ وہی اس کی پہلی پسند اور محبت تھی۔ تھوڑی بگڑی ہوئی تھی۔ لیکن ٹھیک ہوجائے گی۔ اس کے عورتوں کے لیے مقرر کیے گئے معیار سے ذرا آگے پیچھے تھی۔ لیکن اتنا تو چل ہی جاتا ہے اور پھر اس سے زیادہ نادر موقع کہاں ملے گا، ماریہ کو اپنے آگے پیچھے گھمانے کا، اس سے بدلہ لینے کا، اسے اپنی محبت میں مبتلا کرنے کا، شوہر بن کر اسے ہرانے کا۔

دوسری کیفیت میں اسے افق یاد آئی۔ آج کل وہ اس سے بات نہیں کررہا تھا۔ ایک آدھ میسج بھیجا تھا۔ افق سے متعلق کیفیت بہت عجیب تھی۔ اسے اب احساس ہورہا تھا کہ افق دراصل ماریہ کا ہی نعم البدل تھی۔ ماریہ جتنی ہی حسین، لیکن افق صرف حسین تھی۔ ماریہ سب کچھ تھی۔ ماریہ تو اتنا کچھ تھی کہ وہ اس کے سامنے خود کو بونا سمجھتا تھا۔ ماریہ ہی اس کی ٹکر کی لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی، جسے دھکا دے کر یہ نہ کہا جاسکے کہ "جاؤ! مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔" جس کا فون نہ اٹھایا جائے۔ ایک ایسی لڑکی نہیں ہو روتی ہے، رلاتی ہے۔

کھڑے کھڑے عدن، ماریہ اور افق کو اوپر نیچے کررہا تھا۔ اس نے سوچا کہ زندگی کا مزہ ایک ایسی ہی لڑکی کے ساتھ ہے، جو غلطی بھی کرے۔ ناراض بھی خود ہی ہوجائے اور کان پکڑ کر "سوری" بھی کہلوائے۔ ایسے نہیں کہ وہ خود ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگے۔

عدن بہت ذہین تھا۔ ایسے ہی نہیں وہ دو دن میں ایک کتاب ہضم کرکے ٹاپ کرجاتا تھا۔ تبدیلی کو پہچانتا تھا۔ خاص کر کسی کو جواب دہ نہیں تھا۔ اس نے

لڑکیوں سے دوستی کی تھی اور سب ہی اچھی تھیں۔ لیکن افق ان سب میں اچھی تھی اور اچھے لوگ اچھی زندگی کے ضامن نہیں ہوتے۔ وہ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ برے لوگ انہیں روند کر ان کی لاشوں پر اپنے محل بنالیتے ہیں۔ تو ایسے روندے جانے والوں کے ساتھ کون زندگی گزارے۔

غلام علی غلام نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ وہ اپنا باپ خود نہیں ہے۔ وہ اپنے خون کو جانتے تھے۔ جس محبت، محبت کی رٹ اس نے لگائی تھی۔ ایسی رٹ تو وہ آئندہ زندگی میں بھی بہت بار لگائے گا۔ محبت تو اسے بہت بار ہوگی۔ ہر محبت کو وہ حاصل کرنا چاہے گا اور ہر محبت کو بھول بھی جائے گا۔ یہ محبتیں ساحل پر قدموں کے نشانات سے بھی کم وقتی اور کمتر ہوتی ہیں۔ بظاہر پاؤں ریت میں بری طرح سے دھنس کر پورا مکمل نشان بناتے ہیں۔ اور... اور سمندر کی ایک معمولی لہر اس معمولی نشان کو اس کی اوقات دکھا جاتی ہے۔

وہ ماریہ کو ڈنر کے لیے لے گیا اور جس وقت وہ ماریہ کو انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت افق روتی ہوئی گھر سے باہر نکلی۔

"بھابھی جی!" دھاڑ سے ان کا دروازہ کھول کر وہ چلائی۔ وہ سب رات کا کھانا کھا رہے تھے۔

"بھابھی جی...! اماں..." ننگے پاؤں بنا دوپٹے کے وہ کھڑی تھی۔ وہ سب فوراً اٹھے۔ اس کے ساتھ لپکے۔ اماں کچن میں چولہے کے پاس بے ہوش پڑی تھیں۔ افق زار و قطار رو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بھابھی کے ساتھ جاکر اماں نے سرکاری اسپتال سے ٹیسٹ کروائے تھے ٹیسٹ ٹھیک نہیں تھے یا انہیں کرنے اور پڑھنے والے ڈاکٹر۔ سرکاری اسپتال سے ہی انہیں دوائیں مل گئیں۔ وہ کھاتی رہیں۔ درد پھر بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ جیسے تیسے اسکول چلی جاتیں۔ آرسو جاتیں۔ نہ ظاہر کرتیں۔ نہ ہی بتاتیں کہ کتنا درد ہے۔ بس دوا کھالیتیں۔ درد کو چھپائے رکھتیں۔

"ابھی ٹھیک ہوجائے گا... ابھی ہوجائے گا۔" کرتے کرتے انہیں باورچی خانے میں چولہے کے پاس پہلا ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہیں اٹھا کر اسپتال لے جانے تک دوسرا ہوا۔ جمال اور اسد پریس گئے تھے۔ افق ہاتھ پیر مسلتی رہی۔ بھابھی گود میں سر رکھے بیٹھی رہیں۔ جھاگ سی ان کے منہ سے نکلنے لگی۔ بے جان سی ہوگئیں۔

"اماں...!" وہ پاگلوں کی طرح انہیں پکار رہی تھی۔

اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں آگ کیسے لگتی ہے۔ جسم سے جان کیسے نکلتی ہے۔ بے سہارا رہ جانے کا اصل مطلب کیا ہے۔ قیامت کسے کہتے ہیں۔

ایمرجنسی میں تیسرا اٹیک ہونے سے ڈاکٹرز نے انہیں بچالیا۔ بھابھی کے شوہر اور ان کے سسر ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ بھابھی خود حالات کے پیش نظر بری خبر کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

دو دن اماں ایمرجنسی میں رہیں۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کھری کھری سنا رہا تھا۔

"جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو لے آتے ہیں۔ تیسرے اٹیک سے کیسے ہم نے بچایا ہے۔ ہم ہی جانتے ہیں۔ ابھی بھی ان کی حالت بہت پیچیدہ ہے۔ نہ معلوم کن ڈاکٹروں کے پاس ان کا علاج ہو مار رہا ہے۔"

بھابھی اور ان کے شوہر سر جھکائے سنتے رہے۔ ماموں کو فون کردیا تھا۔ وہ ایک، دو دن میں آنے کا کہہ رہے تھے۔ چچا دو گھنٹے گزار کر جاچکے تھے۔ اکلوتی پھوپھی ملتان میں رہتی تھیں۔ فون کرکے انہوں نے بھی حال چال پوچھ لیا تھا۔ جمال اور اسد کو بھابھی نے ناشتا کرادیا اور اس کے لیے بھی بنا کر ان کے ہاتھ اسپتال بھیج دیا۔ دوپہر کے بعد بھابھی بھی آجاتیں۔ شام کو ان کے شوہر آجاتے۔ ڈاکٹر سے بات کرتے۔ ضروری دوائیاں لادیتے۔ اسد اور جمال کے پریس کے مالک نے پیسوں سے کچھ امداد کی تھی۔ وہی پیسے استعمال میں آرہے تھے۔ تین دن سے وہ بہن، بھائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سہمے سہمے آنے والے وقت سے ڈرتے رہے کہ اب کیا ہو۔۔۔ اب کیا ہو جائے۔ ان کی پیاری صورتیں مرجھا گئیں۔ ان کی اماں ایمرجنسی میں تھیں۔ زندگی اور موت کے درمیان۔ زندگی کو جھیلنے کے لیے وہ تین اکیلے تھے۔۔۔ کم تھے۔

اسد اور جمال اپنی ماں کے ہمت اور حوصلے کے سکھائے سارے سبق بھول گئے اور افق کے سینے سے لگ کر خوب روئے۔ بار بار اس سے پوچھتے۔

"اماں ٹھیک ہو جائیں گی نا۔۔۔ باجی! بتاؤ نا' کب ٹھیک ہوں گی؟"

باجی خود سر ہلا کر روتی رہتی۔ ان تین دنوں میں اس نے بار بار اپنے سر پر آسمان گرتے دیکھا۔ خود کو بھرے بازار میں بے یار و مددگار کھڑے دیکھا۔ جنگل میں گم ہوتے دیکھا۔ اس پر دکھ کا ہر احساس ہو ہو کر گزرا۔ ہر احساس نے اسے پنجے مارا۔ ڈر کے مارے اس کا اپنا دم نکل گیا۔ اس نے دل سے یہ خواہش کی کہ کاش! اپنی ماں کی جگہ پر وہ ہوتی۔ تین دن اور تین راتیں وہ احساسات کے لمبے لمبے سفروں سے ہو کر آئی۔ دعائیں مانگتی رہی۔ گڑگڑاتی رہی۔

آس پاس کے چند دور و نزدیک کے رشتے دار آکر دیکھ کر چلے گئے۔ اماں کے اسکول کی پرنسپل آئیں۔ اسٹاف آیا۔ ان سب کے اس طرح آنے پر افق اور ڈر گئی۔ تین دن بعد اماں کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد وہ گھر آگئیں۔ ان سمیت گھر میں سب کو چپ لگ گئی۔

ماموں فیصل آباد سے ایک اور بار ہو کر چلے گئے۔ اس کا جی چاہا کہ ماموں کے قدموں میں گر جائے۔

"خدارا ہماری مدد کیجیے۔ ڈاکٹر نے اتنی خطرناک باتیں کی ہیں اور نہیں تو آپ زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ چل کر ڈاکٹر کی بات اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ وہ تو نہ جانے کیا' کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟"

اتنے سوال تھے افق کے پاس۔ اس نے چند ایک پوچھے۔ ماموں نے اسے اچھے سے تسلی دے دی۔

☆ ☆ ☆

"کچھ بنا افق؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ سر پھر گھٹنوں میں دے لیا۔

"ماموں کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں۔ علاج سے اچھا پرہیز ہے۔ اچھی خوراک کھائیں۔ دوا لیں۔ ورزش کریں۔ ڈاکٹروں کی تو عادت ہوتی ہے بکواس کرنے کی۔" وہ رٹے ہوئے انداز میں بولی۔

"اور چچا۔۔۔؟ انہیں بلاؤ' یہاں۔"

"انہوں نے کہا کہ پیسوں کا انتظام ہو جائے تو میں انہیں یہاں بلا لوں۔ وہ ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔"

"اب کیا ہو گا افق؟" وہ بے چاری بہت گھبرائی اور پریشان تھیں۔ افق کی ہاں' اپنی منہ بولی خالہ کے لیے۔ افق ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ پھر رونے لگی۔

"بھابھی جی! کچھ کریں۔ میری اماں کو۔۔۔ کچھ ہونہ جائے۔"

بھابھی بے چاری خود سفید پوش گھرانے سے تھیں۔ اس سب کے دوران ان کے بھی چند ہزار لگ گئے تھے۔ مزید اور بھی چند ہزار ہی دے سکتی تھیں۔ انہوں نے ہی اپنے بھائی سے اسلام آباد بات کی۔ وہ وہاں سی ایم ایچ میں ملازم تھا۔ اس نے اپنے بی ہاف پر تھوڑے بہت ڈسکاؤنٹ کی بات کی۔ لیکن اس سب پر بھی انہیں بائی پاس سرجری کے لیے کافی پیسے چاہیے تھے۔ ڈاکٹر نے صاف صاف کہا تھا کہ اگر مریض کو بچانا ہے تو انتظار کرو۔ چند ماہ ہی لگیں گے۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو فوراً" بائی پاس کروا لو۔ یہ بات بھابھی کے شوہر نے اپنے گھر بلا کر کی تھی۔ رپورٹس ان کے پاس تھیں۔ انہوں نے اسلام آباد اپنے سالے سے بھی بات کر لی تھی۔ وہ جتنی مدد کر سکتا تھا۔ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اپنے گھر رکھنے' خدمت کرنے' باقی بھاگ دوڑ کرنے کے لیے تیار تھا۔

باقی مسئلہ صرف پیسہ تھا۔ اسکول کی میڈم اور اسٹاف پہلے ہی پندرہ ہزار دے چکے تھے۔ اماں کا علاج ایک نیم سرکاری اسپتال سے ہوا تھا۔ بہت سے اخراجات انہیں خود اٹھانے پڑے تھے۔ اسد اور جمال بیس ہزار اور لے آئے تھے اپنے استاد سے۔ ان کے خود کے پاس تو صرف تین ہزار روپے تھے۔ اب کوئی ایسا شخص نہیں بچا تھا جس سے وہ پیسے لے سکتے تھے۔

افق اسکول کی میڈم کے پاس ہی گئی۔ انہوں نے دس ہزار اور دے دیے تھے۔ جو مدد کرنے والے تھے۔ وہ پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کی اپنی چادریں محدود تھیں اور جن کی محدود نہیں تھیں' وہ مدد کرنے والے نہیں تھے۔ ان کے پاس ہونے کے نام پر ایک چھلا بھی نہیں تھا کہ جسے بیچ دیتے۔ گھر کا محدود سامان تھا۔ محدود تعلقات تھے اور بس۔۔۔ اماں بستر کی ہو کر رہ گئیں۔

ایک ایک روپیہ بچانے کے لیے وہ تین بہن' بھائی ایک ہی وقت کی روٹی پر آگئے۔ وہ بھوکے بھی رہ سکتے تھے۔ انہیں اپنی جان سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ پیٹ تو بالکل بھی نہیں تھا۔ اماں کے لیے ڈاکٹر نے ایک چارٹ دیا تھا۔ خوراک کا۔۔۔ انہیں ہر صورت وہی دینا تھا۔

رات گئے اماں سو جاتیں تو تینوں بہن' بھائی باورچی خانہ میں بیٹھ کر چپکے چپکے باتیں کرتے۔

"افق باجی! کچھ کرو نا۔" جمال کو ڈاکٹر کی بات پر بڑا یقین تھا۔ اس نے چند مہینے ہی کہا ہے تو ایسا ہی ہو گا۔

محبت اور پناہ کے نام کے اکلوتے سہارے کے بارے میں اگر کوئی ایسی پیش گوئی کر دے تو کیا ہوتا ہے۔ بہت کچھ ہوتا ہے۔ بس وہ نظر نہیں آتا۔ جن پر سے ہو کر گزرنا ہے۔ انہیں ہی معلوم ہوتا ہے۔

"میں دعا کرتی ہوں۔" تسلی کے نام پر اس کے بس یہی الفاظ تھے۔

"وہ تو میں بھی کرتا ہوں۔" اسد بولا۔

وہ تینوں ایسے نظر آتے تھے۔ جیسے تینوں کا بالٹی بالٹی بھر خون نکال کر بہا دیا گیا ہو۔

"جاؤ! سو جاؤ تم۔۔۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے افق باجی!" انار کلی کی سنسان سڑکوں اور گلیوں سے رات گئے اکیلے آنے والے کو اب ڈر لگ رہا تھا۔

"مجھے بھی لگتا ہے۔" جمال بھی بولا۔

"مجھے بھی۔۔۔" افق نے سوچا۔۔۔ بولی نہیں۔

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ اب وہ بار بار اٹھ اٹھ کر اماں کو دیکھیں گے کہ ان کی سانسیں چل رہی ہیں نا۔ وہ کچن میں ہی چوکی پر بیٹھی رہ گئی۔ فون اس کی گود میں تھا۔ اس نے عدن کا نمبر پھر سے ملایا۔ فون بند جا رہا تھا۔ جب اماں ایمرجنسی میں تھیں تو تین دن بعد اس نے فون کیا تھا۔ فون تب بھی بند ہی ملا تھا۔ فون اس سے ایک ہفتہ پہلے سے ہی بند مل رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کے ایک' دو میسجز آگئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ "وہ آج کل بہت مصروف ہے اور نہ جانے کب تک فارغ ہو۔ وہ خود رابطہ کرے گا۔"

جس وقت افق باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ اس وقت تک وہ اپنے نکاح سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کی چند دوسری دوست لڑکیوں تک اس کی شادی کی خبر پہنچی تو وہ اسے فون پر فون کرنے لگیں۔ یہ وہ چند لڑکیاں تھیں۔ جن کا خیال تھا کہ وہ ان سے شادی کرے گا۔ وہ اسے اپنی فیملی سے بھی ملوا چکی تھیں۔ عدن کے پاس ایک پرسنل نمبر بھی تھا' جو صرف فیملی اور چند قریبی دوستوں کے لیے ہی تھا۔ دوسرے نمبر پر اس کے ہر طرح کے رابطے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ان لڑکیوں نے پرسنل نمبر تک بھی رسائی حاصل کر ہی لی۔

ان کے نمبر حاصل کرتے ہی اس نے پرسنل سم کو جس سے وہ افق سے بات کیا کرتا تھا۔ اپنے کمرے کے باتھ روم کے فلیش میں بہا دیا۔ وہ نیا اکلوتا نمبر استعمال کرنے لگا۔ پہلے اس نے ایک بار سوچا کہ وہ افق کو فون کرے اور اسے بتائے کہ اس کے پاپا نہیں مان رہے۔ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کی صحت کی خاطر وہ ان کی پسند سے شادی کر رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھر اس نے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ ایک تو اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ دوسرا افق کے لیے تو بالکل نہیں تھا اور پھر اس نے افق کے ساتھ کیا ہی کیا تھا؟ ہاتھ تک تو کبھی اسے لگایا نہیں تھا۔ صرف بات ہی کی تھی نا۔ نہ کبھی ڈیٹ پر لے کر گیا۔

یہ سب سوچتے اس کے اندر کہیں ایک ہلکی سی خلش ضرور تھی۔ بے حد معمولی۔ اور یہ معمولی سی خلش بھی دلہن بنی ماریہ کو دیکھ کر جاتی رہی۔

شادی کے دوسرے ہی دن وہ لوگ دبئی آ گئے۔ اتنی سی بات تھی۔ اس سب میں نہ کوئی نقصان ہوا نہ ہی گھاٹا۔ جب ہم کسی ایک چیز سے دور ہوتے ہیں تو کسی دوسری چیز کے قریب ہو ہی جاتے ہیں۔ یقین جانیے یہ فلسفہ بالکل سچا ہے۔ جیسے رات کے بعد دن کا آنا۔ یہ فلسفہ عدن جیسے لوگوں کے لیے ہے۔ ان ہی پر صادق آتا ہے۔

☆ ☆ ☆

افق کے پاس اب کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں بچا تھا جس کے پاس جا کر وہ پیسے لے آتی۔ مدد اور سہارے کے نام پر اس کے پاس ایک ہی انسان تھا۔

"اماں۔"

اسپتال سے آئے اماں کو تین ہفتے گزر گئے تھے۔ ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سفید رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اس دوران وہ ایک بار پھر چیک اپ کے لیے گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے پرانی ہی بات کی افق سے۔ افق کا منہ لٹک گیا۔

سرکاری اسپتال والوں نے تو پہلے ہی اماں کو مار دیا تھا "سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔" کہہ کہہ کر وہ نہ درد کو پکڑ سکے۔ نہ ہی مرض کو۔ اب وہ کیا کریں گے۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ افق پاگلوں کی طرح امان کو فون کرتی رہتی تھی۔ میسج لکھتی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ وہ خود اتنی پریشان تھی کہ اس نے سوچا ہی نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا فون اتنے دنوں سے کیوں بند ہے۔

چوتھے ہفتے اماں کے سینے میں درد اٹھا۔ بھابھی کے ساتھ حواس باختہ وہ ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ وہ دونوں کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "اب بھگتو۔"

رات بھر اماں درد کو برداشت کرتی رہیں۔ آہ نہیں کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا وجود بتا رہا تھا کہ ان کے اندر کیا چل رہا ہے۔ وہ تینوں دم سادھے ان کے پاس بیٹھے تھے۔ اسد اور جمال ان کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ افق کبھی ہاتھ سہلاتی، کبھی سینہ۔ رات ان سب نے سولی پر گزاری۔

صبح ہوتے ہی افق بڑی سی چادر میں لپٹ کر ڈی ایچ اے آ گئی۔ یہ خیال اسے پہلے بھی آیا تھا۔ لیکن چاہ کر بھی وہ جا نہ سکی۔ ہر دن یہی سوچتی آج تو امان ضرور ہی فون کرے گا۔

آج آج کرتے کئی ہفتے گزر گئے۔ اس کے گھر سے اس کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔ کوئی دوست مل جائے گا۔ ورنہ کوئی ملازم تو ضرور ہی ہو گا۔ کوئی پیغام دے سکتی ہے وہ انہیں۔ رکشہ کروا کر وہ عین اس کے گھر کے باہر رکی۔ بیل دی۔ پھوٹا دروازہ کھولا گیا۔

"السلام علیکم جی۔۔۔ وہ امان ہے؟" چوکیدار کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"امان۔۔۔" اس نے سوچا۔۔۔ "گورا صاحب۔۔۔؟"

گورا تو وہ بہت تھا۔ افق نے سر ہلا دیا۔ "وہ ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہاں ہیں وہ۔۔۔؟"

"وہ صاب لوگ ہیں۔ نہ ہمیں بتاتے ہیں۔ نہ ہم پوچھتے ہیں۔" خان نے غصہ نہیں کیا، لیکن چڑ گیا۔

"ان کا کوئی فون نمبر ہو تو مجھے دے دیں جی! میں بہت پریشان ہوں۔"

اتنا کہتے اس کی آواز بھیگ گئی اور اس کے ساتھ ہی پورچ میں تھوڑا سا شور ہوا۔ چوکیدار نے جھٹ بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ طویل پورچ سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کار پر نظر پڑتے ہی افق چوکیدار سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ "کار میں کون ہے۔ کیا اس کا کوئی دوست۔۔۔" لیکن چوکیدار اندر کی طرف دوسرے دروازے کے پاس کھڑا تھا اور وہ گیٹ کے باہر چھوٹے دروازے کی طرف۔ لمبی شان دار کار باہر نکلی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے سیاہ، سفید، گھنی اوپر کی طرف اٹھی مونچھوں والے شخص کی نظر ایسے ہی لمبی سی چادر میں لپٹی لڑکی پر پڑ گئی۔ اس نے نظر پڑتے ہی کار کو روکنے کا اشارہ دیا۔ چوکیدار بھاگا گھڑکی تک گیا۔

"کون ہے یہ؟"

"گورا صاحب کا پوچھ رہی ہے جناب۔"

"عدن کا؟" یہ کہتے ایک اور نظر اس پر ڈالی۔ دراصل جو پہلی نظر پڑ گئی تھی، وہی واپس مشکل سے پلٹائی تھی۔ اپنے زمانے میں وہ رنگین مزاج مشہور تھے۔ آج بھی اکثر اٹھی نظریں اس خطاب کی گواہی دے جاتی تھیں۔ سیاہ چادر میں پریشان صورت حسن پر دوسری نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ کون ہے۔ اپنے خون کو جانتے تھے۔ اگر وہ اس پر فدا ہوا تھا تو غلط نہیں ہوا تھا۔

ڈرائیور نے کار واپس پیچھے کر لی۔ کار سے اتر کر وہ اندر چلے گئے۔ افق کو لے کر چوکیدار اندر آ گیا۔

اس نے صرف اتنا ہی کہا "آؤ ہمارے ساتھ۔" یہ نہیں بتایا کہ یہ صاحب کون ہیں۔

ڈرائنگ روم کے چوڑے لکڑی کے منقش دروازے کے لیے عین سامنے بڑے سفید رنگ کے صوفے پر وہ مونچھوں والا، دونوں ہاتھوں کو صوفے کی پشت پر دائیں بائیں پھیلائے، دائیں پیر کو بائیں گھٹنے پر رکھے شان سے بیٹھا تھا۔

نظر پڑتے ہی افق نے چادر سنبھالتے سلام کیا۔ ان آنکھوں کی طرف اس کی پہلی نظر ملی تو دوبارہ ان کی طرف دیکھتے رہنے کی اس کی ہمت جاتی رہی۔

"جیتی رہو!" سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہاں اس بار اسے نیچے تک دیکھا۔

ان کے سامنے رکھے ایک صوفے پر وہ بیٹھ گئی۔

"اب بولو۔۔۔"

اس انداز پر وہ گھبرا گئی۔ کیا بولے۔۔۔ کہ امان کہاں ہے؟ اپنے باپ کی عمر کے شخص کے سامنے۔۔۔ کیسے؟

"کون ہو تم لڑکی؟" لہجے میں اس سوال سے ہی اتنی ہتک نمایاں کر دی گئی کہ اس کی رہی سہی ہمت جاتی رہی۔

"افق۔۔۔" وہ بمشکل بولی۔ نظریں لکڑی کے چمکتے فرش پر تھیں۔

"نام سے مجھے مطلب نہیں ہے۔ کام بولو۔ کون ہو، کیا ہو، یہاں کیوں آئی ہو؟" کمال کے فنکار بنے تھے اس وقت۔ جان بوجھ کر ہتک آمیز انداز اپنا رہے تھے۔ وہ بالکل ہی ہنس ہو گئی۔ جی چاہا بھاگ جائے۔

"مجھے امان سے ملنا تھا جی۔" جب وہ کمزور سی نالائق سی ہو جاتی تو بہت جی، جی کرتی۔

"امان کون؟" وہ جانتے تو تھے کہ ان کے سیالکوٹیے بیٹے نے ایک عدد فیشن ایبل نام رکھا ہوا ہے اپنا گلاہور شہر میں۔ لیکن انجان بن گئے۔

اب وہ سٹپٹا گئی۔ اسے لگا۔ سامنے بیٹھا شخص ضرور ہی امان کا باپ ہے۔ ورنہ کوئی انکل ہو گا۔ اس کے گھر میں اس کے جاننے والے ہی ہوں گے نا۔

"عدن۔" اس نے گھگھیا کر اس کا نام لیا، امان نے اسے اپنا اصل نام بتا تو دیا تھا۔ ساتھ ہی منع بھی کیا تھا کہ وہ اسے کبھی اس نام سے نہ پکارے اور اصل نام اس نے اسے دیکھنے کے بعد بتایا تھا۔ ورنہ اکثر لڑکیاں تو اس کا اصل نام جانتی ہی نہیں تھیں۔

"عدن؟" حیران ہونے کی اداکاری کی۔ "تمہارا کیا لگتا ہے وہ؟ کیسے جانتی ہو تم اسے؟"

وہ جینز، ٹی شرٹ میں کٹے بالوں اور بنا دوپٹے کے آئی ہوتی تو اس سے یہ سوال نہ پوچھے جاتے اور ایسے حلیے میں آئی کوئی بھی لڑکی بہت مزے سے کہہ جاتی۔ "ہو دا ہیل آر یو ٹو آسک۔" (تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے)۔

الفاظ کو اس انداز سے ڈھالا گیا۔ جیسے عدن کوئی سات پردوں میں رہنے والا مرد ہے۔ نظریں نیچی رکھنے والا، ٹخنوں سے اونچی شلوار پہننے والا اور سامنے بیٹھا شخص کوئی گدی نشین ہے اور کسی نامحرم لڑکی کے منہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے اپنے بیٹے کا ذکر سن کر کانپ اٹھا ہے۔
افق شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ لکڑی کے تازہ پالش شدہ فرش سے نظریں اٹھا کر اس نے صوفے پر بیٹھی شخصیت کی طرف دیکھا اور جھٹ نظریں جھکالیں۔
"وہ مجھے جانتے ہیں۔"
آواز کانپ رہی تھی۔ انداز بڑا ترس آمیز تھا۔ صوفے پر بیٹھے شخص کا جی چاہا کہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجائے اور پھر سامنے بیٹھی پری کو اٹھا کر ہوا میں اچھال دے۔ اس کی ایک ایک حرکت قابل توجہ تھی... نظریں جھکانا۔ نظریں اٹھانا۔ ہتھیلیوں کو پیوست کیے بیٹھے رہنا اور اس طرح بیٹھنا کہ جیسے جنبش پر ٹوٹ جائے گی۔ کسی عجائب خانہ میں رکھی جانے والی مورت ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ ان کے عین سامنے... اکیلی... صرف ایک چادر کی حفاظت میں...
"کالج میں پڑھتی ہو اس کے ساتھ؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"پھر کیسے جانتی ہو اسے؟" جھنجھلا کر پوچھا گیا۔
وہ چپ رہی اور لگ رہا تھا کہ وہ اٹھ جائے گی، جب اگلا سوال آگیا۔
"کہاں سے آئی ہو؟"
"انار کلی سے۔" ایک گہرا سانس لے کر کہا۔
"انار کلی ہو... مزار سے آئی ہو۔" بہت ہی بھونڈا مذاق تھا۔ بھونڈے انداز سے کہا گیا تھا۔ بھونڈے انسان نے کہا تھا۔
"جی۔" اس نے جھٹ سر اٹھا کر دیکھا۔
"کس محل سے آئی ہو؟" دونوں بازو بدستور دائیں بائیں صوفے کی پشت پر پھیلے تھے۔ اس سوال پر گھٹنے پر رکھا پاؤں ہلنے لگا۔
"گھر سے آرہی ہوں اپنے۔" ایک ہاتھ سے پیشانی پر آئے بال پیچھے کیے۔
"گھر سے یہاں کیوں آئی ہو؟" وہ تو اسے ایسے بٹھائے ساری زندگی زچ کرسکتے تھے اور کتنے مزے میں گزرتی ایسی زندگی۔
"مجھے کام تھا عدن سے۔" نظریں اٹھا کر انہیں دیکھ کر التجا سے کہا۔
"کیا کام تھا؟" پیر زور و شور سے ہلنے لگا۔
عدن ہوتا تو وہ بتا دیتی۔ ان صاحب کو کیسے بتاتی۔ تھوڑی ہمت کی۔
"مجھے بتادیں، وہ کہاں ہیں۔ میری بات کروادیں۔"
"تم کام بتاؤ۔ میں عدن کا بھی بتا دیتا ہوں۔" وہ خاموش بیٹھی لفظ جوڑتی رہی کہ ایک بار پھر کیسے التجا کرے کہ عدن کا بتادیں۔
"میں باپ ہوں اس کالڑکی...! بتاؤ، تمہیں کیا کام ہے؟"
وہ باپ تھا عدن کا اور ہونے والا سسر تھا اس کا... تو اس کو ذرا سی ڈھارس ملی... گو اپنی اوقات یاد تھی۔ لیکن مشکل کے وقت انسان اپنی اوقات بھول ہی جاتا ہے۔
"شاباش! بتاؤ کیا کام تھا؟" نرم لہجے میں کہا۔ اس بار افق تو آبدیدہ ہی ہوگئی کہ ان سے اپنے سارے ہی دکھ درد کہہ ڈالے۔
"اماں کی سرجری کروانی ہے۔ مجھے پیسے چاہیے تھے عدن سے۔ اماں ٹھیک ہوجائیں گی تو ضرور ہی واپس کردوں گی۔" اس پر اس کا انداز پر اعتماد تھا۔
"محمد بخش۔" اس آواز کی ایک بھڑک ماری۔ افق ذرا سا ڈر گئی۔ محمد بخش دروازے میں نمودار ہوا۔
"میرے بیڈ روم سے میرا بریف کیس لاؤ۔"
بریف کیس آگیا۔ چیک بک نکالی۔
"دس لاکھ ٹھیک ہیں؟" اتنی پیاری آواز میں پوچھا کہ افق نے انہیں جان لیا کہ وہ تو اتنے اچھے ہیں۔ ضرور ہی ان دونوں کی شادی کے لیے راضی ہوجائیں گے۔ اماں ایسے ہی ڈرتا تھا۔
"نہیں جی۔ اتنے نہیں۔ یہ بہت زیادہ ہیں۔"
"چھ لاکھ کردیتا ہوں۔"
"نہیں... نہیں... اتنے نہیں..."
"اچھے سے اسپتال سے سرجری کروانا ناں۔ چار لاکھ ٹھیک ہیں؟"

اس نے "نہیں" کہا۔ انہوں نے چیک لکھ کر سامنے بیٹھے کی میز پر رکھا۔
"بس لکھ دیا میں نے۔" وہ اٹھ کر چیک پکڑنے لگی تو دو بولے۔
"آرام سے بیٹھو... کوئی ٹھنڈا گرم پیو... محمد بخش!" وہی بھڑک دار آواز نکالی۔ چیک پکڑے بغیر وہ واپس بیٹھ گئی۔
"میڈم کے لیے فریش جوس لاؤ۔"
اتنا سن کر افق کے گالوں پر سرخی سی آگئی۔ اس کے سامنے اس کے سسر بیٹھے تھے۔ انہوں نے کتنے پیار سے اس کی مدد کردی تھی۔ اب اس کی خاطر مدارات کررہے تھے۔
"عدن سے بات نہیں کروگی؟" بازی آنکھیں اس پر گاڑ کر اس گدھ نے پوچھا۔ افق نے سر نفی میں ہلایا۔ وہ یہاں ان کے سامنے کیسے بات کرسکتی تھی۔ بہت شرم کی بات تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی نہ ہوتیں تو وہ دیکھتی کہ انہوں نے موبائل کے بٹن کو پش کیا ہے۔
"ہائے بابا!" اسپیکر پر عدن کی آواز ابھری۔ اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"کیسے ہو مائی سن؟"
"فٹ... اور آپ کیسے ہیں؟"
"ماریہ کہاں ہے؟"
"باتھ روم میں ہے۔ سو رہی ہے۔"
"کیسا جارہا ہے تمہارا ہنی مون مائی سن؟"
وہ ہنسا۔ "آپ کو بتایا تو تھا۔"
"اوکے... اوکے... خوب انجوائے کرو دونوں۔ شادی کی طرح ہنی مون بھی شان دار ہی ہونا چاہیے۔"
افق نامی انار کلی کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی لڑکی کو واقعی اب اٹھا کر ایک عجائب خانے میں رکھ دینا چاہیے تھا۔ اس جیسی لڑکیوں کو پنجرے بنا کر ان میں رکھ کر تالا لگا کر چابی گم کردینی چاہیے۔ یہی ان کا اصل مقام ہے۔ اب وہ نظریں نہیں جھکا رہی تھی۔ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی اور اپنے ہونے والے سسر صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ اب وہ واقعی جنبش کرے گی تو ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو کر زمین کی آخری تہہ تک جا پہنچے گی۔ پیروں کی دھول بھی نہیں رہے گی۔
"عدن اپنے ہنی مون پر ہے ماریہ کے ساتھ۔ بچپن سے پسند کرتا تھا اسے۔ تمہیں نہیں بلایا اس نے شادی پر...؟" اس مونچھوں والے کو تو کسی تھیٹر میں کام کرنا چاہیے۔ اس نے کوئی جنبش نہ کی۔ نہ ہاں، نہ ناں۔
غلام علی غلام کا جی چاہا کہ اب تو ضرور ہی اسے جا کر ٹچ کریں۔ ایک انگلی سے ہی سہی... اور تربھی لیں تو انہیں روکے گا کون؟ وہ اٹھے اور چل کر اسی صوفے پر آبیٹھے جس پر وہ بیٹھی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو افق کی آنکھوں سے رواں ہوگئے۔ صدمے کا پہاڑ اس پر ٹوٹا تھا۔
"روتی کیوں ہو... ٹھیک ہوجائیں گی تمہاری امی۔" ذرا سا قریب ہوئے۔
بھرم ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔ وہ رونے میں اور رواں ہوگئی۔
غلام علی غلام کا ہاتھ آگے بڑھا۔ سر پر پیار دینے کے لیے نہیں... گود میں رکھے ایک ہاتھ کو انہوں نے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ افق رونے اور عدن کے صدمے میں اتنی مگن تھی کہ ذرا دیر میں چونکی۔
ہاتھ دو مردانہ ہاتھوں میں تھا۔ اچنبھے، حیرت اور سراسیمگی سے اس نے انہیں دیکھا اور لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ لڑکی سے عورت اور عورت سے سیانی بن گئی۔
عدن اپنی بیوی کے ساتھ ہے۔ سنتے ہی وہ خود فراموش ہوگئی۔ وہ یہاں کیوں ہے۔ اس کا نام کیا ہے۔ حتیٰ کہ اماں کی بیماری بھی بھول گئی۔ اس لمحے میں اس پر بہت کرب ناک قیامت ٹوٹی۔ جیسے اس کے عین سر کے اوپر گرم سیال انڈیلا جارہا ہے اور نیچے اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھ' پاؤں بندھے پڑے ہیں۔ منہ کو سوئی دھاگے سے سی دیا گیا ہے۔ دو مردانہ ہاتھوں میں ہاتھ کے آتے ہی وہ اس ساری کیفیت سے باہر آگئی۔ لیکن اگلی کیفیت کا شکار ہوگئی۔ قبر میں زندہ گاڑے جانے کی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ دنیا میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ یہ سب اور ایسے... جسے وہ سہہ رہی تھی۔ وہ اسے عورت سمجھ رہا تھا۔ صرف "عورت۔"

ذرا سے جھٹکے سے اس نے ہاتھ آزاد کروایا۔ خوف زدہ اور بزدلانہ انداز میں اٹھی اور صرف دو قدم ہی چلی تھی۔

"پیسے نہیں چاہئیں؟" آواز میں لگاوٹ بھی تھی اور دھمکی بھی۔ دلار بھی تھا اور پچکار بھی۔

پیسوں کے نام پر اسے اماں یاد آگئی۔ ان کی تکلیف یاد آگئی۔ آنے والی ان کی موت یاد آگئی۔ وہ رکی رہی قدم نہیں بڑھائے۔

"اپنی ماں کو مارو گی کیا؟" وہ اس کی پشت کی طرف صوفے پر بیٹھے بول رہے تھے۔

افق نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا کہ شاید یہ شخص وہ نہیں' جو وہ سمجھ رہی ہے۔ شاید امیروں میں تسلی ایسے ہی دی جاتی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر۔ گلے سے لگا کر... اس نے سوچا۔ وہ کم عقل ہے۔ یہ سب نہیں جانتی آخر کو وہ عدن کا باپ ہے۔ اسے ایسے نہیں سوچنا چاہیے ان کے بارے میں۔

دوسری طرف غلام علی غلام سوچ رہے تھے کہ لڑکی پیسوں سے تو شاید ہی قابو آئے۔ کم بخت مارے ان غریبوں میں عزت نفس بہت ہوتی ہے۔ عزت... عزت کو روتے پھرتے ہیں۔ چاہے ایڑیاں رگڑتے مر جائیں۔

"دھوکا دیا ہے نا عدنان نے تمہیں... ہے نا... تم جیسی معصوم سی' پیاری سی لڑکی کا فائدہ اٹھایا ہے نا؟"

اتنی سی سچائی سے افق کے آنسو پھر رواں ہوگئے۔

"میں جانتا ہوں اسے۔ بہت روکا بہت منع کیا۔ کالج میں نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ وعدہ کر چکا تھا۔ لیکن شادی اسے صرف ماریہ سے ہی کرنی تھی۔"

اسی کے باپ کے منہ سے عدن کے بارے میں ایسی حقیقت جان کر وہ دھواں دھواں ہوگئی۔

"تمہیں اس کے لیے رونے اور آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی..." اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

"یہ چیک لو اور اپنی ماں کی زندگی بچاؤ... میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔"

افق نے ایک نظر گھنی مونچھوں والے کی طرف دیکھا۔ اس نے بے نام اشکوں کو پیچھے دھکیلا اور چار قدم کے فاصلے پر رکھی شیشے کی میز کی طرف بڑھ گئی۔ عدن کے دھوکے کے باوجود وہ اس کے باپ سے یہ پیسے لینے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ اس احسان کو لینے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتی یا اپنی انا اور خودداری کے بارے میں؟

جیسے ہی وہ میز کی طرف جھکی دو ہاتھ اس کی پشت پر آئے۔

"خوش رکھوں گا تمہیں... اور تم..."

اس کا وجود کانپ کر سمندر کے ریلے میں بہنے والا پتھر بن گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" چیک نیچے گر گیا۔ سب کچھ صاف اور واضح ہوگیا۔ مکمل تصویر اس کے ہاتھ میں آگئی۔

"کیا کر رہا ہوں...؟" کندھوں سے پکڑ کر اسے سیدھا اپنی طرف کیا۔ غرا کر کہا۔ "تمہیں نہیں پتا کیا کر رہا ہوں...؟ بچی ہو... عدن کیا کرتا رہا ہے تمہارے ساتھ؟ اس سے زیادہ محبت دوں گا تمہیں۔"

یہ انداز' یہ الفاظ۔ افق کی ساری عزت بہہ کر اس کے پیروں میں آگئی۔ عزت کا جانا کیسا۔ وہ تو اتنے پر ہی چلی گئی۔

"چھوڑیں مجھے..." پہلی کوشش میں اس نے ڈر کر کہا۔ آواز بمشکل ہی نکلی۔ دونوں کندھوں پر ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

"پاگل مت بنو لڑکی... سمجھ داری کا ثبوت دو... میں تمہیں دولت میں نہلا دوں گا۔"

اس بات پر افق کا جی چاہا کہ اس شخص کو آگ لگا کر جلا ڈالے... اس کی گردن نوچ لے۔

"چھوڑو مجھے..." وہ اتنی زور سے چلائی کہ آواز گھر کے آخری کونے تک گئی ہوگی۔ محمد بخش منقش دروازے کی اوٹ میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اندر کے منظر پر ایک نظر ڈالتے ہی سب سمجھ گیا... تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چوکیدار کے پاس گیا۔

غلام علی غلام کا منہ اس کے منہ کے قریب آتا جا رہا تھا۔ وہ پشت کے بل میز پر جھک رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ غلام علی غلام کو خود سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہاتھوں میں سے دائیں ہاتھ کو اس نے اوپر اٹھا کر ایک زوردار تھپڑ غلام علی غلام کے منہ پر دے مارا۔ اب تک کی اپنی ساری قوت کو جمع کر کے...

تھپڑ پڑتے ہی وہ باؤلے کتے کی طرح ہوگئے۔ اسے نیچے پٹخا...

میز کے قریب... نیچے گرتے اس نے جھٹ میز پر رکھا شیشے کا گل دان اٹھا کر اسے دے مارا۔ گل دان عین غلام علی کی ناک پر لگا۔ خون کی ایک لکیر بہہ نکلی۔ گل دان مارتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر میز کی دوسری طرف سے گھوم کر باہر بھاگی۔

"بخش... صوفی..." ناک پر ہاتھ رکھے وہ دھاڑتے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

ڈرائیور صوفی وہاں موجود نہیں تھا۔ بخش' خان کے ساتھ گیٹ کے پاس کھڑا رازداری سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ خود تین بیٹیوں کا باپ تھا۔ خان کے ساتھ وہ جلدی جلدی کھسر پھسر کر رہا تھا اور اسے اندر کی صورت حال بتا رہا تھا۔

اسے خان کے پاس آئے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ لڑکی پورچ سے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ خان نے جھٹ چھوٹا گیٹ کھول دیا۔ پیچھے غلام علی کی شکل نمودار ہوئی۔

"پکڑو اسے... بخش... چوکیدار... حرام زادو! پکڑو اسے۔"

دونوں بوکھلائے' منہ اٹھائے غلام علی کو دیکھنے لگے ناک پر ہاتھ رکھے وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

"کیا ہوا جناب آپ کو؟" بخش لپک کر اپنے صاحب کی طرف آیا۔ چوکیدار نے لڑکی کی طرف بھاگنے کا ڈراما کیا۔ جبکہ لڑکی بجلی کی طرح کھلے گیٹ سے نکل گئی۔

"کتے اس کے پیچھے بھاگ۔" غلام علی دھاڑا۔ بخش گیٹ سے نکلا۔ چوکیدار بھی نکلا۔ لڑکی سڑک پر دور جاتی نظر آئی۔

دونوں نے اس کے پیچھے بھاگنے کی کمال اداکاری کی اور لڑکی دور سے دور ہوتی گئی۔ دونوں غلام علی کے ملازم تھے۔ اس کے غلام نہیں تھے۔ انسانیت رکھتے تھے۔ اپنے مالک سے تنخواہ لیتے تھے۔ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے ایمان پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ مالک کی خصلت کو جانتے تھے۔ چوکیدار نے تو اس سے زیادہ ڈرامے دیکھے تھے۔ جب یہاں پانچ لڑکے رہتے تھے۔ جس وقت بخش جوس کا گلاس رکھ کر گیا تھا۔ وہ اسی وقت سے ذرا اوٹ میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کوئی اپنی ہی مانگی دعا تھی جس نے افق کو بچا لیا تھا۔

کیا وہ واقعی بچ گئی... یا یہ وقت ہی طے کرے گا؟

ڈی۔ ایچ۔ اے کی کشادہ سڑک پر بھاگتے ہوئے اسے بہت شرم آئی۔ اس کی چادر اب اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ بالوں کی کئی لٹیں گردن اور پیشانی پر پھیل گئی تھیں۔ اس کا وجود بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ وہ ایک قدم تک نہیں اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اسے بھاگنا تھا۔ اپنی عزت کے لیے اسے بھاگنا تھا۔ سڑک پر قیمتی کاریں رواں دواں تھیں۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ وہ بڑے بڑے پھاٹکوں اور بنگلوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ سانس اتنی پھول چکی تھی کہ اب دم ہی نکل جائے گا۔ بہت دیر تک ڈر کے بھاگتے بہت سی سڑکیں پار کرتے' وہ فٹ پاتھ نما جگہ پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ وہ وہاں اکیلی تھی۔ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اپنی عزت بچا کر وہاں سے نکلی تھی۔۔۔ نہیں۔۔۔ دراصل وہیں تو اس کی ساری عزت اتر گری تھی۔ عدن جس سے وہ محبت کرتی رہی' وہ اسے چھوڑ گیا اور اس کے باپ نے اس سے بڑھ کر کیا۔ آئندہ زندگی میں جتنے بھی دن وہ زندہ رہے گی' کیا وہ اس طرح اپنا تار تار کیا جانا بھول جائے گی۔ اگر وہ دو دن بھی زندہ رہ پائی تو۔۔۔ اور پھر یہ زندہ رہنا نہیں ہوگا۔

افق کو بہت ترس آیا اپنی ماں پر۔ اپنے مرے ہوئے باپ پر' جس کی اس جیسی بیٹی تھی۔ جسے اس طرح بھاگنا پڑا تھا۔ جسے اس طرح دھوکا دیا گیا تھا۔ جو اس جگہ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ جس کی چادر اتر گری تھی۔ جس پر صاف صاف سامنے سے حملہ کیا تھا۔ جس کے سامنے پہلے پیسے پھینکے گئے تھے

تو یہ تھا وہ حسن جو اتنے غضب کا تھا کہ غضب ہی کر دیا تھا۔ حسن اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ لیکن آج تو وہ اپنا آپ دکھا ہی گیا۔ لیکن اگر وہ حسین نہ بھی ہوتی تو قریب قریب ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ کس کس بات کے لیے ماتم کرتی۔۔۔ اپنے لیے۔۔۔ اماں کے لیے یا ابھی جو ہوا اس کے لیے۔ اسے صرف ایک ہی چیز کے لیے ماتم کرنا چاہیے۔

اپنے "کم عقل" ہونے کے لیے۔

بہت دیر تک وہ وہاں ایسے ہی بیٹھی روتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ اب وہ مر کر ہی گھر جائے۔ کاش! آج ہی قیامت کا دن آن پہنچے۔۔۔ حشر ہو۔۔۔ یوم حساب ہو اور وہ دو لوگوں کے گریبان پکڑے۔۔۔

"ہے (Hey) آواز افق کے قریب ابھری۔ ساتھ ہی کندھے پر ہاتھ آیا۔ ڈر کر افق نے سر اٹھایا۔

"کیا ہوا؟" اس کی دھواں دھواں شکل پر نظر پڑتے ہی ایک ہاتھ میں کینوس بورڈ پکڑے لڑکی چونک گئی۔ لڑکی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا ڈیر۔" سرخ بہتی آنکھوں سے افق نے لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی نے بیگ میں سے ٹشو نکال کر آگے کیا۔ افق نے ٹشو نہ پکڑا۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں صاف کیں۔

"بتاؤ نا۔ کیا ہوا۔ میں دس منٹ سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔ وہاں سے۔۔۔" لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کیا ایک طرف۔۔۔ افق سے ذرا سا دور اپنی سرخ گاڑی کی طرف۔۔۔ افق نے اٹھنا چاہا۔

"میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔۔۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟"

افق نے نہ میں سر ہلایا۔۔۔ دنیا کا پتھر دل انسان بھی اس وقت اسے دیکھ لیتا تو موم ہو جاتا۔ کینوس بورڈ پکڑے اس لڑکی کو بھی بہت ترس آیا۔

افق اٹھ کر چند قدم آگے چلی۔ لڑکی نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آؤ! میرے ساتھ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔" لڑکی نے ہاتھ نہ چھوڑا اور ساتھ لے کر کار تک آئی۔ قطار در قطار وہاں کئی کاریں کھڑی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ پلیز۔۔۔" لڑکی نے دروازہ کھولا۔ افق ہونق بنی لڑکی کی طرف دیکھے گئی اور پھر بیٹھ گئی۔

لڑکی نے کار اسٹارٹ نہ کی۔ "اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

افق نے لڑکی کی طرف الجھ کر دیکھا۔ کیا بتائے' کیسے اور کیوں۔۔۔؟

"نام کیا ہے تمہارا۔۔۔؟" لڑکی بہت پیار سے بول رہی تھی۔ اس کی آواز اور انداز دونوں ہی نرم تھے۔

"افق!" اس نے آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے صاف کر کے بتایا۔

"افق! وہاں ایسے بیٹھی کیوں رو رہی تھیں؟ بتاؤ مجھے۔ ہو سکتا ہے' میں کچھ کر سکوں۔ کچھ ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" افق چپ بیٹھی رہی۔

"جب تک تم بتاؤ گی نہیں۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"اماں مر رہی ہیں۔" وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ عدن اور اس کے باپ کا نام بھی زبان پر لانا اس نے حرام جانا۔

"اسپتال میں ہیں وہ؟"

نفی میں سر ہلایا۔ "گھر میں ہیں۔۔۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" نئے سرے سے اس کی ہچکی بندھی۔

"چلو! گھر چلتے ہیں۔" لڑکی نے کار اسٹارٹ کی۔

اس نے گھر کا پتا بتایا۔ لڑکی نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں دی۔ ٹشو ہاتھ میں پکڑائے۔ ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ اسے تسلی دیتی رہی۔

"بہت بیمار ہیں وہ۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ اگر ان کی سرجری نہ ہوئی تو وہ مر جائیں گی۔"

"تم ایسے مت روؤ پلیز۔۔۔ ان کی سرجری بھی ہو جائے گی۔ بی بریو (بہادر بنو)۔" ساتھ ساتھ وہ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے تھپکی دیتی رہی۔ اماں کی بیماری کی نوعیت پوچھتی رہی۔

کار پارک کر کے وہ افق کے ساتھ اس کے گھر آئی۔ افق نے لڑکی کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ اماں کو اس کے رونے اور اس جگہ بیٹھنے کے بارے میں مت بتائے۔ اماں دوا کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ وہ بھابھی کو کہہ گئی تھی' گاہے بگاہے انہیں آ کر دیکھتی رہنے کا۔ لڑکی اپنا پورٹ فولیو لے کر چلی گئی۔

جس جگہ افق بیٹھی رو رہی تھی' وہ ایک پرائیویٹ آرٹ کالج کی پارکنگ تھی۔ وہاں رش نہیں تھا۔ کاریں اس سے ذرا سے فاصلے پر پارک تھیں۔

رات میں لڑکی جس کا نام دانیہ تھا۔ اپنی دو دوستوں کے ساتھ آئی۔ باہر ان کا ڈرائیور بھی تھا۔ انہیں ڈرائیور کے ساتھ جانا تھا اور ہر طرح کے اخراجات کے لیے وہ ڈرائیور سے کہہ سکتی تھی۔ وہ تین دوستیں مل کر افق کی اماں کی سرجری کروا رہی تھیں۔

یہ ان کے لیے آسمان سے اتاری گئی امداد تھی یا یقین پر خوشی گئی تھی لیکن افق اندر تک اللہ کی مشکور ہوئی۔ اس جیسی گناہ گار پر یہ بہت بڑا کرم تھا۔

اماں کے ساتھ افق اسلام آباد آ گئی۔ بھابھی کا بھائی وہاں ان کے لیے موجود تھا۔ اسد اور جمال بھابھی کے بھائی کہلائے گئے۔ نئے سرے سے اماں کے ٹیسٹ ہونے لگے۔ انہیں چیک کیا گیا اور پھر ہائی رسک سرجری کا دن آ گیا۔

اگر دانیہ جیسا کوئی اس کا رشتے دار ہوتا۔۔۔ اگر دانیہ جیسا اس کے پاس کوئی اور ہوتا تو اس دن اس کی انا اور عزت کا کٹورا ایسے خالی نہ ہوتا۔ امان نامی انسان کو لے کر وہ اندر ہی اندر بہت گھٹی۔۔۔ راتوں کو چھپ چھپ کر وہ بہت روئی۔ اپنا ہی منہ نوچ لینے کو اس کا جی چاہتا۔ خود کو مار لینے کا۔

ان کی اماں نے زندگی میں انہیں بہت سے سبق یاد کروائے تھے۔ محنت کرنے کے' نہ رونے کے' حوصلہ رکھنے کے' کسی سے کوئی امید نہ رکھنے کے' خودداری کے' وفاداری' زندگی کے سامنے ڈٹے رہنے کے۔ دنیا کو پرکھنے کا کوئی سبق وہ نہیں دے سکی تھیں۔ بھیڑیوں کی بھیڑ میں انسانوں کی شناخت کا اور انسانوں کی بھیڑ میں شیطانوں کی۔۔۔

"عورت جانتی کم اور سمجھتی زیادہ ہے۔"

یہ مقولہ ایک بڑی حقیقت ہے۔ لیکن عورت کو اس مقولے کو ہرانا چاہیے۔

"عورت جانتی زیادہ اور ہارتی کم ہے۔"

معاشی میدان میں انہوں نے بھوک کو ہرا دیا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بھوک پیٹ سے مارتی ہے اور انسان روح سے۔۔۔ جن انسانوں کی روحیں دوسرے انسانوں کے ہاتھوں مرتی ہیں' ان انسانوں کو بڑی کرب ناک سزائیں ملتی ہیں۔۔۔ اندر ہی اندر۔۔۔ گھٹی گھٹی۔۔۔ چھپی چھپی۔۔۔

☆ ☆ ☆

"میں نے تمہیں پروپوز نہیں کیا تھا۔ تم نے مجھے کیا تھا۔" فرزام نے یاد دلایا۔

"میں نے انکار نہیں کیا۔" دونوں کندھے اچکائے گئے۔

"اب جب میں تمہارے بغیر نہیں رہنا چاہتا تو تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"کیا۔۔۔؟ میں نے کچھ کیا؟" بالوں کو جھٹک کر پوچھا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا وہ سب میرے دوست تھے۔۔۔ کیا ڈرگ کا چارج مجھ پر لگا۔۔۔ کیا پولیس مجھے لے گئی۔۔۔ تم جانتے ہو کہ کالج میں کتنی باتیں ہو رہی ہیں؟" رومی نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"تم وہ سب باتیں سن رہی ہو اور مجھے نہیں۔۔۔؟"

"سن تو لیا تمہیں۔" وہ جھلا گئی۔

"اتنی سی بات پر تم ہمارا رشتہ توڑ رہی ہو؟"

"اوہ۔۔۔ تو یہ اتنی سی بات ہے۔" واہ واہ کا انداز۔

"یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔" مضبوط انداز میں جتایا گیا۔

"ایسی ہی سوچ تمہیں یہاں تک لے آئی ہے۔" وہ چڑ گئی۔

"یعنی سوچ۔۔۔؟" وہ برا مان گیا۔ پچھلے دو دن سے وہ سب کی باتوں کا برا ہی مان رہا تھا۔ لیکن کسی کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

"تم اس سب کو چھوڑو۔ کیا تم میرے بغیر رہ لوگی؟" اسے لگا یہ سوال بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اس ہتھیار سے وہ ضرور گھائل ہو جائے گی۔

"کچھ فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔" کندھے پھر اچکے۔

"مجھے چھوڑنے کا فیصلہ؟" ہتھیار کا وار خالی گیا۔

وہ چپ رہی۔

"اچھے خاصے سمجھ دار ہو تم۔۔۔ اچھی بھلی زندگی کو تم نے الٹا دیا۔۔۔ اب تم کیا چاہتے ہو' اس الٹ پلٹ میں' میں تمہارا ساتھ دوں؟" خاموشی کے وقفے کے بعد وہ پھر اپنا پوائنٹ واضح کرنے لگی۔ "تم اب برطانیہ میں رہ نہیں سکتے۔ اگلے پانچ سال تک آ بھی نہیں سکتے۔ کیا میں پانچ سال تمہارا انتظار کروں؟ اور پانچ سال بعد تم صرف اپلائی کر سکتے ہو۔ اس کی بھی گارنٹی نہیں ہے کہ تم یہاں دوبارہ آ ہی جاؤ گے۔"

"تمہیں انتظار کرنے کے لیے کس نے کہا۔۔۔ تم تعلیم مکمل کرتے ہی پاکستان آ جانا یا ان سالوں میں' میں کسی اور ملک کے لیے اپلائی کروں گا۔ ہم وہاں رہ لیں گے۔"

"تم اپنی پلاننگ خود کرو۔۔۔ پلیز۔"

"یعنی تم میری پلاننگ کا حصہ نہیں بننا چاہتیں؟"

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی۔" منہ بگاڑ کر کہا۔

"جب تم نے محبت کے لیے سوال کیا تھا تو میں نے جواب نہیں دیا تھا؟"

"وہ تمہاری مرضی تھی۔" منہ کا زاویہ ویسا ہی تھا۔

"پھر تم نے منگنی کے لیے کہا۔" اس نے ٹیبل پر مکا مارا۔

"تم انکار کر دیتے۔" اس نے ہاتھ لہرا کر گود میں رکھ لیا۔ دوسرا ٹیبل پر رہا۔

"میں انکار اس وقت کرتا' جب مجھے تم سے لگاؤ نہ ہوتا۔ یہ سب تم بھابھی کے کہنے پر کر رہی ہو نا؟"

"میں فیڈر نہیں پیتی۔" مزاج اور انداز مزید بگڑ گیا۔

"رومی پلیز۔۔۔" اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ ارادہ بھانپ کر رومیسہ نے یہ ہاتھ بھی میز پر سے پرے کر لیا۔

"رنگ میں تمہیں دے چکی ہوں فرزام! فیصلہ بھی کر چکی ہوں۔ تمہیں پسند بھی خود ہی کیا تھا۔ اب اپنا فیصلہ بھی خود ہی بدل رہی ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" پھر وہی محبت کا ہتھیار۔

"تم میرا اور وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" بیگ اٹھا کر وہ چلی گئی۔

"رومی۔۔۔ رومی۔۔۔ رکو۔۔۔" کی آوازیں اس کے تعاقب میں گئیں۔ لیکن رومی تیزی سے سڑک پار کر کے ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور وہ واپس پلٹ کر سڑک کے ایک طرف بنے اوپن ٹی کارنر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ برطانیہ کے شہر لیڈز کی ایک پر رونق سڑک پر واقع ٹی کارنر ہے۔ یہاں دنیا میں پائی جانے والی مختلف قسموں کی مختلف ذائقوں کی چائے با آسانی مل جاتی ہیں اور یہ سب ذائقے رومی کو ہی پسند تھے۔

رومی نامی لڑکی جا چکی ہے۔

فرزام نام کا لڑکا مایوس بیٹھا ہے۔ سامنے رکھی

چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ ٹھنڈ لیڈز میں بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ دو دن پہلے اس کی ماما نے اسے انگوٹھی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ رومی دے گئی ہے۔"

انگوٹھی پر نظر پڑتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ زیادہ عرصہ پاکستان میں گزارا تھا تو دھوم دھام سے پہنائی گئی منگنی کی انگوٹھی کے اس طرح واپس آنے پر گم گشتہ ہو گیا۔

"یہ کیا مذاق ہوا بھلا۔"

"اسی سے پوچھ لو فرزام۔۔۔" وہ شاید بھابھی سے پوچھ چکی تھیں۔ اسی لیے آبدیدہ نظر آ رہی تھیں۔

اس نے بھابھی کو فون کیا۔ جسے اٹھایا ہی نہ گیا۔ پھر رومی کو فون کیا۔۔۔ وہ بھی نہ اٹھایا گیا۔۔۔ وہ بھابھی کے گھر گیا' جو ان کے فلیٹ سے پندرہ منٹ کی واک پر تھا۔

"یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ تو منگنی ہوتے ہی اس انتظار میں تھیں کہ وہ ٹوٹے اور وہ فرزام کو یہ سب کہہ سکیں۔

"آپ کو اس سے بات کرنی چاہیے۔۔۔ بھابھی پلیز۔۔۔ وہ تو میرا فون بھی نہیں اٹھا رہی۔"

"بچی نہیں ہے وہ۔ کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہو گا یار۔"

"ان پندرہ دنوں میں آخر ایسا کیا ہو گیا کہ اسے یہ سب کرنا پڑا۔۔۔؟"

"یہ تم اسی سے پوچھو۔۔۔" ایسے کہا انہوں نے کہ میری اور میری بہن کی جان چھوڑو۔

فرزام' رومی کے گھر گیا۔ وہ گھر پر نہیں ملی۔ اس کی بہن روم سے باہر نہیں نکلیں۔

دو گھنٹہ انتظار کر کے وہ آ گیا۔

فون کرتا رہا۔ لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔

میسج چھوڑے اس کے لیے' وائس میسج۔ رات گئے اس کا ایک جواب آیا۔

"its over now' Don't disturbe me"

(سب ختم ہو چکا ہے۔ مجھے پریشان مت کرو)

اس نے فوراً" کال بیک کی۔ وہ اس سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک ان میں بحث ہوتی رہی۔ وہ منگنی ختم کر چکی تھی اور اس کے ڈیڈ بھی اب اسے منا نہیں سکتے تھے تو وہ کیا چیز تھا۔

پندرہ دن پہلے وہ اپنے چار دوستوں دو برطانوی' ایک برازیلین اور ایک جاپانی کے ساتھ منشیات کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے ان دوستوں کے پاس ہاسٹل چلا جاتا تھا۔ شام کو وہ ان کے روم میں بیٹھا تھا۔ جب انہیں گرفتار کیا گیا۔

وہ منشیات کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ اتنا ضرور جانتا تھا' ان میں سے تین کبھی کبھار اسے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب انہیں گرفتار کیا گیا تو فرزام کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے ایجنٹ بھی تھے۔ گرفتار کمرے سے سب کو کیا گیا۔ پندرہ دن کی تفتیش بھگت کر وہ آ گیا۔ کالج سے سب کا نام خارج کر دیا گیا اور اس پر جرم ثابت نہ ہونے کے باوجود اس کے کاغذات پر اسٹیمپ لگا دی گئی۔ اسے ایک ہفتے کے اندر اندر برطانیہ چھوڑ دینا تھا اور اگلے پانچ سال تک وہ دوبارہ نہیں آ سکتا تھا۔

مصیبت اچانک ہی آتی ہے اور یہ سب اچانک ہی ہوا۔ اس کا گرفتار ہونا' کالج سے نکال دیا جانا' برطانیہ سے بھی نکال دیا جانا' بہت تکلیف دہ تھا یہ سب۔۔۔ لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ کچھ اور تھا۔

"رومی کا رنگ واپس کرنا" اس کا ایک ہی موقف تھا کہ وہ مجرم ہی ہے۔ ڈرگز سپلائی کرتا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے دوست یہ کام کریں اور اسے معلوم نہ ہو۔ اسے واقعی معلوم نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تو وہ اتنی بڑی مصیبت میں خود کو پھنسنے دیتا۔

"ایک چھوٹے سے حادثے سے تم مجھ سے اتنی دور ہو گئیں رومی۔۔۔؟" جو کچھ ہو رہا تھا' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اتنی جلدی اس کی زندگی اتنی تلخ ہو گئی۔

"تمہاری اصلیت سامنے آ گئی۔"

"اگر یہ میری اصلیت ہوتی تو کیا میں صرف پندرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دن بعد باہر ہوتا... کیا وہ مجھے ایسے چھوڑ دیتے؟"
"تمہیں کالج سے ایسے ہی نہیں نکالا گیا۔"
"کالج نے اپنی ساکھ کے لیے یہ کیا۔"
"میں اپنی ساکھ کے لیے کر رہی ہوں۔"
رومی نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور اسے سن کر بھی وہ اس سے ملنے کے لیے بار بار کہنے لگا۔
دو دن بعد وہ اسے ملی اور اپنی مرضی کا فیصلہ سنا کر چلی گئی۔ جس شخص کا مستقبل پہلے روشن تھا اب وہ تاریک ہو چکا تھا' جو انسان پہلے اچھا لگ رہا تھا' وہ اب برا لگ رہا تھا۔ اب سے اٹھارہ دن پہلے وہ اس کے ساتھ مووی دیکھنے سنیما گئی تھی اور اٹھارہ دن بعد وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹھیک ہے! تعلقات ٹوٹ ہی جاتے ہیں' لیکن اس طرح... ایک دم سے... کیا تعلق توڑنے کے لیے لوگ اتنے تیز رفتار ہوتے ہیں؟ جاپانی الیکٹرک ٹرین سے بھی زیادہ...؟
وہ چھٹی جماعت میں تھا جب یہاں آیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی احمر ایف ایس سی کرتے ہی برطانیہ آگیا تھا' وہ اسٹوڈنٹ ویزے پر آیا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے آتے ہی ایک پاکستانی ہوٹل میں اچھی جاب مل گئی تھی اور پھر اسے اپنی ہونے والی بیوی تانیہ مل گئی کالج میں۔
احمر کی جاب اچھی تھی۔ اس نے صرف ایک سال کی کورٹ شپ کے دوران ہی تانیہ سے شادی کر لی۔ دونوں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔ پاکستان میں احمر کسی غریب خاندان سے نہیں آیا تھا۔ اس کی ماما کنڈر گارمنٹس کا ایک اسٹور چلاتی تھیں۔ گلبرگ میں ان کی ایک کوٹھی تھی۔ کار تھی۔ تھوڑا بہت بینک بیلنس تھا۔ احمر کے برطانیہ آنے سے چھ ماہ پیشتر ان کے ڈیڈ کی وفات ہو چکی تھی۔
صرف ڈیڑھ سال میں ہی احمر نے ماما اور فرزام کو برطانیہ بلوا لیا۔ وہ برطانیہ میں اپنا بزنس کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے پیسے چاہیے تھے۔ اس نے ماما کو راضی کر لیا کہ وہ سب کچھ بیچ کر یہاں اس کے پاس آجائیں۔ وہ مل کر ایک جگہ رہ بھی لیں گے اور وہ کاروبار بھی کر لے گا۔ ماما نے سب کچھ بیچ کر پیسے اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ اس نے اپنے سسر اور سالے کے ساتھ مل کر ٹریولنگ ایجنسی کھول لی۔ فرزام نے اسکول میں ایڈمیشن لے لیا اور وہ اور ماما مل کے احمر کے ارینج کیے گئے ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔
یہاں تک سب ٹھیک تھا۔ احمر ماما کو ہر ماہ ایک معقول رقم دے دیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی اس کا کاروبار سیٹ نہیں ہوا۔ پھر وہ اپنی بیوی کے ساتھ دو کمروں کے فلیٹ سے ایک بڑے اور کشادہ فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ اس پر اس کا کہنا تھا کہ یہ فلیٹ تانیہ کے گھر والوں کی طرف سے تانیہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ ان کی ماں مسز گوہر پاکستان میں اپنا چلتا ہوا کام چھوڑ کر آئی تھیں۔ صرف اپنے دونوں بیٹوں کے مستقبل کے لیے۔ اپنے بیٹے احمر کی خوشی کے لیے۔ ورنہ انہیں اپنے کام سے بہت لگاؤ تھا۔ احمر نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ انہیں ویسا ہی کاروبار یہاں کروا دے گا۔ حالات ٹھیک ہو رہے تھے۔ لیکن صرف احمر اور تانیہ کے۔ دونوں نے الگ الگ کاریں لے لی تھیں۔ ان کے گھر کی سجاوٹ دیکھنے لائق تھی۔ ان کے شاپنگ بلز دیکھنے کے لائق تھے۔
ایک کاروباری عورت کو یہ سب باتیں سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ لیکن اب وہ کر کچھ نہیں سکتی تھیں۔ پاکستان میں کچھ بچا نہیں تھا۔ یہاں اثاثے کے نام پر ان کے پاس صرف فرزام تھا اور فرزام چھوٹا تھا وہ ایسے یہ سب باتیں بتا کر احمر سے باغی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ فرزام اپنی ڈگری مکمل کر لے اور ایک جاب حاصل کر لے۔ ابھی فی الحال احمر ہی اس کے سب اخراجات پورے کر رہا تھا۔ وہ احمر سے کوئی بھی بات کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جتنے پیسے احمر انہیں دیتا' وہ پیسے وہ خاموشی سے رکھ لیتیں۔
پاکستان میں وہ ایک فعال زندگی کی مالک تھیں یہاں فی الحال وہ چند کورسز کر رہی تھیں۔ وقت کی نبض پر ہاتھ تھا۔ جانتی تھیں۔ کسی بھی وقت خود

کمانے کی نوبت آسکتی ہے۔ بیٹے' بہو اور ان کے درمیان ایک بھرم کا پردہ تھا۔ کسی بھی وقت پردہ چاک ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سب میں ایک گڑبڑ ہو گئی' تانیہ کے لیے۔ تانیہ کی چھوٹی بہن رومیسہ' فرزام کی دوست بن گئی۔ پھر کالج میں بھی ساتھ ہو گئے۔ رومی' فرزام کے ساتھ بہت خوش ہوتی تھی۔ تانیہ یہ سب پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے میاں کے بھائی کو اپنے میاں کے سیٹ کیے گئے کاروبار میں حصہ دار نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اگر رومی اور فرزام میں رشتہ استوار ہو جاتا تو اس کی ذہین و فطین بہن ضرور اس کاروبار میں سے فرزام کا حصہ نکلوا لیتی۔ اس نے اپنے والدین کو بھی اپنا حامی بنا لیا۔ لیکن رومی نے کسی کی نہیں سنی اور فرزام سے منگنی کروا کر ہی چین لیا۔
منگنی سے پہلے تانیہ کے پاس کوئی ایسی ٹھوس وجہ نہیں تھی' جو وہ اپنی بہن کو بتاتی اور وہ فرزام سے دور رہتی۔ لیکن فرزام کے پکڑے جانے اور برطانیہ میں اس کی موجودگی پر پابندی سے اس کے ہاتھ بہت کچھ آگیا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے اپنی بہن کا ذہن صاف کر دیا تھا۔
کالج میں ان دونوں کے مشترکہ دوست طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ چھوٹی سی خبر تھی۔ اخبار میں بھی آگئی۔ مقامی ٹی وی چینل پر بھی... کالج میں ہر کسی نے اس بارے میں باتیں کی تو فرزام کے ساتھ پکنک پکنک کھیلنے والی' اس کے چٹکلوں پر ہنسنے والی' اس چھ فٹ کے لمبے چوڑے ہینڈسم کے ساتھ فخر سے چلنے والی رومی پریشانی کی ہلکی سی گرم ہوا برداشت نہیں کر سکی۔ جو فرینڈز اسے لگی کہتی تھیں۔ وہ اب فرزام کے متعلق باتیں بنانے لگی تھیں۔ اس کی بہن اور گھر والے الگ سے اکسا رہے تھے۔ ساری جمع تفریق کر کے اس نے انگوٹھی اتار کر اس کی ماں کے ہاتھ میں دی۔ برطانیہ میں تو فرزام کا مستقبل تھا۔ لیکن پاکستان میں کیا تھا۔ کسی دوسرے ملک میں قدم جمانے کے لیے اسے بہت وقت اور مشقت درکار ہو گی اور اسے اس لفظ سے چڑ تھی۔

"ماما! یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟" وہ مسز گوہر کی گود میں سر رکھ کر لیٹا' رو دینے کے قریب تھا۔
"شاید کسی اچھے کے لیے۔" مسز گوہر اچھا' اچھا ہی سوچتی تھیں۔
"اس میں کیا اچھا ہے... ہر بار ایک ہی فلسفہ... جب میں یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ آپ مجھے زبردستی یہاں لے آئیں اور اب میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا تو پوری کی پوری حکومت ہی مجھے نکال باہر کر رہی ہے۔ یہ کون سی قوت ہے ماما! جس نے حکومت کو ہی حرکت دے دی کہ نکالو اس فرزام کو یہاں سے۔ اور پھر آپ کا یہ فلسفہ... کچھ اچھا نہیں ہے اس میں... کچھ بھی۔"
"یہ تمہیں آنے والے وقت میں طے کرنا ہے فرزام!"
"آپ ہمیشہ ایسے ہی سوچتی ہیں۔"
"بری سوچ تو نہیں ہے یہ...؟"
"کچھ ایسی فائدہ مند بھی نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ رومی کو ایسے نہیں کرنا چاہیے۔"
"آنے والے وقت میں شاید وہ سمجھ جائے۔"
"شاید... کاش! ایسا ہی ہو۔"
"تم اسے بہت پسند کرتے ہو؟"
"صرف اسے ماما!"
"تمہیں اس میں کیا پسند ہے بیٹا؟"
مسز گوہر نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کی پسند کو ہی پسند کیا تھا۔ تانیہ کی بار بھی احمر نے صرف ایک تصویر بھیج دی تھی اور فون پر بات کروا کر اپنی شادی کی تاریخ بتا دی تھی اور انہوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی تھی۔
"تمہیں اس میں کیا پسند ہے؟"
یہ سوال وہ پہلی بار فرزام کی کسی بھی پسند کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ اب انہیں لگتا تھا کہ انہیں اپنے بچوں کی پسند پر مسکرا کر "ہاں" نہیں کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ انہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ جن چیزوں' لوگوں کو وہ پسند کر رہے ہیں' وہ پسند کیے جانے کے لائق بھی ہیں یا نہیں۔ چیزوں کی تو خیر ہے بدلی جا سکتی ہیں' پھینکی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاسکتی ہیں۔ لیکن لوگوں کا کیا جائے ان کے بیٹے نے تانیہ پسند کرلی۔ برطانیہ میں ہمیشہ کے لیے رہنا پسند کرلیا اور اس کا نقصان ابھی تو انہیں ہو رہا تھا۔ آنے والے وقت میں شاید اسے بھی ہو۔

"یہ کیسا سوال ہے مام! بس وہ مجھے پسند ہے۔"

"تم اپنے جوتے، کپڑے، موبائل، لیپ ٹاپ اور ایسی ہی دوسری چیزیں کو الٹی دیکھ کر لیتے ہو نا؟ تو چیزوں میں کوالٹی، ساخت اور انسانوں میں... تم نے اپنے دوست بناتے وقت بھی یہی غلطی کی اور اس غلطی کی تمہیں اتنی بڑی سزا ملی۔ خود کے ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ خود کے ساتھ جڑے لوگوں کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔"

"محبت میں یہ سب نہیں دیکھا جاتا ماما... یہ خوبی... یہ خامی... یہ سب محبت میں نہیں چلتا۔"

انہوں نے پیشانی پر پیار کیا۔ "میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہاری ہر خوبی اور خامی کو تسلیم کرتی ہوں۔ روی کا کہنا بھی یہی تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ پھر اس نے صرف تمہاری خوبیاں ہی کیوں قبول کیں؟ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ وہ تمہارے ساتھ خوشی میں رہی اور دکھ، پریشانی میں چھوڑ گئی۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور چونکنے کی کیفیت لیے انہیں دیکھنے لگا۔ جیسے بچے چونک جاتے ہیں "آسمان پر تو کوئی بڑھیا نہیں۔"

"تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے اس برے وقت کا۔ یہ وقت تمہیں بہت کچھ بتا رہا ہے فرزام! جو وقت بتا رہا ہے اسے سنو۔ وقت کبھی برا نہیں ہوتا۔ ہاں انسان بہت برا ہوتا ہے۔ وقت تو بہت اچھی کتاب ہے۔ اسے پڑھو... سمجھو..."

صوفے پر اسے سوچنے کے لیے چھوڑ کر وہ کوٹ پہننے لگیں۔

"میں احمر کی طرف جا رہی ہوں۔ تم کھانا کھا کر اپنی پیکنگ دیکھ لینا۔ شاید مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔"

☆ ☆ ☆

"وہ یہاں سے جا رہا ہے۔ تم اسے اس کا حصہ دے دو۔"

"کون سا حصہ؟ وہ جو اتنے سال یہاں رہا ہے۔ میں نے اس کے اخراجات پورے کیے۔ اس کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھائی۔" اپنی ماں کے اس مطالبے پر اسے بہت غصہ آیا۔ ابھی تانیہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

"احمر...! اگر میں حساب کتاب کرنے لگی تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اس کے باپ کی پراپرٹی میں اس کا حصہ بھی تھا... تمہارے برابر... سب میں نے تمہارے حوالے کردیا... غلط کیا... اس کے حصے کے پیسوں کا منافع صرف تم نے استعمال کیا اور میرے ہاتھ پر تم صرف چند ہزار پونڈز رکھتے رہے۔" بھرم کا پردہ مسز گوہر نے چاک کیا اور صاف صاف حساب پر آگئیں۔ فرزام کے ساتھ وہ زیادتی کیسے ہونے دیتیں۔

"اس پیسے سے کاروبار میں نے شروع کیا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام میں نے کیا ہے اور آپ دونوں کو میں بہت پیسے دیتا رہا ہوں۔ اتنا تو کما کما کر دیا ہے میں نے۔ ماما! آپ ایسے کیسے حساب اور حصے پر اتر آئیں؟ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں کتنے سالوں سے کتنی محنت کر رہا ہوں؟" احمر کو پہلے سے ہی خدشہ تھا کہ ماما ایسا کچھ کہیں گی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اب تم صرف یہ کرو کہ جو میرا چوتھائی حصہ ہے۔ وہ تم اپنے پاس رکھو۔ تم فرزام کو اس کے حصے کے پیسے دے دو۔ تم اسی قدر دے دو جتنے تمہیں ملے تھے۔" وہ تحمل سے بولیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بات کرنے کی دیر ہوگی اور وہ چیخنے چلانے پر آجائے گا۔ واویلا کرے گا اور وہ یہی نہیں چاہتی تھیں۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں ماما! آپ صرف اسی کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ میری محنت آپ کو نظر نہیں آرہی۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا آپ دونوں کے لیے..."

"میں نے تمہاری ہر بات مانی احمر...! اپنا کاروبار تک تمہارے لیے چھوڑ دیا۔ سب کچھ بیچ دیا۔"

"تو کیا میں نے آپ کو یہاں نہیں بلایا؟ آپ کے اخراجات نہیں پورے کیے؟ آپ کا خیال نہیں رکھا؟"

"احمر...!" انہوں نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ "صرف فرزام اور اپنے حصے کا پیسہ میں کسی بھی بزنس میں لگا دیتی تو مجھے اس سے کئی گنا زیادہ منافع ہوتا جو تم مجھے دیتے ہو اور میں کسی بھی وقت اپنا پیسہ واپس نکال سکتی تھی۔ فرزام کے ساتھ میں یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں اس کے حصے کے پیسے واپس کرنے ہوں گے۔"

"اور جو رات دن میں محنت کرتا رہا ہوں؟"

"اس رات دن کی محنت کا پھل تم نے خوب کھایا ہے۔" انہوں نے گھر پر ایک نظر دوڑائی۔ اس بات اور انداز پر احمر تلملا کر رہ گیا۔

"کون سے پیسے اور کیسے پیسے؟" تانیہ زیادہ دیر تک اس گفتگو سے الگ نہیں رہ سکی۔

"ہم دونوں بات کر رہے ہیں۔" مسز گوہر نے سختی سے کہا اور تانیہ کو آگ ہی لگ گئی۔

"آپ پوچھ لیں احمر! ماما سے کہ یہ کن پیسوں کی بات کر رہی ہیں۔ ایسے ہی اتنی لمبی گفتگو میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔" وہ صاف صاف جتا رہی تھی کہ رقم دی تھی؟ اچھا! تو کوئی ثبوت ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے... کیسا ہے... کیا ثابت کرو گے؟

احمر نے اپنی ماں اور سویٹ ہارٹ کی طرف دیکھا۔ سویٹ ہارٹ کا پیش کیا گیا خیال اسے پسند آیا۔

"ماما! آپ کن پیسوں کی بات کر رہی ہیں؟"

"احمر...!" مسز گوہر کو یقین نہیں آیا۔

"تانیہ ٹھیک کہہ رہی ہے ماما!"

تانیہ نے اپنی ساس کی طرف ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ "اور کچھ ماما جی؟"

"تم ایسے نہیں کر سکتے۔" اتنا کہتے ان کی آواز کانپ گئی۔ وہ پیسے دینے میں تامل کرے گا ان کا خیال تھا مگر وہ تو صاف مکر رہا تھا۔

"آپ اس لفنگے کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہیں؟"

مسز گوہر نے بے یقینی سے اپنے پڑھے لکھے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی یہ الفاظ لاؤنج کی طرف آتے فرزام نے بھی سنے۔ وہ ماما کو لینے کے لیے آیا تھا۔ اکیلے کھانا کھانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ماما کو لے کر وہ باہر کہیں جا کر کھانا چاہتا تھا۔

"اپنے بھائی کو لفنگا کہہ رہے ہو؟" سب باتوں سے بڑھ کر انہیں اس بات کا زیادہ صدمہ ہوا۔

"تو جیل میں کون لوگ جاتے ہیں۔ کالج سے کن کو نکالا جاتا ہے۔ اس کا تو ویزا بھی منسوخ کردیا گیا ہے... اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں بدمعاش لوگوں کی؟"

"بدمعاش لوگوں کی کچھ اور نشانیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوسروں کے مال ہضم کر جاتے ہیں۔"

"ماما پلیز! آپ جائیں یہاں سے۔" احمر نے اتنے ہتک آمیز لہجے میں کہا کہ مسز گوہر کو چکر آگئے۔ فرزام لپک کر اپنی ماں کے پاس آیا۔

"یہ کیسے بات کر رہے ہیں آپ ماما سے؟" دونوں بھائیوں نے کبھی ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ فرزام کی آواز یہ کہتے کافی بلند ہوگئی۔

"یہ تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟"

"اس سے اچھے انداز میں ہی بات کی ہے جس انداز میں آپ نے ماں سے کی۔"

مسز گوہر اٹھیں۔ فرزام کا ہاتھ پکڑا۔

"چلو فرزام! یہ میرے اور احمر کے درمیان کی بات ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ کبھی بھی نہیں چاہتی تھیں کہ دونوں بھائی آمنے سامنے آئیں۔

"آپ کی آپس کی بات میں یہ مجھے بدمعاش کہہ رہے تھے۔"

"تو سچ ہی تو کہا ہے احمر نے۔" احمر کی سویٹ ہارٹ بولی۔

ان سب کے تعلقات اس نوعیت پر پہنچ چکے ہیں۔ اس کا اندازہ فرزام کو اپنے اکلوتے بھائی کے انداز سے اب ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے لمحوں میں حالات بدل جاتے ہیں۔ لیکن یہ رشتوں، پیاروں اور لوگوں کو کیا ہو جاتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے کہ وہ لمحوں کا وقت بھی نہیں لیتے بدلنے میں۔ مسز گوہر کو تانیہ کی یہ بات آگ لگا گئی۔

"ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے نا تمہارے خاندان والے؟ فرزام کے پیسوں سے ایک بڑا گھر انہیں بھی نصیب ہوگیا۔"

تانیہ کا منہ ایسے سرخ ہوگیا۔ جیسے دائیں بائیں گال پر زور زور سے تین چار تھپڑ لگے ہوں۔

"فرزام کے پیسے... مائی فٹ... اوقات ہے اس کی اتنی؟ اب تک تو اپنے بھائی کے پیسوں پر پل رہا ہے۔"

"اب تک تم اس کے پیسوں پر پل رہی ہو اور دوسروں کو بھی پال رہی ہو۔"

مسز گوہر اب پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔ فرزام کو ان پیسوں کے معاملات کے بارے میں نہیں معلوم تھا اب تک اس نے ایک بے فکری کی زندگی گزاری تھی۔ مسز گوہر اسے کسی بھی معاملے کی ہوا لگنے دینا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اپنے بھائی سے متنفر ہوجائے' لیکن اتنی احتیاط کے باوجود ان سے بُرا ہی ہوا۔

احمر اپنی بیوی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ بات واقعی بڑھ گئی تھی۔

"آپ کو جو کرنا ہے' کرلیں ماما جی!" تانیہ نے "ماما جی" کو کھینچ کر کہا۔ "یہاں سے جائیں اب۔"

مسز گوہر کی زندگی بھر کسی نے اس طرح بے عزتی نہیں کی تھی' جواب ہو رہی تھی۔

"اپنا لہجہ اور الفاظ سنبھال کر بات کریں مسز احمر... پلیز۔" فرزام نے یہ بات تحمل سے ہی کی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے دو لوگ بھانے اور بھڑکنے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے۔ اس لیے احمر فوراً" بھڑک اٹھا۔

"تم اپنی زبان سنبھالو اور نکلو یہاں سے... جاؤ... دفع ہوجاؤ۔"

وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرزام گھبرا گیا۔ جو بھی تھا' وہ احمر سے ڈرتا تھا۔ اس کا احترام تو بہت ہی کرتا تھا۔ اس کے باپ کی جگہ تھا وہ۔

مسز گوہر گھبرا کر کھڑی ہوگئیں۔ پیسے مانگنے کی دیر تھی کہ یہ سب ہوگیا۔ اب پاکستان میں وہ کیا فٹ پاتھ پر رہیں گے۔ ان کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں اور جو حالات اب بن گئے تھے۔ اگر وہ یہاں رہتیں تو بھی احمر انہیں سپورٹ نہ کرتا۔

"چلو آؤ فرزام! میرے ساتھ۔" انہوں نے اسے لے جانا چاہا۔ لیکن اس انداز پر فرزام کو جس صدمے نے آن گھیرا تھا' وہ اس کی بابت بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مسز گوہر اسے چلنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"پلیز ماما! دوبارہ میرے گھر ایسے لڑائی جھگڑا کرنے مت آیئے گا۔" احمر یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکا۔ مطلب گھر آیئے گا ہی مت۔

"کیا ماما آپ سے لڑ رہی ہیں؟ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟" فرزام جاننا چاہتا تھا۔ مسز گوہر نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

"تم اپنی بکواس بند کرو۔"

"میں بکواس کر رہا ہوں؟"

"فرزام! چلو میرے ساتھ..."

"ایک سیکنڈ مام... ذرا کلیئر کرلینے دیں۔ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ آپ ایسے بات کیوں کر رہے ہیں؟"

"مجھے تمہیں ایک روپیہ نہیں دینا۔ سن لیا ماما آپ نے بھی؟ یہ سب میں نے رات دن کی محنت سے بنایا ہے۔ آپ ایسے ہی میرے ساتھ یہ سب نہیں کرسکتیں۔" فساد کی جڑ وہی پیسے...

"مام! کوئی پیسوں کا مسئلہ ہے؟" فرزام اپنی مام کی طرف دیکھنے لگا۔ مسز گوہر نے خود کو بولنے سے روک لیا۔ اب تو لڑائی اور ہی بڑھتی نظر آرہی تھی۔

"یہ مجھ سے میرے پیسے مانگ رہی ہیں' تمہیں دینے کے لیے۔" احمر نے زیادتی اور جھوٹ کی حد پار کرلی مزے سے۔ جب اس نے حد پار کرلی تو مسز گوہر نے بھی سوچا کہ کم سے کم فرزام کو اب تو سچ معلوم ہونا ہی چاہیے۔

"پاکستان میں جو ہماری پراپرٹی تھی۔ اسے میں نے احمر کے کہنے پر بیچ دیا اور سارے پیسے اسے دے دیے۔ اب اصولاً" اسے تمہارے حصے کے پیسے تمہیں دے

دینے چاہئیں۔"

"یہ جو آپ اتنا عرصہ یہاں رہی ہیں۔ یہ یہاں رہا ہے۔ اسے کالج تک بھیجا۔ ہر طرح کے اخراجات پورے کیے تو وہ تھوڑے سے پیسے ابھی تک باقی ہیں؟"

"تھوڑے سے احمر... ڈھائی کروڑ کا تو صرف میرا گھر ہی تھا۔"

"ڈھائی کروڑ یہاں پر ڈھائی کروڑ نہیں رہتے۔"

"ماما...!" فرزام نے اپنی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ابھی دو دن پہلے آپ نے مجھے کہا تھا کہ وقت کی زبان پڑھنا سیکھو۔ اب میں سیکھ رہا ہوں تو آپ کیوں بھول رہی ہیں؟"

"لیکن فرزام...!" آنسو ان کی آنکھوں سے نکلنے لگے۔ تانیہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی' احمر "ہونہہ" کی صورت بنائے کھڑا تھا۔

"ماما...! احمر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کو ان سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے آپ آئیں میرے ساتھ۔" مسز گوہر نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھا اور دکھی ہوگئیں۔ دونوں ماں بیٹا بلڈنگ سے باہر آگئے بہت دیر تک واک کرتے رہے خاموشی سے...

"دو ان بعد میں جا رہا ہوں ماما... یقین جانیے میں اتنا ہلا ہوگیا ہوں۔ مجھے عقل نہیں آئی۔ لیکن اتنے سے دنوں میں مجھے بہت عقل آگئی ہے۔ اب میں مرد ہوں۔ رو نہیں سکتا اور ایسا کچھ برا بھی نہیں ہوا ہمارے ساتھ۔ جو کچھ ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے۔" وہ آنکھیں صاف کرتی اپنی ماں کو تسلی دے رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس سب پر مسز گوہر بہت دکھی تھیں۔

"آپ بھائی کے پاس ہی رہیں گی۔ جب تک پاکستان میں' میں سیٹل نہیں ہوجاتا۔"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ تانیہ کے شوہر کے ساتھ میں کہاں رہوں گی؟"

"چند ماہ تو رہیں یہاں۔"

رات گئے تک ان کی واک جاری رہی۔

اگلے دن فرزام نے گتے کے ایک بڑے ڈبے میں کارڈز' کچھ شرٹس' چند کھلونے اور چند اور مختلف چیزیں رکھیں۔ ڈبا اٹھا کر ٹیوب سے وہ اپنے کالج آگیا اور گیٹ کے باہر ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

"رومی!" بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اسے آواز دی۔ وہ اپنی تین دوستوں کے ساتھ باہر آرہی تھی۔ وہ ان تین دوستوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ انہیں دور سے ہی ہاتھ ہلا کر "ہائے" کہا۔ انہوں نے بھی ہاتھ ہلایا اور وہیں کھڑی رہیں' نہ چاہتے ہوئے بھی رومی کو اس کے قریب آنا پڑا۔ منہ بنائے کھڑی رہی کہ بولو کیا بات ہے۔

"یہ تمہاری چیزیں لایا ہوں۔" اس نے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

رومی کا منہ اور بگڑ گیا۔ "گھر تو تم ملتیں نہیں۔ سوچا یہیں دے جاؤں۔"

"اس ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جیسے تمہیں "محبت" کا ڈراما کرنے کی ضرورت تھی۔"

"کافی غصے میں لگ رہے ہو۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔

"ٹیک اٹ ایزی۔"

"اب ہی تو غصے میں نہیں ہوں۔ پھر تو تم سے کبھی ملاقات ہوگی نہیں۔ تم میری دی ایک ایک چیز واپس کردینا۔" وہ کہہ کر جانے لگا۔

"اپنی اگلی گرل فرینڈ کو دو گے' میری استعمال کی گئیں چیزیں...؟" وہ ہنسی۔

"اسے دکھاؤں گا اور بتاؤں گا کہ چیزوں سے محبت کرنے والوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ سچی بنی محبت کرنے والوں سے ساتھ... صرف ہنسنے گانے' مزے کرنے والوں سے... جب تک اسکول' کالج کی ہر لڑکی کا مجھ پر کرش رہا۔ اس وقت تک میں تمہیں عزیز رہا کہ "میں نے جیت لی فرزام نام کی ٹرافی۔" جب اسی کالج میں میرے خلاف باتیں کی گئیں تو تم نے ٹرافی کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔"

"ہونہہ۔۔۔ اب تو تم پاگل بھی ہو گئے ہو۔" ہو بہو وہ اپنی بہن تانیہ جیسی لگ رہی تھی۔

"بہت وقت پر پاگل ہوا ہوں۔ نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا ہے۔ میرے ساتھ بہت بڑا معجزہ ہوا ہے۔ مجھے اتنا کچھ معلوم ہو گیا۔ اتنا سب کچھ تو گوگل بھی نہیں بتا سکتا۔ ورنہ میں تو ہر سنڈے تمہارے ساتھ موویز پر ہی جاتا رہتا۔"

"معجزہ تو میرے ساتھ ہوا ہے مسٹر فرزام۔۔۔! میری زندگی بچ گئی۔" بالوں کو جھٹک کر کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ دے کر اس نے کہا۔

"اور میرا دل۔۔۔ تمہاری زندگی نہیں بچی۔ صرف تمہاری پلاننگ محفوظ رہی ہے۔ ایک بڑا گھر ہو' خوب صورت شوہر ہو' ویک اینڈ پر پارٹی ہو' آؤٹنگ ہو۔۔۔ اس برائٹ پلاننگ میں تمہیں مشقت نامی چیز گوارا نہیں تھی۔ مشکلات تمہیں پسند نہیں اور پاکستان میں ایک تھرڈ کلاس زندگی کا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

"اب تم جو چاہو' سوچو۔۔۔ میں تمہیں فارغ کر چکی ہوں۔" بھرپور طنز کیا۔ اسے طیش دلانا چاہا۔

"اس پر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" جھک کر وہ کورنش بجا لایا۔ رومی پلٹ کر آگے چلنے لگی۔

"رومی۔۔۔!" اس نے پیچھے سے آواز دی۔ رومی نے صرف گردن موڑ کر دیکھا۔

"نہ جانے مجھے یہ بھی کیوں لگتا ہے کہ تمہاری زندگی میں آنے والے بھی تمہیں بار بار فارغ کریں گے۔ اگر ان میں تھوڑی سی بھی عقل ہوئی تو۔"

"ہونہہ!" کی شکل بنائے رومی ڈبے کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس محبت کا اختتام بہت آرام سے ہو گیا' جس کا رومی صرف چند ہفتے پہلے تک بہت دھوم دھام سے جشن مناتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

چھ ماہ وہ پاکستان میں جھنگ میں بابا کے ایک دوست کے پاس رہا۔ وہ کمپیوٹر سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ کالج سے وہ نکالا گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی اور پاکستان میں ابھی کسی بھی کالج میں ایڈمیشن نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ سیشن شروع ہو چکے تھے۔ اب اسے سیشن ختم ہونے کا ہی انتظار کرنا تھا۔ انکل ہاشمی کی مدد سے اتنا ضرور ہوا کہ اسے ایک کوچنگ سینٹر میں انگلش ٹیچر کی جاب مل گئی۔ ایک اس کی انگلش ہی اچھی تھی اور وہ یہی پڑھا سکتا تھا۔ ماما نے اسے آتے ہوئے پیسے دیے تھے۔ پیسوں کا اسے مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن اب وہ فارغ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ زیادہ وقت کوچنگ سینٹر میں ہی رہتا۔ استقبالیہ پر بھی بیٹھ جاتا۔ جب وہ فر فر انگریزی میں بات کرتا تو انگلش کے لیے ٹیوشن کا پوچھنے آئے لڑکے لڑکیاں ایڈمیشن لے لیتے۔ کوچنگ سینٹر کا مالک اس سے بہت خوش تھا۔ اچھے پیسے دے دیتا تھا۔

چھ ماہ جھنگ میں اس کا اچھا ہی وقت گزر گیا۔ پھر مسز گوہر بھی پاکستان آ گئیں۔ ان کا آبائی شہر لاہور تھا۔ یہیں سے وہ برطانیہ گئے تھے۔ ان کے باقی رشتے دار بھی مختلف ملکوں میں سیٹل تھے۔ ماموں دبئی میں رہتے تھے اور احمر کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ نہ ہونے کے سلسلے میں ناراض تھے۔ اتنے ناراض تھے کہ بات ہی نہیں کرتے تھے۔ خالہ کینیڈا میں تھیں اور ان کے شوہر قدامت پسند مذہبی تھے۔ انہیں گوہر خاتون کے کٹے ہوئے بال پسند نہیں تھے اور فرزام کے چچا کے ساتھ بھی وہی معاملہ درپیش تھا' جو ان کا احمر کے ساتھ تھا۔ برسوں پہلے انہوں نے بھی ان کے حصے کی گاؤں کی زمین اپنے نام کروالی تھی۔

چند دن جھنگ میں رہ کر وہ دونوں لاہور آ گئے۔ انکل ہاشمی نے ان کے لیے ایک کرائے کے گھر کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ گھر ایم او کالج کے قریب تھا۔ بمشکل چار مرلے کا ہو گا۔ تین کمرے نیچے تھے۔ دو کمرے اوپر تھے۔ انہوں نے ایک سال کا ایڈوانس کرایہ دے دیا۔ ان چھ مہینوں میں مسز گوہر نے کسی نہ کسی طرح سے احمر سے کچھ پیسے لے ہی لیے تھے۔ کچھ ان کی اپنی بچت بھی تھی اور پاکستان میں بنائے گئے سونے کے

زیورات۔ چند زیورات انہوں نے تانیہ کو دے دیے تھے۔ باقی ان کا خیال تھا کہ اسے ڈیزائن بدلوا کر دے دیں گی۔ لیکن آنے والے وقت میں وہ جب اسے کچھ بھیج سکیں تو انہوں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔

زیورات بھی انہوں نے بیچ دیے۔ دو بیڈ روم اوپر سیٹ کر لیے۔ سیکنڈ ہینڈ فرنیچر مناسب اور اچھی حالت میں انہیں آرام سے مل گیا۔ ان دونوں کو زیادہ سامان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

لاہور شہر میں اب پڑھنے والے کم ہی ہوں گے۔ لیکن پڑھانے والے جگہ جگہ اڈے بنا کر بیٹھ گئے۔ فرزام کو اس کا بہت فائدہ ہوا۔ وہ شام سے رات تک تین مختلف اکیڈمیوں میں ایک ایک' دو دو' پیریڈز لینے لگا۔ دن میں وہ مسز گوہر کے ساتھ ان کے کام کرتا۔

برطانیہ جانے سے پہلے مسز گوہر اپنے گھر میں بچوں کے روایتی ملبوسات بنانے کا کام کرتی تھیں۔ ایک اچھی لوکیشن میں ایک اسٹور کرائے پر لیا تھا۔ جہاں میٹریل تیار ہونے کے بعد فروخت کیا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ دوسرے اسٹورز میں بھی ڈسپلے کیا جاتا تھا۔ کوٹھی کے نیچے والے پورشن میں یہی کام ہوتا تھا۔ وہیں ان کا چھوٹا سا آفس بھی تھا۔ احمر سے جب بار بار انہوں نے اپنے ٹھیک ٹھاک چلتے ہوئے کام کے بارے میں کہا تو احمر نے ہزار مثالیں دیں۔ انہیں سمجھایا کہ وہ یہی کام یہاں بھی کر سکتی ہیں۔ بلکہ یہاں تو ان کے کام کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ انڈین اور پاکستانی تو ترستے ہیں کہ انہیں روایتی پہناوے مل جائیں۔ اتنی یقین دہانیوں پر بھی سب بیچ باچ چلی گئیں اور آخر میں ان کے ہاتھ گھاٹا ہی آیا۔

انہوں نے پرانے کاریگروں سے رابطے کیے۔ لیکن جس معاوضے پر وہ لوگ اب پاکستانی انڈسٹری میں کام کر رہے تھے۔ وہ اتنا معاوضہ انہیں دے نہیں سکتی تھیں۔ اب انہیں کم معاوضے پر لیکن اچھے کام کرنے والے چاہیے تھے۔ کٹنگ کا کورس تو وہ برطانیہ سے کر آئی تھیں۔ ساتھ ہی دوسرے چھوٹے بڑے کلاس لے لی تھی۔ اسی لیے اب انہیں کٹنگ ماسٹر رکھنے کی تو ضرورت نہیں تھی۔ دو ماسٹر جی رکھے سلائی کے لیے۔ ایک کاریگر مشینی کڑھائی کے کام کے لیے اور ایک کاریگر فریم ورک کے لیے۔

ایک مہینے سے وہ شاہ عالمی بازار جا جا کر میٹریل اکٹھا کر رہی تھیں۔ پہلے انہیں یہ سہولت تھی کہ ان کے پاس کار تھی اور مخصوص دکان داروں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ انہیں کسی کے بھی ہاتھ میٹریل کی فہرست بھیج دیتیں اور پھر جا کر چیک کر کے لے آتی تھیں۔ رنگ ساز کے ساتھ ماہانہ حساب کتاب تھا۔

شاہ عالمی میں انہوں نے پرانے دکان دار ڈھونڈنے چاہے۔ مگر ان میں سے صرف ایک ہی ملا۔ وہ ایک ہی بہت تھا۔ فہرست ہاتھ میں لیے انہیں بار بار بازار جانا پڑتا۔ پھر اتنا سامان دونوں کو اٹھا کر رکشے میں ڈال کر لانا پڑتا۔ فرزام تو انہیں سامان اٹھانے نہ دیتا۔ لیکن اپنے بیٹے پر اتنا بوجھ ڈالنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ شروع شروع میں فرزام شاپر ہی پکڑ لیتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے عجیب کام کیا۔ وہ ایک بڑا اور چوڑا کپڑا اپنے ساتھ لے آیا۔ سارے سامان کو اس میں باندھا اور دکان دار کی مدد سے اس نے وہ گٹھڑی اپنے سر پر رکھوالی۔ مسز گوہر کی چیخ نکل گئی۔

"فرزام! تمہاری گردن میں جھٹکا آ جائے گا۔ خدا کے لیے ایسے مت کرو۔ پلیز اسے اتارو۔"

"نہیں ماما۔۔۔ میری گردن ٹھیک رہے گی۔۔۔ میں نے بہت سے لوگوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ آپ مجھے بھی کرنے دیں۔"

"تمہیں عجیب نہیں لگ رہا؟" وہ خوف زدہ نظروں سے اس کے سر پر جمی گٹھڑی کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ اب گری کہ اب گری۔

"نہیں ماما! ایسی باتیں بھی عجیب لگتی ہیں کیا؟"

شاہ عالمی کے رش میں وہ دونوں جگہ بناتے آگے پیچھے۔۔۔ کبھی ساتھ ساتھ گزر رہے تھے۔

"مجھے تو بہت مزہ آ رہا ہے اس روٹین کا۔ جانتی ہیں ایک بہت بڑی جاپانی کمپنی کا مالک اپنے گھر کی کیاریوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی خود دیکھ بھال کرتا ہے' کھاد ڈالتا ہے' کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ جب میں نے اس کے بارے میں پڑھا تو سوچا کہ جب میں بھی اس جتنی بڑی کمپنی کا مالک بن جاؤں گا تو میں بھی ایسے ہی پودوں میں کھاد ڈالا کروں گا۔ اپنے جوتے پالش کیا کروں گا۔ پر مجھے اب معلوم ہوا ماما کہ وہ یہ سب کمپنی بنانے سے پہلے کرتا رہا ہے۔ بڑے کام سے پہلے ہی چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان فیکٹ سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں شرم نہیں کرنا چاہیے' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا ماما؟" گٹھڑی والا سر اس نے ذرا سا موڑ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں! میرے بچے۔ اتنی عظیم باتیں کر رہے ہو کہ مجھے راستہ ہی دکھائی نہیں دے رہا۔"

"ہاہاہا... آنکھیں صاف کرلیں نا۔ بات بات پر رویا مت کریں۔" وہ ہنسا تو وہ بھی ہنسنے لگیں۔

گھر میں کام شروع ہوگیا۔ دن میں فرزام نمونے لے کر انار کلی' کرشن نگر' باغبان پورہ' سنت نگر' بھاٹی دروازے' لاہور اسٹیشن' صدر' گوال منڈی' اچھرہ بازاروں میں' دکانوں میں جا جا کر آرڈر زلیتا۔ دیکھنے میں وہ ذرا انگریز انگریز لگتا تھا۔ انگریزی لب و لہجے کی اردو بولتا تو بہت ہی پیارا' چھوٹا سا صاحب لگتا نمونے دیکھنے والے سوچتے کہ گورا صاحب کام کر رہا ہے۔ کوالٹی بھی اعلا ہوگی اور باقی میٹریل بھی اور ساتھ ساتھ وہ اپنے گاہکوں سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "انگریز کی صنعت کے بنے ہیں" جیسے جاپان کی مشینری' کوریا کی جیولری' ترکی کا فرنیچر اور اب انگریز کے کپڑے...

پھر وہ بات بھی بہت اچھے انداز میں کرتا تھا' دکانوں میں جاتا تو اس کی مہمان نوازی کرنے کو ان کا جی چاہتا۔ انہیں آہستہ آہستہ آرڈرز ملنے لگے۔ وہ آرڈر زلیتا بھی اور سپلائی بھی کرتا ایک عدد سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل اس نے لے لی تھی۔ لیکن لاہور کی سڑکوں پر' خاص طور پر اچھرے اور بھاٹی دروازے کے بازاروں کی چھوٹی بڑی پھنسی ہوئی سڑکوں پر بائیک چلانا امریکا کے سب سے اونچے پل کے موٹے رسے پر بائیک چلانے کے قریب برابر تھا۔ ہر بار واپسی پر آکر وہ کہتا۔

"تیرا لعل زندہ آگیا ماما...! جلدی سے امیر ہو جائیں ورنہ میری خیر نہیں۔" وہ ہنس دیتیں۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کے دن تھے دونوں ماں بیٹا چھوٹی سی چھت پر کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ قریب قریب کی سب ہی چھتوں سے آوازیں آرہی تھیں۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ پچھلے تین گھنٹے سے بجلی نہیں آرہی تھی۔ رات ایک بجے کا وقت تھا۔ نیند تو اسے بہت آرہی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔

"پاکستان میں اب زیادہ ہی گرمی نہیں ہونے لگی؟"

"پہلے بھی اتنی ہی تھی۔" وہ ساتھ ہاتھ کا پنکھا اسے بھی جھل رہی تھیں۔

"لیکن ماما! پہلے مجھے اتنی گرمی نہیں لگتی تھی۔"

وہ ہنسیں۔ "تب تم ایک کینال کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ جس کے آگے ایک کھلا لان تھا۔ بہت سے درخت اور پودے تھے گھر میں اور آرکیٹیکٹ نے گھر کو ایسے ڈیزائن کیا تھا کہ وہ گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہوتا تھا۔"

"اچھا...! ہمارے مالک مکان کو بھی ایسے ہی گھر ڈیزائن کروانا چاہیے تھا۔ دیکھیں! کتنا گرم گھر ہے ان کا۔ اتنی جلدی گرمی آجاتی ہے لاہور میں۔"

"چار مرلے کے گھر کو وہ کیا ڈیزائن کرواتا۔ پھر یہاں زیادہ تر لوگ موسم کو دیکھے بنا ہی گھر بنوا لیتے ہیں اور تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ ہمارے گھر میں ایر کنڈیشنڈ تھا ہر کمرے میں۔ سارا گھر ہی ٹھنڈا تھا۔ جس کار سے تم اسکول جاتے تھے... وہ بھی... تمہارا اسکول بھی۔ تو بیٹا! ایسے لوگوں کو کیا معلوم کہ پاکستان میں کتنی گرمی اور سردی ہوتی ہے۔ یہ سب تو کسی اور کو ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"یعنی غریبوں کو..."

"غریب ہونا برا نہیں..."

"لیکن مشکل ضرور ہے۔ یہ جو ہمارے پڑوس میں آنٹی رہتی ہیں نا... بازار سے آرہی تھیں۔ سچ ماما! گرنے کے قریب تھیں۔ شاید بلڈ پریشر کا مسئلہ تھا انہیں۔ میں نے انہیں بائیک پر بٹھا کر گھر تک چھوڑنے کے لیے کہا تو کہتی ہیں۔ "بھائی! میرے شوہر نے مجھے چھترمار کر گھر سے نکال دینا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "آنٹی! چھتر کسے کہتے ہیں تو بولیں کہ یہ "جو تم نے پیروں میں پہن رکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو شوز ہیں۔" تو وہ بولیں۔ "نہیں چھتر بھی کہتے ہیں۔"

مسز گوہر اتنا اونچا قہقہہ لگا کر ہنسیں کہ آواز ایک دو قریب کی چھتوں تک تو ضرور ہی گئی ہوگی۔

"کیوں اس کا اتنا سر کھایا تم نے... پاگل..."

"میرا اپنا دماغ گرمی سے گھوما ہوا تھا۔ پانی کی جو بوتل میں پینے کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔ وہ میں نے سر پر ڈال لی۔ ایک چھوٹا لڑکا بازار میں برف والا پانی بیچ رہا تھا۔ دس روپے میں اس سے بوتل بھروالی اور لڑکے سے کہا کہ تم ضرور بڑے ہو کر کسی بڑے ادارے کی باگ ڈور سنبھالو گے۔"

"کیوں آس دلائی اسے؟ ایسے تو ہمارے ملک میں ہزاروں بچے ہیں۔ کہاں ان کے مستقبل بنتے ہیں۔"

"ارے ماما! اس کا ضرور بنے گا۔ اسکول کے یونیفارم میں تھا۔ تین روپے کا گلاس دے رہا تھا۔ میں نے کہا کہ "دس کا تو بیچو۔ اتنی گرمی میں بیٹھے ہو۔" کہنے لگا۔ "ستر روپے کی برف آئی ہے۔ پانی مفت کا ہے۔ ساٹھ گلاس نکل جائیں گے آرام سے۔ اتنا منافع کافی ہے مجھے ملک میں اور مہنگائی نہیں کرنی۔"

"بہت خوب۔ کمال کا بچہ تھا۔"

"واپسی پر پیدل جا تا ملا... میں نے اسے گھر چھوڑ دیا۔"

"بہت خوب... تم بھی کمال کے بچے ہو۔" وہ ہنسیں۔

"اتنی بار اسپرے کیے ہیں میں نے۔ لیکن یہ مچھر آخر جاتے کیوں نہیں؟" وہ بار بار ریکٹ سے مچھر مار رہا تھا۔

"اسپرے سارے علاقے میں ہوگا تو ہی مچھر ختم ہوں گے وہ بھی شاید..." وہ تیزی سے پنکھا جھلنے لگیں تاکہ مچھر فرزام سے دور ہی رہیں۔

"اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس کہ سارے علاقے میں اسپرے کروا دوں۔ لیکن اگر علاقے کے لوگ تعاون کریں تو میں پیسے اکٹھے کر کے کروا سکتا ہوں۔"

"فرزام! یہ عام لوگ ہیں۔ ان کی زندگیوں میں اتنے مسائل ہیں کہ یہ لوگ مچھر جیسے مسئلے پر سوچ ہی نہیں سکتے۔ یہ پھر' مکھیاں' گرمی' بجلی کا نہ ہونا۔ یہ سب ان کے لیے معمول کے اور معمولی مسئلے ہیں۔"

"مسئلے حل کرنے سے حل ہو جاتے ہیں۔ ختم نہیں ہوتے تو کم ضرور ہوتے ہیں۔"

"جن کی زندگیوں میں روٹی کا مسئلہ ہو۔ وہ اور مسئلوں پر کیسے توجہ دیں؟"

"چلیں مان لیا... روٹی' مہنگائی' بے روزگاری... یہ مسئلے ہیں' لیکن ماما! گندگی... یہ تو مسئلہ نہیں ہے نا۔ غریب لوگ غریب ہیں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ گندے کیوں ہیں۔ کیا صفائی ستھرائی میں بھی پیسے لگتے ہیں۔ گھروں کے سامنے گند ہے... اندر گند ہے... بچے گندے ہیں... میں نے گلیوں میں بغیر نیکر کے گندے سندے کپڑوں میں بہت بار بچوں کو دیکھا ہے... ماما! عورتوں کو ان سب کا تو خیال رکھنا چاہیے نا؟ گھروں کے آگے کوڑا پھینکنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ایک گلی کو صاف رکھنے میں کتنے پیسے لگتے ہیں... اور میں جب جب پائپ لگا کر گھر کے آگے دور تک کا حصہ صاف کرتا ہوں تو ساتھ والی آنٹی کے سارے بچے آکر میرے سر پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دو چھوٹوں سے لڑکیاں بھی مجھے دیکھتی ہیں۔ سچ ماما! میں بہت شکر گزار ہوں برطانیہ کا۔ اس نے میری بہت سے معاملات میں بہت اچھی تربیت کی ہے۔"

اس تربیت کا اس نے ذرا سا استعمال کیا اور گھر گھر جا کر پیسے لیے۔ وہ ہر ایک کے دروازے پر جاتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور مچھر کے کاٹنے پر لیکچر دیتا۔ سب دروازوں کی پردوں کی اوٹ میں کھڑی سنتی رہتیں۔ کچھ پیسے پکڑا دیتیں۔ کچھ کہتیں کہ "ان کے ابو آئیں گے تو ہی جواب دیں گی۔" ایک آنٹی کو فرزام نے کہہ دیا کہ "کیا مچھر آپ کو آپ کے ابو سے پوچھ کر کاٹتا ہے۔" وہ تو ہنسیں۔ ساتھ کے گھروں کی تین اور آنٹیاں بھی دل کھول کر ہنسیں۔

اسپرے پر آنے والی کل لاگت فرزام نے لگالی تھی۔ گھر بھی گن لیے تھے۔ اب ہر ایک کو ایک جیسی رقم دینا تھی' پیسے اتنے زیادہ بھی نہیں تھے۔ کم از کم وقفے وقفے سے تین بار اسپرے ہونا تھا۔ کچھ نے بحث کر کے پیسے دیے کچھ نے بنا بحث کے دے دیے اور کچھ نے سرے سے دیے ہی نہیں۔ جنہوں نے نہیں دیے۔ ان کے فرزام نے اپنے پاس سے ڈال لیے۔ اس کے پاس بھی زیادہ پیسے نہیں تھے۔ لیکن اس نے سوچا کبھی تو آہی جائیں گے۔ فی الحال مچھروں کو نہیں آنا چاہیے۔ وقفے وقفے سے تینوں اسپرے ہوگئے۔ کشادہ گلی میں سڑک کی طرف نکڑ پر ان کا گھر تھا۔ اندر سے اندر اور گلیاں نکلتی تھیں۔

اسپرے سے انقلاب تو نہیں آیا۔ لیکن مچھروں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ جنہیں برداشت کیا جاسکتا تھا۔ گلی میں رہنے والی ایک آنٹی اسے ملیں تو بہت پیار سے بولیں۔

"برا چنگا ایں توکا کے!" (بہت اچھے ہو تم لڑکے)

انہیں آرڈرز بھی مل رہے تھے اور وہ کام بھی کر رہے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ منافع زیادہ نہیں ہو رہا تھا۔ منافع جنریٹر کے پیٹرول میں نکل رہا ہے۔ ہر میٹریل کی قیمت ڈبل سے ٹرپل ہو چکی تھی۔ نیو سیشن میں بھی وہ ایڈمیشن نہیں لے سکا۔ اگر وہ ایڈمیشن لے لیتا تو آرڈرز اور سپلائی کا کام کون کرتا۔ کسی اور ور کر کو وہ فی الحال افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ کڈز گارمنٹس کے لگژری اسٹورز سے بھی انہیں آرڈرز مل گئے تھے۔ لبرٹی اور مون مارکیٹ کے کچھ اسٹورز سے بھی بات چیت چل رہی تھی۔ لیکن وہ اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ گلبرگ اور ڈیفنس میں کچھ اسٹورز ایسے تھے جن کے ساتھ بات چیت میں کئی گھنٹے گزر جاتے۔ وہ گھنٹوں بٹھا کر یہ سمجھاتے رہے کہ انہیں کس طرح کے فیشن کے کپڑے چاہئیں۔ کن رنگوں کے اور کس کام کے ساتھ۔

فرزام نوٹ کر لیتا تھا۔ آکر ماں کو بتا دیتا تھا۔ لیکن سلائی کے وقت وہ نقص نکالتے کہ آرڈر ویسا نہیں ہے اگر اتنے گھنٹے ماں ضائع کریں گی تو کٹنگ کا کام کون کرے گا اور اگر اتنے ہی گھنٹے فرزام ان سب کو نوٹ کرنے میں لگائے گا تو باقی کا کام کون کرے گا۔ لیکن وہ ان اسٹورز کو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتے تھے ان سے انہیں بروقت ادائی ملتی اور قریب قریب ان کی پسند کی ملتی۔

دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اخبار میں ایک ور کر کے لیے اشتہار دے دیا۔

☆ ☆ ☆

ایڈ میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہمیں ایک گریجویٹ کی ضرورت ہے' جو روانی سے انگلش بول سکے۔

"میں گریجویشن کر رہی ہوں۔"

"لیکن لیڈی! آپ ہیں تو نہیں نا۔"

"نہیں... لیکن ہو جاؤں گی..."

"لیکن..." وہ زچ ہو گیا۔ "دیکھیے! میں سمجھاتا ہوں کہ ہمیں گریجویٹ ہی کیوں چاہیے۔ کیونکہ اس ملک میں ایک گریجویٹ ہی اچھی انگریزی بول سکتا ہے۔"

"میری ایک بھابھی بی اے ہیں۔ وہ تو انگلش نہیں بول سکتیں۔" اس نے اتنی بے چارگی سے سچ بولا کہ فرزام اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"یہ انٹرویو اسی لیے تھے کہ معلوم کیا جاسکے کہ میرے پاس آنے والا بی اے انگلش بول سکتا ہے کہ نہیں۔"

"ایڈ میں لکھا ہے کہ اسے ڈیزائننگ کی سمجھ بوجھ

ہونی چاہیے... تو مجھے سمجھ بوجھ ہے۔ میں کسٹمر کی ڈیمانڈ کو آسانی سے سمجھ سکتی ہوں۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن لیڈی! آپ کو کسٹمر سے ڈیل نہیں کرنا۔ آپ کو کچھ گروپس سے ڈیل کرنا ہے۔ جہاں سے آرڈرز لینے ہیں' وہ اسٹورز گلبرگ اور ڈیفنس میں ہیں۔ کچھ سوسائٹیز میں ہیں۔ عام روٹین میں بھی ان لوگوں کو عادت ہوتی ہے انگلش میں ہی بات کرنے کی۔ ایڈ میں میل فی میل ضرور لکھا ہے' لیکن ہماری ترجیح لڑکا ہے' جو اپنی کنوینس پر آجاسکے۔"

"مجھے کڈز گارمنٹس میں بہت اچھا تجربہ ہے۔ میں جانتی ہوں میں آپ کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔" اس بار اور بے چارگی سے کہا گیا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو ایک اچھی جاب کی ضرورت ہے۔ لیکن..." اس کی شکل پر چھائی مایوسی دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

"اچھی جاب کی نہیں' ایک شریف جاب کی..." اسے لگا لڑکی رونے ہی والی ہے بس۔

"یہ جگہ میرے گھر سے قریب ہے۔ میں یہاں پیدل آسکتی ہوں۔"

"میں آپ کے لیے ضرور کچھ کرتا۔ اگر کر سکتا..." اس کی بے چارگی پر اسے ترس آیا۔

وہ چلی گئی۔ وہ وہاں آئی دس لڑکیوں اور پانچ لڑکوں میں سے چھٹی لڑکی تھی' ایک فریش گریجویٹ لڑکے کو فرزام نے او کے کر دیا۔ انٹرویو ان کے گھر میں ہی ہوئے تھے۔ جہاں ایک کمرے میں انہوں نے ایک میز اور دو کرسیاں رکھ کر اسے آفس بنا لیا تھا۔

رات کو وہ ماں سے اس لڑکی کا ذکر کرنا نہیں بھولا۔

"اس نے کہا کہ اسے ایک شریف جاب کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے بہت برے حالات دیکھے ہیں اس نے۔ کہہ رہی تھی کہ کڈز گارمنٹس کی اسے بہت سمجھ بوجھ ہے۔ مام! آپ اسے اپنے ساتھ ہیلپر کیوں نہیں رکھ لیتیں۔"

"ہم ایک اور ور کر کی تنخواہ کہاں سے نکالیں گے؟"

"ہو سکتا ہے' ابھی وہ کم پیسوں پر مان جائے۔ پھر آنے والے وقت میں ہم اسے زیادہ دے سکیں۔ میرے انکار پر وہ رونے والی ہو گئی تھی۔ کچھ کیجیے مام..."

"دیکھ لو۔ ابھی ہم اتنے منافع میں نہیں جا رہے۔" نیچے آکر اس نے وہ فہرست نکالی۔ جس پر ہر امیدوار کا نمبر لکھا تھا۔ اس نے نمبر کو موبائل میں محفوظ کر لیا۔ تاکہ صبح اسے کسی بھی وقت فون کر سکے۔ پھر اسے خیال آیا کہ یقیناً آج وہ بہت مایوس ہو گی۔ اگر وہ ابھی فون کر دے تو شاید یہ اس کے لیے اچھا ہی ہو۔ اس نے فون کیا۔ وہ اس لڑکی کی آواز تو بالکل نہیں تھی۔ فرزام نے اپنا تعارف کروایا۔

"مجھے افق عبدالقدوس سے بات کرنی ہے۔ آج وہ میرے پاس انٹرویو کے لیے آئی تھیں۔"

☆ ☆ ☆

اسے نو بجے آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ سوا آٹھ بجے ہی وہاں تھی۔ مسز گوہر خود فجر کے بعد نہیں سوتی تھیں۔ اپنا کام کرنے لگتی تھیں۔ اسے وقت سے اتنا پہلے دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی۔ البتہ انہوں نے اسے کام سمجھا دیا۔ پہلے اسے ہر میٹریل کو دیکھ کر فہرست بنانا تھی کہ کون سا میٹریل کتنا ہے۔ بڑے کمرے میں سب میٹریل رکھا ہوتا تھا۔ اس نے نو بجے یہ کام کر لیا۔ مسز گوہر حیران ہوئیں۔ وہ اچھی خاصی پھرتیلی تھی۔

"تم نے اس سے پہلے کہاں کام کیا ہے افق؟" اس کی پھرتی کو دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ وہ کسی بڑے ادارے میں کام کرتی رہی ہے۔

"میں..." وہ بتاتے ہوئے شرمندہ ہو گئی۔ "دو دن پہلے تک میں ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتی رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" انہیں محسوس ہوا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔

چھوٹے سے جس ریسٹورنٹ میں وہ کام کرتی رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔اس میں اس سمیت دو اور لڑکیاں تھیں۔ دو لڑکے تھے' جو آرڈر لیتے تھے۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہو کر فاسٹ فوڈ کوٹرے میں رکھ کر آرڈر زلانے والے بوائز کو دیتی تھیں۔ آنے والے کسٹمر خود بھی کاؤنٹر تک آکر اپنی ٹرے لے سکتے تھے اور تین لڑکیاں جب کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوں تو وہاں تک آنا کسی کو برا نہیں لگتا تھا۔ افق ہر روز کاؤنٹر سے اٹھ کر دس بارہ ویٹنگ کارڈز ڈسٹ بن میں پھینکتی تھی۔ یہی حال دوسری لڑکیوں کا بھی تھا' انہیں ان کی خوب صورتی کی بنا پر رکھا گیا تھا۔

اس سے پہلے اس نے قذافی اسٹیڈیم میں نئے نئے بنے ہائپر اسٹار شاپنگ سینٹر میں نوکری کی تھی۔ وہاں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس کا کام ریکس کو چیک کرتے رہنا اور ان میں رکھی گئیں مصنوعات کی کمی پر انہیں وہاں لا کر رکھنا تھا' وہ سارا وقت لوگوں کی نظروں میں رہتی۔ آتے جاتے اس کے ہاتھوں کو' کمر کو مس کیا جاتا۔ بہانے سے اسے کارڈز دیے جاتے۔ یہ سب تو کم تھا۔ اس کے ایک کولیگ لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کئی ہفتوں سے اس کا نمبر مانگ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کی جاب ملتے ہی اس نے شاپنگ سینٹر کی جاب چھوڑ دی۔

اس جاب میں ایک اور مسئلہ تھا۔ اسے دو بسیں بدل کر انارکلی سے قذافی اسٹیڈیم آنا پڑتا۔ اس کی آدھی تنخواہ کرایہ میں ہی نکل جاتی۔ اماں کی گھر واپسی کے بعد انہوں نے ایک وقت کا کھانا کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ انہیں گرمی نہ لگنے دی جائے۔ انہوں نے سیدھا سیدھا اے سی کے لیے کہا تھا۔ علاج کے سارے اخراجات دانیہ نے اٹھائے تھے تو جو پیسے جمال کے پریس کے مالک اور اسکول کی میڈم نے دیے تھے۔ اس سے انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ اسپلٹ اے سی لگوالیا تھا۔ اماں نے بہت نہ' نہ کی۔ لیکن اس نے بھابھی کے شوہر کو پیسے دے دیے۔ یہ اماں کی زندگی کے لیے زمین آسمان ایک کر سکتی تھی۔

اماں کی بیماری جا چکی تھی۔ لیکن زندگی جیسی بیماری ابھی ساتھ تھی۔ وہ اماں کے اسکول میں گئی۔ لیکن وہاں اسے تین ہزار میں ٹیچر رکھا جا رہا تھا۔ ایف اے پاس لڑکی کو اتنے ہی مل سکتے تھے۔ تین ہزار میں تو بجلی' گیس کا بل بھی ادا نہیں ہونا تھا۔ اماں کے لیے جو مخصوص خوراک آنی تھی' وہ الگ۔۔۔ اس مقام پر ایسا ہوا کہ افق ان سب کی اماں بن گئی۔ اپنی اماں کی بھی اماں۔۔۔ پہلے وہ صرف کام کرتی تھی۔ اب اسے کام کے ساتھ ساتھ سب کچھ سنبھالنا بھی تھا۔ اسے صرف دو وقت کی روٹی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اسے دو وقت کی روٹی جمع بھی کرنا تھی۔ اماں پر جو وقت آیا اور پھر اسے بھیک مانگنی پڑی۔ اس نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ جس پل پر سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اس کے اختتام پر ایک عبارت لکھی تھی۔

"خود کو روندے جانے کے لیے تیار مت کرو۔"

اور افق اب کی بار کسی دکھ' تکلیف یا انسان کے ہاتھوں روندے جانے سے ڈرتی تھی۔ زندگی میں صرف جینا ہی نہیں آنا چاہیے۔ اگر پیچھے سیلابی ریلا آجائے تو بھاگنا آنا چاہیے اور اگر ریلا آ ہی جائے تو تیرنا آنا چاہیے۔ زندگی میں صرف کھانا اور سونا ہی نہیں آنا چاہیے۔

انسان کوئی جانور نہیں ہے کہ شیر صرف دھاڑ ہی سکتا ہے اور مچھلی صرف تیر ہی سکتی ہے۔ کوئل گائے گی اور سانپ پھنکارے گا۔ بندر درختوں پر چڑھے گا اور خرگوش صرف زمین کھود کھود کر سرنگ اور گھروندے بنائے گا۔ یہی سب تو انسان کو جانور سے الگ کرتا ہے کہ انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے فطرت نے ایک خاص خوبی تک پابند نہیں کیا۔ پھر بھی لوگ جانوروں کی طرح خود پر بوجھ لدوا لیتے ہیں' چابک کھاتے ہیں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیر تک چاٹتے ہیں۔

افق نے تین ہزار کی وہ اسکول کی نوکری کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری نوکری کے بارے میں معلومات کرنے لگی۔ اگلی نوکری اسے ساڑھے تین ہزار میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر ملی۔ اسے کاؤنٹر پر بیٹھ کر ٹوکن

اینے ہوتے' فون ریسیو کرنے ہوتے اور باری باری ہر ٹوکن نمبر کو اندر بھیجنا ہوتا۔ پھر اسے شاپنگ سینٹر کی جاب کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہاں اسے دس ہزار نے جا رہے تھے۔ جیسے تیسے اس نے وہ جاب کی اور پھر گوالمنڈی میں بنے ایک نئے ریسٹورنٹ میں آگئی' یہاں اسے صرف چھ ہزار ملتے تھے' لیکن جمال اسے سائیکل پر یہاں چھوڑ جاتا تھا۔ جمال نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ جمال نے کہا کہ وہ پرائیوٹ پڑھ لے گا اور پڑھنے کا کیا ہے زندگی میں کبھی بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

رات کو دونوں بھائی پریس جاتے اور دن میں جمال ایک کپڑے کی دکان پر کام کرتا۔ اماں گھر میں اکیلی ہوتیں۔ بھابھی ہی آ آ کر پوچھتی رہتیں۔ مسز گوہر کے یہاں بھی وہ انہی کے ساتھ آئی تھی۔ انہی کے شوہر نے اخبار میں وہ ایڈ دیکھ کر دونوں کو بھیجا تھا۔ ریسٹورنٹ کے ماحول سے وہ عاجز آچکی تھی۔ اب وہ چند ہزار کے لیے خود کو ہر روز نیلام نہیں کر سکتی تھی۔ مسز گوہر نے اس سے کہا کہ منافع زیادہ ہوتے ہی وہ اس کی تنخواہ بڑھا دیں گی۔ ایک بند گھر میں ایک عورت کے ساتھ اسے کام کرنا تھا اور اسے بہت سکون تھا۔

جب وہ فیکٹری جایا کرتی تھی۔ تب ہی سے اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ڈیزائنر بنے۔ اماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ حالات اچھے ہوتے ہی وہ اسے ایک چھوٹا سا کورس تو ضرور ہی کرا دیں گی۔ ایک دوبار اس نے ایک دو خاکے فیکٹری کی ڈیزائنر کو دکھائے تھے۔ چند تکنیکی تبدیلیاں کر کے ڈیزائنر نے وہ کپڑے ڈیزائن کر دیے تھے۔ اس میں سیکھنے کی زبردست صلاحیت تھی۔

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے بہت سے کام کیے تھے۔ فرما گوندے گئے خاکی لفافے' کاج' بٹن' ریڈی میڈ کپڑوں پر کالر لگانا' ڈیکوریشن پیسز کی تیاری' جیولری' ونڈ بیگ' ڈیزائنر جوتوں پر اسٹون لگانے کا کام۔ وہ ہر کام تیزی سے کرتی۔ نفاست سے مکمل کرتی۔ یہی ہاتھی کا تجربہ تھا کہ مسز گوہر کی مدد کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مسز گوہر کپڑے کی ہر سائز کی کٹنگ کرتی تھیں۔ اس پر پھر ایمبرائیڈری اور اسٹون ورک ہوتا' پھر انہیں سلائی کیا جاتا' آخری کام انہیں اچھی طرح دیکھ کر ٹانکوں کو چیک کر کے' سائز کو پھر سے ناپ کر پیک کرنے کا ہوتا' ہر آرڈر کو الگ الگ پیک کرنا ہوتا۔ کس رنگ' میٹریل' ڈیزائن کے نمونے کتنے بنیں گے۔ یہ بھی الگ الگ فہرست میں درج کرنا ہوتا۔ آرڈر ڈلیور کرنے کی تاریخ ذہن میں یاد رکھنی ہوتی' مسز گوہر کا اصول تھا کہ وہ ایک بھی دن آرڈر لیٹ نہیں کرتی تھیں۔ اکثر رات رات بھر بیٹھ کر وہ اور فرزام کام کرتے۔

افق ماضی میں اتنے سارے کام کر چکی تھی۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔ فیکٹری میں جو اس نے تھوڑی بہت کٹنگ سیکھی تھی۔ وہ یہاں کام آگئی۔ وہ پانچ ماہ کی بچی کی شلوار قمیص آرام سے کاٹ لیتی۔ ماسٹر جی سلائی کرتے۔ وہ اگر فارغ ہو جاتی تو تیسری مشین پر بیٹھ کر سلائی کرنے لگتی۔ قمیصوں پر۔۔۔ چھوٹے چھوٹے شراروں پر تھوڑے بہت اسٹونز لگنے ہوتے تو وہ اٹھتے بیٹھتے آرام سے لگا لیتی۔ مسز گوہر کو شرمندگی ہوتی۔ ٹھیک ہے' وہ ان کی مدد کے لیے ہے۔ لیکن مدد سے ان کا مطلب اوپر کا کام تھا۔ کاریگروں والا کام نہیں۔۔۔ وہ گھر اس وقت نہیں جاتی تھی' جب وقت پورا ہو جاتا تھا۔ وہ اس وقت جاتی تھی' جب کام ختم ہو جاتا تھا۔ پہلے وہ صبح آٹھ بجے آتی تھی۔ پھر وہ سات بجے ہی آجاتی۔

"میرا بیٹا کہتا ہے کہ میں بہت محنت کرنے والی خاتون ہوں۔ لیکن افق! تم بہت بہت محنت کرنے والی لڑکی ہو۔ تم تو جن ہو۔ تم تھکتی نہیں۔۔۔ کیا کھاتی ہو؟"

"انسان کو کام نہیں' صدمات تھکا دیتے ہیں اور اب کام میرے لیے صدمہ نہیں۔ آپ کو نہیں معلوم' مجھے اس کام میں کتنا مزا آتا ہے۔ ہم روز نیا کام کرتے ہیں۔ نئے ڈیزائن پر' نئے رنگ پر' نئے کپڑے پر۔ رات بھر یہ رنگ میری آنکھوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ میں صبح تک ان سے ملنے کے لیے بے چین رہتی ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایسا ہی میرے ساتھ تھا۔ میرے شوہر گاؤں سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی محنت سے تعلیم مکمل کی اور جاب کی اور پھر مجھ جیسی عام سی لڑکی سے شادی کی۔ میں صرف بارہ جماعتیں پاس تھی۔ جس آفس میں وہ کام کرتے تھے۔ میں وہاں آپریٹر تھی۔ لیکن مجھے ڈیزائنر بننے کا بہت شوق تھا۔ جب ہم اپنا گھر بنا چکے تو انہوں نے میرا شوق پورا کردیا۔ مجھے بتایا کہ کیسے میں گھر پر رہ کر اپنا کام کرسکتی ہوں اور واقعی ایسا ہوگیا۔ میرے بنائے ملبوسات کو پسند کیا جانے لگا۔ میں ایک بڑے نام کی ڈیزائنر نہیں تھی۔ لیکن جو بھی تھا۔ میں خوش تھی۔ میں اپنی مرضی سے ڈیزائن کرتی اور اسے پسند کیا جاتا۔ اتنے سال برطانیہ میں میں نے اس شوق کو دبائے رکھا۔ رنگ مجھے بے چین کردیتے۔ میرے ہاتھوں میں آنے کے لیے مچلتے۔ اب میں اس چھوٹے گھر میں رہ کر چھوٹے سے پیمانے پر بہت محنت سے کام کررہی ہوں۔ لیکن میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔ تم اپنے ذہن میں آنے والے کسی بھی ڈیزائن کا خاکہ مجھے دکھا سکتی ہو۔ اچھا ہوا تو ہم اس پر کام کرلیں گے۔ کتابیں پڑھ کر ہی سب کام نہیں آتے۔"

افق مسکرانے لگی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اسے یہ پہلی خوش خبری ملی تھی۔ اس نے زندگی بھر کام کیا تھا۔ خواب نہیں دیکھے تھے۔ خواہش نہیں کی تھی وہ اپنی چادر کو جانتی تھی۔ لیکن ایک آدھ خواب ضرور پالنا چاہیے۔ اس خواب کے پیچھے ضرور بھاگنا چاہیے۔ اس خواب کے لیے جان توڑ کوششیں ضرور کرنی چاہیے۔ اگر یہ خواب نہ دیکھے جاتے تو دنیا کبھی اتنی ترقی نہ کرتی۔ اب افق نے پیسے، ضرورت سے ہٹ کر ایک خواب دیکھا۔ اپنے کامیاب ہونے کا۔

آدھے سے زیادہ کام وہ گھر لے جاتی تھی۔ کپڑوں کے تھان کے تھان وہ جمال کی سائیکل پر رکھ کر گھر بھجوا دیتی اور رات بھر بیٹھ کر چھوٹے سائز کے کپڑے کاٹ لیتی۔ پیپر پر خاکے بناتی کہ کس پر کس ڈیزائن کا کام ہونا چاہیے۔ کس رنگ کا۔ کس اسٹون کا۔ یہاں اسے فیکٹری میں کام کا تجربہ مدد دینے لگا۔ وہاں ایک ایک چیز کو تفصیل میں اور ترتیب سے کیا جاتا تھا۔ کالر کس رنگ کا ہوگا۔ بٹن کس رنگ، سائز کے ہوں گے کہاں کہاں لگے گے۔ پاکٹ کہاں ہوں گی، زپ کہاں۔ کس رنگ کے ساتھ کس رنگ کی میچنگ ہوگی۔

وہ ایک چھوٹے لیول کی لوکل فیکٹری تھی۔ لیکن اس اتنی سی فیکٹری میں کام بہت ترتیب سے ہوتے تھے۔ کوالٹی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فیبرک کو چیک کیا جاتا تھا۔ ایک انچ کی کمی بیشی نہیں کی جاتی تھی۔ ایسے پیسز جن میں کمی بیشی ہوجاتی تھی۔ انہیں ادھیڑ کر نئے سرے سے سلائی کروایا جاتا تھا۔ اس معاملے میں ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ کا ایک ہی اصول تھا۔ وقت اور قوت کتنی ہی صرف ہو۔ کوالٹی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ رات بھر بیٹھ کر وہ کٹنگ کرتی۔ خاکے بناتی۔ خاکے پر بنیادی باتیں لکھ دیتی اور صبح پہلے خود جاتی۔ پھر جمال سائیکل پر سامان چھوڑ جاتا۔ مسز گوہر چیک کرلیتیں۔ کمی بیشی دور کرکے، اوکے کرکے کاریگروں کے سپرد کردیتیں۔ آرڈرز کی تیاری میں تھوڑی سی تیزی آگئی۔ مسز گوہر وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ آرڈرز نہیں لیتی تھیں۔ اب ایک دو آرڈرز اور لینے لگیں۔ فارغ وقت میں وہ گلبرگ اور ڈیفنس کے اسٹورز میں جاکر ڈسکس کرلیتیں کہ ان کی ڈیمانڈ کیا ہے۔ اس طرح انہیں آسانی رہنے لگی۔ وہ وہی ڈیزائن کردیتی جو ان کی ڈیمانڈ ہوتی، جو انہیں چاہیے ہوتا۔

ایک دن شام گئے انہیں گلبرگ کے ایک اسٹور سے فون آیا کہ ایک میڈم ہیں۔ انہیں انارکلی فراک تین مختلف سائزز اور رنگوں میں چاہیے۔ میڈم کو ان کا نمبر دے دیا گیا۔ مسز گوہر نے ان سے بات کی۔ اگلے دن ان کے کزن کی بارات تھی اور انہیں وہ انارکلی فراکیں اپنی بھانجیوں کے لیے چاہیے تھیں۔ اسٹور پر موجود ایک وہ اپنی بیٹی کے لیے لے چکی تھیں۔ ان کی بھانجی کو بھی وہی پسند آگئی تھی۔ لیکن اس کے سائز کی اور موجود نہیں تھی۔ مسز گوہر کو یہ بھلا

والی تو ارزل رہا تھا اور ان کا ماننا تھا کہ کبھی بھی کسٹمر کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ کاریگر جانے والے تھے۔ میٹریل موجود تھا۔ فراکوں کے دامن اور گلے پر اسٹون ورک ہوا تھا۔ صرف اسٹون ورک کے لیے ہی انہیں آٹھ گھنٹے چاہیے تھے۔ معذرت کے ساتھ انہوں نے انکار کردیا۔

"آپ کو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" افق کو انکار پر اعتراض تھا۔

"کیا کرتی... دو گھنٹے تک سب ہی کاریگر چلے جائیں گے۔ انہیں کل دن میں بارہ بجے تک چاہیے۔"

"آپ ان سے بات کریں اور ان سے کہیں کہ اگر اسٹون ورک تھوڑا ہلکا ہوجائے تو... آپ جانتی ہیں کہ بچے ایک چیز پسند کرلیں تو انہیں وہی چاہیے ہوتا ہے۔"

"تو بھی ہم کیسے کام کریں گے افق... وقت نہیں ہے۔"

"آپ کاریگروں سے بات کریں میڈم! اگر وہ آج رات کام کرلیں گے تو آپ انہیں کل کی چھٹی دے سکتی ہیں۔"

"اگر کل انہیں چھٹی دے دی افق! تو باقی آرڈر کون تیار کرے گا۔ ہم صرف تین بچوں کے لیے اتنا کچھ کیوں کریں گے؟"

"ہوسکتا ہے، وہی میڈم ہمیں اور آرڈرز بھی دے دیں۔ وہ ہماری باقاعدہ کسٹمر بن جائیں۔ ہمیں ان سے آرڈرز ملتے رہیں۔"

"لیکن ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہمیں کوئی فائدہ نہ ہو۔"

"فائدہ ہو بھی سکتا ہے۔ ہماری فیکٹری میں ایسے آرڈرز کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔"

کافی دیر تک سوچنے کے بعد انہوں نے بیگم کو فون کیا۔ انہیں تفصیل میں بتایا کہ انہیں کتنے کام میں فراکیں مل سکتی ہیں۔ اس نے ہاں کہہ دی۔ اپنی مرضی کے تین مختلف رنگ بتادیے۔ رنگ سازی مسز گوہر خود ہی کرلیتی تھیں۔ رنگ ساز افورڈ نہیں کرسکتی تھیں۔ ایک مقامی ادارے میں دو گھنٹے ہر روز جاکر انہوں نے رنگ سازی سیکھ لی تھی۔ سفید شیفون کو انہوں نے بیگم کے بتائے رنگوں میں رنگا۔ اس دوران افق نے چوڑی دار پاجامے کاٹ دیے۔ سلائی ماسٹر وہ پاجامے سینے لگے۔ سارے کاریگر رات بھر کام کے لیے مان گئے تھے۔ اگلے دن کی چھٹی بھی انہیں مل رہی تھی اور رات کے کام کے الگ پیسے بھی۔ گھر فون کرکے افق نے اپنے کام کے بارے میں بتادیا تھا۔ مسز گوہر ایک بار اس کے گھر جاکر اماں سے مل آئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔

رات بھر کام ہوتا رہا۔ دونوں کاریگروں نے مل کر پہلے ایک کو اڈے پر لگایا۔ اس پر کام کیا۔ پھر دوسری کو... اس دوران سلائی ماسٹر ان کی ڈبل سلائی کرتے رہے۔ مسز گوہر اور افق دوپٹوں پر دوسری مشینوں سے بنارسی فیتہ لگاتی رہیں۔ مسز گوہر نے ہی انہیں کھانا منگوادیا تھا۔ درمیان میں آدھے گھنٹے کے وقفے سے وہ لوگ باری باری آرام کرتے رہے تھے۔ صبح فجر کے وقت دونوں کاریگر اپنے کام سے فارغ ہوکر چلے گئے۔ اگلے تین گھنٹوں میں ماسٹر صاحبان بھی چلے گئے۔ آخری مراحل میں دونوں نے سلائیاں چیک کیں۔ سائز کو ناپا۔ انہیں استری کیا اور پیک کردیا۔

جمال، افق کو لے کر گھر چلا گیا۔ بارہ بجے بیگم اپنے ڈرائیور کے ساتھ آکر سائز اور کام چیک کرکے لے گئیں۔ بیگم وہی قیمت دے گئی تھیں، جو مسز گوہر نے مانگی تھی۔ انہوں نے ایمرجنسی کام کیا تھا۔ مسز گوہر نے ڈبل قیمت مانگی تھی۔ وہ ڈبل ہی دے گئی تھیں۔

"بس بچے ہیں نا۔ جو چیز دیکھ لیتے ہیں، وہی مانگتے ہیں۔ میں کل ہی اٹلی سے آئی تھی۔ خریداری کرنے نکلی تو ایک ہی فراک بیٹی کو پسند آگئی اور وہی بھانجی کو... میری سسٹر نے کہا کہ اب باقی سب بھی ایسی ہی مانگیں گی۔ میرے لیے تو بہت مشکل ہوجاتا... پھر اتنا رولی ہیں نا یہ سب..."

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ ان کا پہلا آرڈر تھا' جسے انہوں نے راتوں رات مکمل کیا تھا۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ شاید انہیں ایسا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا کاریگروں کو چھٹی دینی پڑی اور اب اگلے آرڈر لیٹ ہو جائیں گے۔

دو دن وہ اسی پچھتاوے میں رہیں۔ افق سے بھی ذکر کیا۔ وہ شرمندہ ہوئی کہ شاید اسی کے مشورے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ لیکن ایسا ہوا کہ کچھ برا نہیں ہوا۔ بلکہ بہت اچھا ہو گیا۔ وہی بیگم ایک ہفتے بعد اپنی بہن کے ساتھ ان کے پاس موجود تھیں۔ دو ماہ بعد ان کی بہن کے دیور کی شادی تھی برطانیہ میں۔ بہن بھی وہیں کی رہنے والی تھیں۔ بہن نے اپنی دو بیٹیوں' نند کی تین' جیٹھ کی ایک بیٹی کا سائز لکھوا دیا۔ رنگ اور ڈیزائن نوٹ کروا دیے۔ لہنگے' چولی' انارکلی' چوڑی دار' گھیر دار شلوار وغیرہ۔ انہوں نے الگ الگ سب کے لیے تفصیلات بتا دیں۔ چار فنکشنز کے لیے چھ بچیوں کے کپڑوں کا آرڈر مل گیا۔ بجٹ وہ بتا گئیں اور اچھا خاصا ٹھیک ٹھاک بجٹ تھا وہ۔ صرف اپنی ہی بیٹی کے لیے بارات کی انارکلی فراک وہ چالیس ہزار کی بنوا رہی تھیں۔ آرڈر تیار کرنے کے لیے ان کے پاس ایک ماہ تھا۔ وہ آرام سے بنا سکتے تھے۔ کاریگروں کے ساتھ مسز گوہر کا بونس کا وعدہ تھا۔ اس آرڈر پر انہوں نے ہر کاریگر کو بونس دیا۔

چند ڈیزائن جو وہ منتخب کر گئی تھیں۔ ان میں سے ایک شرارے کا ڈیزائن تھا' جو افق کا تیار کیا گیا تھا۔ شرارہ بہت ہلکا پھلکا سا تھا۔ فیروزی رنگ کا شرارہ تھا اور ہلکے گلابی رنگ کی کرتی تھی۔ کرتی پر سفید اسٹونز کا چھن تھا۔ دوپٹا فیروزی اور گلابی رنگ کا تھا اور اس پر بھی سفید اسٹونز کا چھن تھا۔

پندرہ دن میں انہوں نے اپنے کام کے دوران ان کا آرڈر بھی تیار کر دیا۔ اپنا پہلا فارن آرڈر۔ سارا سامان برطانیہ بھجوا دیا۔

شپ منٹ وصول کرتے ہی انہوں نے تین اور بچیوں کے سائز نوٹ کروائے۔ ایک ہفتے بعد چھ اور بچیوں کے۔۔۔ مسز گوہر تین سال سے بارہ' تیرہ سال کی بچیوں کے کپڑے بناتی تھیں۔ لیکن پرزور درخواست کے ساتھ انہوں نے چھ ماہ' نو ماہ' ڈیڑھ سال' ڈھائی سال کی بچیوں کے لیے بھی کپڑے بنوا لیے۔ انہوں نے شاید شادی میں شرکت کرنے والے ہر خاندان میں موجود ہر بچی کا سائز انہیں لکھوا دیا تھا۔ اسی آرڈر سے منسلک ان سے تین' چار مختلف لڑکیاں فون پر گاہے بگاہے بات کرتی اور بتاتی رہتیں کہ انہیں کس طرح کے کپڑے چاہئیں۔ ان کا پہلا فارن آرڈر جس سے انہیں ایک بڑا منافع ملا۔ برطانیہ جیسے ملک میں جہاں شادی بیاہ کے روایتی کپڑوں کی خریداری مشکل کام ہے اور چھوٹی بچیوں کی تو بہت ہی مشکل ہے۔ اس میں ان کے ہاتھ ایک لوکل ڈیزائنر آ گئی' جو کہ ان کے نزدیک بہت مناسب قیمت پر اچھے کپڑے بنا کر دے دیتی تھیں۔

اس آرڈر کو تیار کرنے میں انہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب آئے دن انہیں وہاں سے فون کالز آنے لگیں اور وہاں سے گاہے بگاہے آرڈرز ملنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کا ریفرنس دے دے کر کہتیں کہ انہیں فلاں نے ان کا نمبر دیا ہے' فلاں نے دیا ہے۔ ایک سے دو اور دو سے کئی دوسرے کسٹمرز انہیں آرڈر دینے لگے۔

☆ ☆ ☆

"ماما۔۔۔! یہ جو لڑکی آپ کے ساتھ کام کرتی ہے نا۔ اسے کسی یورپین ملک میں ہونا چاہیے تھا۔"

"وہ کیوں۔۔۔؟"

"ارے ماما۔۔۔ یقین جانیں۔۔۔ میں نے ابھی تک کسی لڑکی کو سائیکل کے پیچھے ایسے بیٹھتے نہیں دیکھا۔ سارے لاہور میں ایک یہی واحد لڑکی ہو گی سائیکل کے پیچھے بیٹھنے والی۔"

"تم نے سارا لاہور دیکھ لیا؟" وہ مسکرائیں۔

"سارا نہیں دیکھا۔ جتنا بھی دیکھا ہے۔ اس میں وہ واحد ہے۔ شاہراہ قائداعظم جیسی پر رونق سڑک پر وہ سائیکل پر بیٹھ کر سفر کرتی ہے۔ بہت اعتماد ہے اس

بات نہیں فرزام! وہ ان باتوں کو معمولی جانتی ہے۔ اگر وہ پاکستانی معاشرے میں نہ ہوتی تو وہ خود سائیکل چلایا کرتی۔ بس کی کنڈیکٹر بھی بن جاتی۔ سکول بس چلاتی۔"

"اسی لیے تو کہا کہ اسے یورپ میں ہونا چاہیے۔ فل اسٹی لمبی چادر لپیٹ کر وہ پیچھے بیٹھتی ہے' کسی دن سائیکل میں چادر پھنسی نا' تو جس سڑک پر وہ گرے گی' اس پر سے مر کر ہی اٹھے گی۔"

"ایسے نہ کہو پاگل۔۔۔"

"ارے ماما۔۔۔ محنت سے کام کرنے والوں کے لیے پاکستان بہت سخت ملک ہے۔ عورتوں کے لیے خاص طور پر۔ عزت بھی سنبھالو' کپڑے بھی اور انا بھی۔ ان معاملات میں پاکستانی عورت دنیا کی دوسری عورتوں سے زیادہ محنتی ہے اور اگر اس عورت کا معاشرہ ذرا سا ساتھ دے تو یہ عورت کہاں سے کہاں جا پہنچے۔"

"تمہیں وہ سائیکل پر بیٹھی اچھی نہیں لگتی؟"

"اچھی بری نہیں ماما! برابر ہونا سمجھتا ہوں میں خود کو اس کے سامنے۔ اس کے سامنے ہی نہیں' اپنے کاریگر اسلم کے سامنے۔۔۔ جمال اور اسد کے سامنے۔۔۔ اس دن افق نے دس بار اسے گھر بھیجا چیزوں کے لیے۔۔۔ ماما! وہ دس چکر لگا کر آیا۔ پانچویں چکر میں' میں نے اسے پیسے دیے کہ رکشہ کر لو اور اس میں سب چیزیں لے آؤ تو بولا فرزام بھائی! آپ کو کتنی عادت ہے پیسے ضائع کرنے کی۔ ان پیسوں میں ایک کلو سیب آ جائیں گے۔ انہیں لیں اور کھائیں۔ میرے پاس وقت بھی ہے اور طاقت بھی۔۔۔ مجھے انہیں استعمال کرنے دیں۔ جیسے اس نے دس چکر لگائے ماما! میں اسے دیکھ دیکھ کر تھک گیا۔ لیکن وہ نہیں تھکا۔۔۔ کچھ دن پہلے میں ان کے پریس چلا گیا۔ اتنی گندی جگہ پر پریس ہے ماما! کہ بتا نہیں سکتا۔ دو فٹی گلی ہو گی بس اس میں سے گزر کر آگے پریس خانہ تھا اور اتنی بدبو اور گرمی وہاں۔۔۔ اسد اتنا پیارا لڑکا ہے۔ نیلی آنکھیں ہیں اس کی۔ اتنا خوبصورت ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ مجھے بہت ترس آیا۔ اسے اتنے گندے حلیے میں وہاں دیکھ کر۔ میں نے جمال سے کہا کہ میں اس کے لیے کسی اور نوکری کا پتا کر دوں تو کہتا ہے کہ ہمارے مالک نے ہمیشہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ آج کل وہ بیمار ہیں۔ ان کا کام ہم سنبھال رہے ہیں۔ ایسے انہیں چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جائیں گے۔" وہ بے حد متاثر نظر آ رہا تھا مسز گوہر مسکرا دیں۔

"ماما! میں نے آپ کو کبھی بتایا نہیں۔ لیکن میں اپنی زندگی کے اس طرح بدل جانے پر بہت دکھی تھا۔ برطانیہ سے نکالے جانے پر۔۔۔ اس بناکلی کے ملک میں رہنے پر۔۔۔ اور اب میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ کیونکہ لاکھوں سے کم تر ہو کر کروڑوں سے میں بہتر ہی رہا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی اصول اور فلسفہ نہیں بنایا۔ جمال کے پاس اصول ہیں۔ اسد کے پاس بھی ہیں۔ ماسٹر جی اور اسلم کے پاس بھی ہیں اور پانی بیچنے والے بچے تک کے پاس اصول ہیں۔ لیکن میرے پاس نہیں۔ ماما! جب ہم ایک پر آسائش زندگی گزارتے ہیں نا تو ہم صرف چیزوں کے نام اور انہیں استعمال کرنا ہی سیکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم جدوجہد میں آتے ہیں۔ مصائب کا شکار ہوتے ہیں نا تو ہی ہمیں اپنے اصل اور نقل کا پتا چلتا ہے۔ تب ہی ہم تانبے سے سونا بنتے ہیں۔ یہ ماسٹر جی ہیں۔ مشین خراب ہو جاتی ہے۔ گھنٹوں ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ یہ ان کا کام نہیں۔ پنکھا خراب ہوا۔ وہ بھی ٹھیک کر دیا۔ خود ہی جا جا کر پیٹرول لاتے رہتے ہیں جنریٹر کا۔ کبھی نہیں جتایا کہ میں تمہارے اتنے کام کر دیتا ہوں۔ اسلم کو میں نے اپنی کچھ شرٹس دینی چاہیں تو کہتا ہے "بھائی جی! کسی ضرورت مند کو دیں۔ میں تو اچھے خاصے رزق والا ہوں۔ اگر ایک بار لینے والوں میں سے ہو گیا تو دینے والا کبھی بھی نہیں بن سکوں گا۔" ماما! وہ دینے والا بننا چاہتا ہے بتائیے' مجھے ماما! عظمت کی اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں۔"

مسز گوہر گود میں رکھے اس کے سر کو پیار سے سہلاتی رہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اس دن آپ اسٹور جانے لگیں۔ آپ اپنے کپڑے اور جوتے نکال کر رکھ گئیں۔ ماما میں نے دیکھا کہ افق نے آپ کی جوتی کو کپڑے سے صاف کر دیا اور ویسے ہی واپس رکھ دی کہ آپ کو معلوم نہ ہو سکے کہ اس نے صاف کی۔ میں کچن کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی آپ کے جوتے تو کبھی میں نے بھی صاف نہیں کیے۔"

"مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ میرا بہت احترام کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں' وہ ایسی ہی ہے۔"

"وہ جیسی بھی ہے۔ ایسے بنے بنائے تو پیدا نہیں ہوتے نا؟ ایسا تو خود کو بنانا پڑتا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ کیا میں کچھ کچھ ان سب کے قریب کا ہو سکتا ہوں؟"

"میرا بیٹا بہت پیارا ہے۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

فرزام نے کالج میں بی ایس سی کرنے کے لیے ایڈمیشن لے لیا۔ اس کے پاس اب اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ کالج جا سکے۔ آمدنی بھی اچھی ہو گئی تھی۔ کالج سے آکر وہ آرڈرز کے لیے چلا جاتا۔ دوسرا لڑکا ان آرڈرز کو سپلائی کر دیتا۔ باقی لوگوں سے مسز گوہر فون پر رابطہ کر لیتیں یا خود چلی جاتیں۔ اب ان کے پاس چار کاریگر اور تین ماسٹر جی ہو گئے تھے۔ بہت سی بڑی دکانوں والے انہیں گھر کے آفس میں آکر مل لیتے تھے۔ وہیں سب حساب کتاب ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے کپڑے کے بنے پاؤچ کا کام بھابھی کے سپرد تھا۔ یہ ان کے کپڑوں میں مفت کا آئٹم تھا' جو انہوں نے شامل کیا تھا۔ اس آئٹم کے شامل کرنے سے ان کے کپڑوں کی مانگ میں اضافہ ہوا تھا۔ چھوٹی بچیوں کو ہینڈ بیگ اور پرس کا بہت شوق ہوتا ہے تو اس سے کپڑے کی فروخت میں واضح فرق آیا۔ کپڑے کے یہ پاؤچ کسی وقت میں افق اور بھابھی نے ورجنوں کے حساب سے بنائے تھے۔ یہ پاؤچ دلہنوں کے لیے بنوائے جاتے تھے۔ اس نے مسز گوہر کو بچیوں کے لیے چھوٹے سائز میں بنانے کا مشورہ دیا' جو انہیں اچھا لگا اور ان کا آئیڈیا مقبول ہو گیا۔ یہ آئیڈیا فارن آرڈرز کے ساتھ زیادہ مقبول ہوا۔ انہیں تھیم بتائی جاتی اور ایک سے پانچ بنوائے جاتے۔ ان کا یہ آئٹم ریڈی میڈ کپڑوں کے ساتھ مفت تھا۔ لیکن جب انہیں تھیم بتائی جانے لگی تو اس کا معاوضہ بھی دیا جانے لگا۔ ان کی پسند کے عین مطابق۔

"یہ کام بننے کا وقت ہے۔" مسز گوہر بہت خوش تھیں۔

"کیا مطلب؟"

"انسان پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ بگڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ لاکھ کوشش پر بھی۔۔۔ اس وقت کے اثرات ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں۔۔۔ اور ایسے ہی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ سنورتا چلا جاتا ہے۔ ہر بگڑی بات بننے لگتی ہے۔۔۔ تو یہ وقت کام بننے کا ہے۔ ہمیں اور آئیڈیاز پر کام کرنا چاہیے۔"

"مثلاً"۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"تم بھی سوچو افق! کیا ہونا چاہیے۔"

"میں تو ایک عرصے سے سیل کا سوچ رہی ہوں۔"

"سیل کا۔۔۔"

"جی۔۔۔ ہم ایک ہی قیمت پر کپڑے تیار کرتے ہیں۔ منافع رکھ کر سیل لگا لیتے ہیں۔"

وہ سوچنے لگیں۔۔۔ "اس کے لیے الگ سے تیاری کرنی ہوگی۔ جگہ بھی ڈھونڈنی ہوگی۔ فرزام سے کہتی ہوں معلومات کرے۔ اگر کسی بڑے ایونٹ میں اسٹال مل جائیں تو بہت زبردست رہے گا۔ اس سے ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔"

"جی ہاں!"

"افق! پھر تم کچھ ڈیزائن ریڈی کرو۔ کچھ پرانے پرنٹ نکالو۔ ان میں تھوڑا بہت ایڈ کرو۔ دیکھتے ہیں ان کا کیا کیا بن سکتا ہے۔"

افق بڑی ڈیزائن بک اٹھا لائی۔ اس میں ان کے تیار کردہ ڈیزائن نمونے موجود تھے۔

فرزام کو سیل کے بارے میں بتا کر وہ سب اس کے لیے تیاری کرنے لگے۔ فرزام نے ایک اسٹال

نمائش میں بک کروا لیا۔ نمائش دس روزہ تھی اور اب انہیں پہلے دن کے بعد معلوم ہونا تھا کہ انہیں کس قدر اسٹاک ریڈی رکھنا چاہیے۔ لیکن اس وقت وہ اسٹاک ریڈی کر نہیں سکتے تھے۔ اب وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اتنا کم ہو کہ انہیں منافع ہی نہ ہو اور اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ فروخت نہ ہونے کی صورت میں الٹا انہیں نقصان ہی ہو جائے۔

لیکن شاید مسز گوہر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ وقت کام بننے کا ہے' تو ان کا کام بن گیا۔ دس روز رات دن ان کے اسٹال پر رش رہا۔ ابتدائی چار دنوں میں ہی انہیں میٹریل کی قیمت وصول ہو گئی۔ اگلے دو دنوں کے منافع سے اسٹال کی بکنگ کے لیے ادا کیے گئے پیسے پورے ہو گئے اور باقی کے چار دن کا منافع ان کی جیب میں آیا۔ دس دنوں میں اسٹال کے لیے سب نے کام کیا۔ فرزام' اسلم' جمال سب سامان لائے۔ اسٹال کو ڈیکوریٹ کرتے۔ مسز گوہر بھی وہیں موجود رہتیں۔ اسلم اور فرزام نے سیلز مینی کی۔ افق گھر میں ہوتی اور ترتیب سے ہر دن کا سامان الگ کر کے پیک کرتی۔

سیل کامیاب ترین رہی۔ ساتھ انہوں نے پمفلٹ بھی بانٹ دیے۔ جس میں ان کے فون نمبرز اور ایڈریس تھا۔ ایسے کپڑوں کی خریداری کے لیے ان سے کبھی بھی رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ گاہے بگاہے عورتیں ان کے پاس خریداری کے لیے آجاتیں۔ کچھ آرڈر دے جاتیں۔ فون پر رابطے رہتے۔ انہیں مستقل کلائنٹس مل گئے۔

مسز گوہر نے کاریگروں کے بڑے کمرے میں اے سی لگوا دیا۔

یہ پہلا اے سی تھا' جو ان کے گھر لگا۔ فرزام کا خیال تھا کہ یہ کاریگروں کے کمرے میں ہی لگنا چاہیے۔ پہلے وہ سب اپنا دوپہر کا کھانا گھر سے لاتے تھے۔ اب مسز گوہر نے ایک کام والی رکھ لی تھی۔ اوپر کی صفائی وہ کرتی تھیں اور کاریگروں کے جانے کے بعد فرزام نیچے کا حصہ صاف کر دیتا تھا۔ اب کام والی نیچے کی صفائی بھی کر دیتی اور ان سب کے لیے دوپہر کا کھانا بھی پکاتی۔

سب کاریگر ماہر ہو چکے تھے۔ ایک بار بتانے سے ہی بات سمجھ جاتے۔ ان کے کام میں غلطیاں کم ہونے لگیں۔ اب ہر وقت ان کے سر پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میٹریل کے لیے بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اسلم سب سمجھ گیا تھا۔ وہ اور فرزام جاتے اور میٹریل لے آتے۔ کبھی کبھی افق اور مسز گوہر اسلم کو لے کر چلی جاتیں۔ آئے دن مارکیٹ میں نئی سے نئی چیز موجود ہوتی۔ وہ پھر وہیں طے کر لیتیں کہ کون سی نئی چیز شامل کرنی ہے اور کتنی۔ مسز گوہر کے تیار کیے گئے ملبوسات میں ایک ہی بات تھی۔ جسے خاص پسند کیا جاتا تھا۔ وہ تھی نفاست۔ وہ بچیوں کے ملبوسات کو ان کی عمر کے مطابق ہی نفیس اور نازک سا تیار کرتی تھیں اور بقول ان کے ریگولر کسٹمرز' ان کے کپڑوں میں بچیاں بہت آرام محسوس کرتی ہیں۔ کپڑے سنبھالنے میں انہیں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔

☆ ☆ ☆

"ایک بات بتائیے۔"

"جی۔۔۔" وہ ذرا پریشان سی ہو گئی۔

"ماما کو آپ کے کام میں ڈھونڈنے سے بھی خامی نظر نہیں آتی۔ کہتی ہیں بہت خبطی ہے پرفیکشن کے لیے افق۔"

"جی۔۔۔" اس جی سے اس کا مطلب تھا۔ "تو اب کیا ہو گیا؟"

"لیکن یہاں کیا ہوا؟" اس نے رجسٹر اس کے سامنے رکھا۔

رجسٹر سرخ گول گول دائروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے "لیٹر ٹو ایڈیٹر" لکھ کر دکھایا تھا۔ مسلسل تین دن سے یہ لیٹر گول گول دائرے لے رہا تھا۔

"میں نے اتنی اچھی طرح سے یاد کیا تھا۔" سر جھکا ہوا تھا۔ نظریں رجسٹر پر تھیں۔

"بی اے میں آپ انگلش کو یاد کریں گی؟"

"یہ مجھے نہیں آتی۔۔۔ تو پھر یاد ہی کر لیتی ہوں۔" اس کے انداز پر ایک جان دار قہقہہ اس کے اندر ہی دم

WWW.PAKSOCIETY.COM

توڑ گیا۔
"یہ آپ کو کب آئے گی؟"
"بھابھی کہتی ہیں سب کچھ یاد کرلو۔ بس انگلش میں پاس ہونے تک نمبر لے لو۔ پھر ان لیٹرز اور مضمونوں کو کون پوچھے گا۔"
"بھابھی نے تو کمال کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن آپ کیا صرف پاس ہونا چاہتی ہیں؟" افق کے نادر خیالات اسے اب معلوم ہو رہے تھے۔
"جی۔" سر بھی ہلا دیا۔
"صرف پاس۔۔۔؟"
"جی صرف پاس۔" کہتے وہ تھوڑا الجھ بھی گئی۔
"تو آپ بی اے میں کامیاب ہونا نہیں چاہتیں؟"
"پاس ہونا تو چاہتی ہوں۔ اور کامیابی کسے کہتے ہیں؟ صرف سوچا' پوچھا نہیں۔
"پاس ہونے میں اور کامیاب ہونے میں بہت فرق ہے۔ پاس ہونا کسی بھی طرح چند نمبرز لینا اور بس نکل جانا ہے۔ کامیاب ہونا اس پر مکمل گرفت رکھنا ہے۔ یہ گرفت کبھی دوبارہ فیل ہونے نہیں دیتی۔ چند نمبرز لے کر پاس ہونا تو بہت شرمندگی والی بات ہے۔ اگر مجھے میری کتاب ٹھیک طرح سے نہ آتی ہو اور میں فرسٹ آجاؤں تو میں اپنی ڈگری کو پھاڑ کر پھینک دوں۔ خود کو پاس کروانا اہم نہیں۔ خود کو سب کچھ سکھانا اہم ہے۔ ماسٹر جی کوئی کپڑا غلط سی دیتے ہیں تو آپ اور ماما اسے بار بار ان سے سلائی کرواتی ہیں۔ جب تک آپ کو اس میں مطلوبہ پرفیکشن نظر نہیں آجاتی۔ مطلوبہ پرفیکشن ہر انسان کو اپنے اندر رکھنی چاہیے۔ ہر کام میں آپ کی اتنی پرفیکشن اور علم میں اتنی لاپروائی۔۔۔"
"جی۔۔۔" وہ بات کو سمجھ گئی اور اب شرمندہ ہو رہی تھی۔
دراصل اب وہ صرف بی اے پاس کرنا چاہتی تھی۔ اسے ایک ڈگری چاہیے تھی۔ پہلے کبھی وہ کتابوں کو چاٹ لیا کرتی تھی۔ اب اس کی ساری دلچسپی صرف اور صرف اپنے کام کے ساتھ تھی۔ وہ کام سے نہیں تھکتی تھی۔ پندرہ منٹ بیٹھ کر پڑھنے سے تھک جاتی تھی۔ اس کے ہاتھوں پیروں کو' دل و دماغ کو کام سے عشق ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ ہی وہ واحد کام تھا جس میں وہ کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ ایک انچ کی غلطی بھی نہیں کرتی تھی۔ کر لیتی تو اسے ٹھیک کرنے میں جت جاتی تھی اور یہ قدرتی بات ہے کہ جو کام پھل دے' تعریف دے' اطمینان دے' اسے ہی کرتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اب اس کا کام صرف کام نہیں رہا تھا۔ لیکن پڑھنا اس کے لیے کام جیسا بن گیا تھا۔ ایک بوجھ' وہ ڈگری لینا چاہتی تھی۔ تاکہ برے وقت میں کام آسکے۔ اس نے اتنے برے وقت دیکھے تھے کہ وہ اب بہت سے کام اکٹھے کر لینا چاہتی تھی۔ جو اس کے برے وقت میں کام آجائیں۔ رات کو وہ تین گھنٹے آرام سے پڑھ سکتی تھی۔ لیکن وہ کپڑوں اور میٹریل کے بارے میں سوچتی رہتی۔ ذہن میں نت نئے خاکے بناتی رہتی۔ اماں کی طبیعت اور صحت کافی بہتر رہتی تھی۔ وہ گھر کو دیکھ لیتی تھیں۔ جو قرضہ تھا' وہ بھی انہوں نے ادا کر دیا تھا۔ گھر کے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔ وہ شام کو گھر آکر کتابیں لے کر ضرور بیٹھ جاتی تھی۔ لیکن پڑھ نہیں پاتی تھی۔
مسز گوہر نے فرزام سے کہا کہ وہ افق کی مدد کر دیا کرے۔ اس نے اسے کچھ اچھی گرامر کی کتابیں لا دیں۔ وہ ایک باب اسے پڑھا دیتا۔ بتا دیتا کہ اس میں اسے کیا' کیا کیسے' کیسے کرنا ہے۔ ٹاپک دے دیتا جس پر اسے مضمون لکھنا ہوتا اور وہ یاد کر کے مضمون اسے لکھ کر دکھا دیتی۔ وہ ریفرنس تک یاد کرتی تھی۔ ایک پیرا اپنے الفاظ میں نہیں لکھ سکتی تھی۔
"ہم کورس کی کتابوں کو چھوڑ کر صرف گرامر کر لیں ابھی۔۔۔؟ پاس ہونے کے لیے نہیں۔۔۔ انگلش پر گرفت کے لیے؟"
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ کیا کرتی۔ نہیں کرنا بھی چاہتی تھی تو بھی ہاں کہنا پڑا۔ اس کی گرامر شروع ہو گئی۔ ہر لائن پر کراس لگنے لگے۔
"آپ نے پریکٹس نہیں کی نا؟"

کی تھی۔۔۔ دو گھنٹے کی تھی۔"
اس نے پریکٹس ضرور کی تھی۔ لیکن دو گھنٹے میں۔ اس کے پوچھنے پر وہ ڈر گئی تھی۔ اس کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔
"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ "یو کے" کے ساتھ "آر" کا استعمال کر لیں۔ "آئی" کے ساتھ "آر" کے "وائی" کے ساتھ "پی ایم" کا۔ لیکن پیپر چیک کرنے والے پر بہت برا اثر پڑے گا اور اگر یہ استعمال آپ نے پبلک میں کیے تو سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔"
شرمندگی سے وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکی۔ اب اے میں بھی اس نے انگلش کے ساتھ یہی کیا تھا۔ یاد کر کر کے لکھتی رہی تھی۔ تھوڑی بہت گرامر کرنے کی کوششیں کی تھی۔ پھر بھابھی نے کہا۔
"کیوں اتنا ہلکان ہوتی ہو' یاد کرتی جاؤ سب۔" جو یاد کیا تھا۔ اس میں یہ نہیں معلوم تھا کہ "آئی" کے ساتھ کس کا استعمال کرتے ہیں۔ ماضی کیا ہے' ماضی بعید کسے کہتے ہیں۔ فعل حال کا استعمال کہاں کرنا ہے۔
فرزام نے اسے "یو" اور "آئی" کا سمجھا کر دو سو فقرے لکھنے کے لیے دے دیے۔ گرامر کی کتاب اس کے ہاتھ میں دی اور اگلے دن کام کر کے لانے کے لیے کہا۔ افق چھٹی کے وقت سے پندرہ منٹ پہلے آفس میں ہی اس سے پڑھ لیا کرتی تھی۔ باقاعدگی سے نہیں' کبھی کبھار۔ رات گئے تک وہ دو سو فقرے لکھتی رہی۔ اگلے دن ان میں سے صرف چالیس ہی ٹھیک نکلے۔ لیکن اس سے یہ ہوا کہ وہ "آئی ایم اور یو آر" کے استعمال کو اچھی طرح سیکھ گئی۔
سیکھنے اور محنت کرنے سے سب کچھ آجاتا ہے۔ اسے گرامر کرنے میں مزا آنے لگا۔ روز رات کو وہ دو ڈھائی سو فقرات لکھ کر ہی سوتی۔ غلطیاں ہوتی رہیں۔ ان کی درستی بھی ہوتی رہی۔ وہ ایک آدھ لائن اپنے الفاظ میں لکھنے لگی۔ نیند اسے ویسے ہی نہیں آتی تھی۔ دن بھر کے کام سے تھک جاتی تھی۔ لیکن آرام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی تعمیر کو مکمل اور مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ دوبارہ اسے سڑکوں پر بھاگنا اور کسی کونے میں بیٹھ کر رونا نہ پڑے۔

☆ ☆ ☆

"ماما! سچ بولیں گی؟"
مسز گوہر نے فریش جوس کا گھونٹ لے کر اسے دیکھا۔ "چاہو تو جھوٹ بھی بول سکتی ہوں۔"
دونوں آمنے سامنے ڈنر ٹیبل پر ایک اچھے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ فرزام انہیں اپنی بائیک پر بٹھا کر لایا تھا۔ وہ کبھی بائیک نام کی چیز پر نہیں بیٹھی تھیں۔ آگے پیچھے سے دو لوگ بھی انہیں پکڑ کر بیٹھے رہتے تو بھی انہیں یہی خوف رہتا کہ وہ گر جائیں گی۔ فرزام انہیں زبردستی بٹھا لایا۔ سائیکل چلانے والے بھی ان سے آگے نکل گئے اور مسز گوہر کا خیال تھا کہ وہ بہت تیز چلا رہا ہے۔ صرف فرزام کی خوشی کے لیے وہ بیٹھ گئی تھیں۔
"اگر میں کہیں جانا چاہوں تو آپ کیا کہیں گی؟"
مسز گوہر ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔
"تمہیں آزادی ہے جانے کی۔ جہاں چاہے جاؤ اور اپنا کیریر بناؤ۔"
"میں نے آپ سے پہلے ہی سچ کا پوچھا تھا۔ آپ کو اس سوال کا جواب ہر حال میں سچ ہی دینا ہوگا۔ آپ میرے جذبات کو ایک طرف رکھ دیں۔ میں اور آپ دو لوگ بن جاتے ہیں۔ ماں' بیٹا نہیں' اب یہ دو لوگ صرف سچ بولیں گے۔۔۔ صرف سچ۔"
انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ "میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی فرزام! پہلے تمہارے بابا گئے۔ پھر احمر چلا گیا۔ پھر احمر کو ہمیں چھوڑنا پڑا۔ میں اپنی زندگی کو کتنا بھی فعال کر لوں۔ لیکن ان دو لوگوں کے نہ ہونے سے اندر بہت سے حصے جامد ہیں۔ اگر تم اسٹڈی کے لیے کہیں جانا چاہتے ہو تو ہم پلاننگ کر سکتے ہیں۔"
"کیسی پلاننگ؟"
"کوئی بھی۔" یہ کہتے ان کی آواز دھیمی پڑ گئی۔
"میرے ساتھ چلی جائیں گی' پھر سب کچھ چھوڑ

WWW.PAKSOCIETY.COM

چھاڑ کر؟"

"تم سے زیادہ کچھ بھی قیمتی نہیں۔ میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی۔"

"میں آپ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

"تم کہاں جانا چاہ رہے تھے؟"

"امریکا اپلائی کردیا ہے۔ آن لائن کچھ ٹیسٹ بھی دیے ہیں۔ امید ہے ہاف اسکالرشپ مل جائے گا۔"

"بہت برائٹ چانس ہے۔ تمہیں مس نہیں کرنا چاہیے۔"

"آپ ایستھما کی مریض ہیں۔"

"میں خود کو سنبھال سکتی ہوں۔"

"ہر بار میں آپ کو ان ہیلر ڈھونڈ کر دیتا ہوں۔"

"اب میں یاد رکھنا شروع کردوں گی۔"

اس بات کے بعد دونوں کافی دیر تک خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

"میں افق سے شادی کرلوں؟"

مسز گوہر نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کو ٹھیک نہیں لگی میری بات؟" ان کے ایسے دیکھنے پر وہ گھبرا گیا۔ "ارے نہیں ماما! میرا کوئی چکر وکر نہیں ہے اس کے ساتھ۔"

"محبت کرتے ہو اس سے یا تمہیں بھی بہت خوب صورت لگتی ہے؟"

"محبت کیسے کروں؟ محبت سے تو بہت نفرت ہے مجھے۔ وہ آپ کے ساتھ رہے گی۔ آپ کا خیال رکھے گی۔ آپ کا بہت احترام کرتی ہے وہ۔ اچھی لڑکی ہے۔ کم از کم بھابھی کی طرح کسی تکلیف کا باعث نہیں بنے گی۔"

"استعمال کررہے ہو اسے؟" مسز گوہر کو بیٹے کی یہ بات بری لگی۔

"آپ تو مجھے غلط ہی سمجھے جارہی ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانوں میں بھی خوبیاں دیکھو۔ پھر انہیں اپنے قریب آنے دو اور یہ کہ خود کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ جڑے لوگوں کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔ ماما! میں ایک ہی لڑکی کو جانتا ہوں۔ افق کو۔ وہ ڈھائی سال سے ہمارے ہاں کام کررہی ہے۔ سارا دن یہیں رہتی ہے۔ جن لڑکیوں کو میں اکیڈمی میں استاد ہوں۔ وہ تک مجھے چٹکی بھرنے سے باز نہیں آتیں۔ آتے جاتے کہنی مار دیتی ہیں۔ کالج کی جو لڑکیاں میری دوست ہیں۔ وہ صرف دوست رہنا نہیں چاہتیں۔ رات رات بھر مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ان سب حالات کو دیکھ کر مجھے تو لگتا تھا کہ میں تو آل ٹائم ہٹ بوائے ہوں۔ بہت خاص بہت اہم ہوں۔ لیکن افق کے لیے میں میڈم کا بیٹا ہوں اور جب اسے پڑھاتا ہوں تو صرف استاد ہوں۔ تو یہ خوبی، شرافت بہت بڑی چیز ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

سر ہلا کر صرف اسے دیکھا۔ یعنی اس کی بات سے اتفاق ہے۔

"میرا خیال ہے زیادہ خوبیوں اور کم نقائص والے لوگ اچھے سے دوست بن کر اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ میرے کمرے کے ایک کونے میں روی کی دی چیزیں ترتیب سے رکھی تو آپ نے دیکھی ہی ہوں گی۔ یہ چیزیں مجھے ہر روز بتاتی ہیں کہ کوئی محبت کرنے والا نہ ملے۔ لیکن قدر کرنے والا ضرور ڈھونڈ لینا چاہیے۔ محبت کرے، نہ کرے ساتھ ضرور دے۔ ماما! میں زندگی میں بڑی تباہی سے بہت ڈرتا ہوں۔ اب میں فٹ پاتھ پر آجانے سے نہیں ڈرتا۔ اپنی زندگی میں موجود کسی شخص کے غلط نکل آنے سے ڈرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو یہی میرے لیے بڑی تباہی ہوگی۔ روی کو میں چار باتیں ضرور سنا آیا تھا۔ لیکن بہت عرصے تک اسی کے لیے چھپ چھپ کر روتا رہا ہوں۔ اس نے محبت نہیں کی۔ لیکن میں نے کی تھی۔ اگر وہ ایک بار مجھے فون کرلے تو میں بھاگا جاؤں اس کے پاس۔ میں اسے معاف کردوں گا۔ اگر محبت میں بھی معاف نہ کیا جائے تو کس جذبے میں کیا جائے؟ لیکن میں جانتا ہوں۔ اگر میں نے ہاتھ جوڑ کر اس کی منت بھی کی تو بھی وہ نہیں مانے گی۔ اسے اس نقشے سے بہت محبت ہے جو اس نے خود اپنی زندگی کے لیے بنایا ہے۔ وہ اس نقشے میں تبدیلی نہیں کرے گی۔ ایک بار میں اس تباہی کا شکار

ہوگیا۔ دوبارہ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے اپنی زندگی میں غلط لوگ نہیں چاہئیں۔ اگر یہ لالچ ہے تو ہاں! مجھے اچھے لوگ چاہیے ہیں، صرف اچھے۔"

مسز گوہر اپنے بیٹے کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھیں اور یہ جان کر انہیں بہت دکھ ہوا کہ ان کے بیٹے کے اندر ایک اور ہی سفر جاری ہے۔ وہ بہت گہرا ہوگیا ہے۔

"افق۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئیں کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ پھر توقف سے بولیں۔ "بہت مختلف لڑکی ہے فرزام! میں اس میں نقص نہیں نکال رہی۔ لیکن وہ مجھے بہت زیادہ مشین اور تھوڑی سی انسان لگتی ہے۔ کبھی تم نے اسے ہنستے دیکھا؟ میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس میں لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اس کی مدر جو اس کے کپڑے لاتی ہیں، وہ انہیں استعمال ہی نہیں کرتی۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔ اسے نئی چیزیں اچھی ہی نہیں لگتیں۔ اس کی مدر نے مجھ سے شکایت کی کہ وہ صرف ایک وقت کا کھانا کھاتی ہے۔ رات میں بمشکل دو گھنٹے سوتی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتادیا کہ نہ اسے بھوک لگتی ہے، نہ ہی نیند آتی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی، لیکن وہ خاموش رہی۔ کبھی کبھی منہ چھپا کر اپنی آنکھیں صاف کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی اداسی تو اسے پہلی بار ملنے والا ہی جانچ لیتا ہے۔ وہ ہنستی نہیں، بولتی نہیں۔ کسی خواہش، کسی خواب کا ذکر نہیں کرتی۔ بس تم اس کے آگے کام کا ڈھیر لگادو۔ وہ سر جھکائے کرتی رہے گی۔ جیسے کاموں میں خود کو چھپا رہی ہو، دفنا رہی ہو۔ مجھے وہ بہت پیاری ہے۔ لیکن فرزام! تم ایسی روبوٹ سی لڑکی سے شادی کرلوگے؟ ٹھیک ہے۔ تم محبت کا ذکر نہیں کررہے۔ تباہی کا کررہے ہو۔ ایسی خاموشیاں بھی تباہی بن جایا کرتی ہیں۔ جب میں اس کی عمر میں تھی تو میرے اس سے زیادہ مسائل تھے۔ میرا گھر اس کے گھر سے زیادہ چھوٹا تھا۔ میں اس سے زیادہ غریب تھی۔ لیکن زندگی سے میرا ناتا ٹوٹا نہیں تھا۔ زندگی سے ناتے اسی وقت ٹوٹتے ہیں، جب اندر کوئی تباہی برپا ہو۔ کوئی بھرم، کوئی خواب ٹوٹ چکا ہو۔ یہ سب اس کی مدر کی بیماری کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ حالات کے بدترین ہوجانے کی وجہ سے بھی۔ شاید ہی وہ اپنے آپ سے باہر نکل سکے۔ اگر وہ تمہاری اچھی دوست بن کر زندگی گزار سکتی ہے تو مجھے اس کی ساس بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

یہ سب باتیں جو فرزام کی ماں اسے کہہ رہی تھیں۔ ان باتوں پر اس نے غور نہیں کیا تھا اور یہ کوئی ایسی بری باتیں بھی نہیں تھیں۔ حساسیت تھی ان میں اور یہ حساسیت افق میں پائی جاتی تھی۔ ان سب پر سوچا جاسکتا تھا۔ بات کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس بنا پر اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ ایک بار تو افق سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بات کیسے کرتا، جہاں وہ کام کرتی تھی، وہاں اتنے لوگ تھے۔ باہر اس کے ساتھ وہ جائے گی نہیں۔ بلکہ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوگی کہ اس سے باہر جانے کا کہہ سکے۔ بہانے سے وہ اسے لے کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اسے یہ کہتی اچھی نہیں لگتی تھیں کہ "افق! جاؤ، ذرا فرزام کے ساتھ چائے پی آؤ" یا "وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

اسی عالم میں چند دن گزر گئے۔ اتفاق سے اتوار کو شام کے وقت ایک فٹ پاتھ پر اسے وہ کھڑی نظر آگئی۔ وہ جھک کر کچھ میگزینز دیکھ رہی تھی۔ اتوار کو اکثر فرزام پرانی انارکلی جاکر پرانی کتابوں کی چھانٹی بہت دل لگا کر کرتا تھا اور بہت اعلا درجے کی کتابیں چھانٹ کر لے آتا تھا۔ وہ کافی دیر سے ایک ایک اسٹال پر کتابوں کی ورق گردانی کررہا تھا۔ ذرا دور اسے وہ بھی نظر آگئی۔ وہ جلدی جلدی سب ہی میگزینز دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے خاص چیز کی تلاش ہو۔ وہ اس کے قریب گیا اور سلام کیا۔

"کچھ خاص ڈھونڈ رہی ہیں؟" اس کے ہاتھ میں فیشن میگزینز تھے۔ افق نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"میں مدد کروں؟"

"مجھے مل گیا ہے میگزین۔" وہ جو میگزین دیکھ رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔اسی کی طرف اشارہ کیا اور کتب فروش کی طرف بڑھادیا۔اس نے شاپر میں ڈال دیا۔
فرزام نے پیسے دے دیے۔
"آپ نے کیوں دیے؟" وہ اس سے زیادہ الفاظ میں احتجاج کرنا چاہتی تھی۔اس کی شکل بتا رہی تھی' لیکن اتنا ہی کہا۔
"آپ ماما کے ہی کام کے لیے لے رہی ہیں نا۔۔۔تو ماما کے بیٹے نے ادائی کردی۔"
وہ خاموش رہی۔احتجاج ابھی تک آنکھوں میں رقم تھا۔خدا حافظ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔
"ذرا میری بات سنیے پلیز۔" جتنی تیزی سے وہ آگے نکلی۔اتنی ہی تیزی سے وہ پیچھے آیا۔وہ رک کر دیکھنے لگی' پوچھا نہیں کہ کیا بات ہے۔
"یہ اس طرف۔۔۔" اس نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا۔"ریگل کے پاس ایک بہت اچھائی کارنر ہے۔آپ چلیں گی میرے ساتھ وہاں؟" اتنا کہہ کر وہ ڈر بھی رہا تھا کہ وہ میڈم کے بیٹے کے یہ پوچھنے پر اسے لفنگا سمجھ کر تھپڑ ہی نہ مار دے۔
وہ ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئی۔غصہ بھی جھلکنے لگا آنکھوں سے۔
"نہیں؟ خود ہی کہہ دیا۔" چلیے! وہاں نہیں تو یہ چند قدم پر سڑک پار کر کے بہت سے لوگوں کی پسندیدہ جگہ عجائب گھر ہے۔میں ابھی آتے آتے دیکھ رہا تھا کہ اس کا باغ بہت اچھا ہے۔صاف ستھرا' ہرا بھرا۔۔۔"
اس کے ردعمل کا سوچ کر وہ گھبرا رہا تھا۔چادر کا کونا دائیں کان سے دانتوں میں لیے' میگزین کو اسٹڈی فائل کی طرح ہاتھ میں۔۔۔ پکڑے وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں سے جیسے شرارے نکل رہے تھے۔ان شراروں میں اسے دکھ بھی نظر آیا۔ جیسے اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ بھی دوسروں کی طرح اس کے ساتھ یہی کرے گا۔لمحوں میں ہی ماحول بدل گیا تھا۔وہ اسے بہت نفرت سے گھور رہی تھی اور ایسے کھڑی تھی۔جیسے اور انتظار میں ہو کہ دکھاؤ اپنی اوقات۔کہاں تک جاتے ہو تم؟ نکلے نا تم بھی وہی؟
"میرا یہ مطلب نہیں ہے' جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" اس کے تاثرات پڑھ کر اس نے بے چارگی سے کہا۔"میں آپ کا اسٹاد بھی ہوں۔آپ کو پڑھایا ہے میں نے۔" اس کا یہ کہنے سے مقصد احسان جتانا نہیں تھا۔اس سے اس کا مطلب اپنی شرافت بتانا تھا۔
"تو اب آپ معاوضہ لینے آئے ہیں؟" اس کے انداز نے بتادیا کہ وہ کتنے غصے میں ہے۔لمحوں میں ہی سالوں کا تاثر بدل چکا تھا۔اس کی شرافت پر شک کیا جارہا تھا۔بات بگڑ چکی تھی۔ہو سکتا ہے' وہ غصے میں نکل آئے ہی نا۔۔۔اور یہ بھی کہ وہ اس کی کوئی وضاحت نہ سنے۔انکار ہی سہی' وہ کردے۔لیکن وہ اسے بدمعاش' لفنگا نہ سمجھے۔فرزام کے مسام بھیگ گئے۔چند ہی لمحوں میں وہ کیا سے کیا بن گیا اس کے لیے۔
اسے گھور کر وہ پلٹی اور دو قدم اپنے راستے کی سمت اور اس سے مخالف سمت میں بڑھی۔اس نے صرف تھپڑ ہی نہیں مارا تھا میڈم کے بیٹے کو باقی نظروں سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
دو سے چار اور چار سے آٹھ قدم چلتے اس کا وجود گواہی دے رہا تھا کہ بیچ راہ میں اس کی بے عزتی کی گئی ہے۔پھر سے اسے صرف لڑکی سمجھا گیا ہے۔پھر سے اس کی خوب صورتی پر نظریں ٹکی ہیں اور مردوں کا کام ہی کیا ہے۔موقع ملتے ہی موقعے کا فائدہ اٹھانا۔
فرزام کی نظریں' جو دور جاتی افق پر ٹکی تھیں۔وہ صاف صاف دیکھ رہی تھیں کہ وہ دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھیں گی۔اس نے اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کیا۔جو افق کو سمجھنا تھا وہ سمجھ لیا۔لیکن اس نے اسے پورا سنا نہیں۔بھیڑ میں تیزی سے جگہ بناتی وہ جارہی تھی۔فرزام کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ایسے ہو جائے گا۔لیکن اگر اب یہ ایسے ہی تھا تو وہ ایسے ہی نہیں چھوڑے گا۔وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔آواز دے کر اسے روک نہیں سکتا تھا۔جگہ بناتا تیزی سے اس کے پیچھے جانے لگا اور تقریباً" بھاگتے ہوئے ایک سائیکل والے کی ٹکر سے بچتے ہوئے وہ اس کے پیچھے سے بیچ

اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔
"میں تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں افق!" اس نے فوراً" کہہ دیا۔بے حد سنجیدگی سے کہا۔اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔مطلب تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔میں فلرٹ نہیں کر رہا۔تمہارا استعمال نہیں کر رہا۔وقت گزاری نہیں چاہیے۔ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔اس نظر والا بھی نہیں ہوں۔مجھے ویسا تو نہ سمجھو۔
قریب سے ایک موٹر سائیکل پوں پوں کرتی گزری۔پرانی انارکلی کی اتوار بازار کی بھیڑ بھاڑ میں۔۔۔ اسٹالوں پر "باجی' آپا' خالہ" کی آوازوں میں۔۔۔ ٹریفک کے شور میں۔۔۔ ہجوم کی بھنبھناہٹ میں افق کو یہ آواز بہت بری لگی۔"شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
افق نے اس کی طرف ایسے دیکھا۔جیسے دراصل وہ اسے بتا رہا ہو کہ "تمہارے پیروں کے نیچے کی زمین پھٹ رہی ہے۔دیکھو' دیکھو! تم نیچے دھنستی جارہی ہو۔ یہ زمین تمہیں نگل لے گی۔"
"ماما نے کہا کہ میں پہلے تم سے بات کرلوں۔"
اس نے لفظ "ماما" کو سہارا لیا۔تاکہ وہ یقین کرلے کہ اس سب کا ماں کو بھی معلوم ہے اور وہ اسے الو نہیں بنا رہا۔
"میں تو صرف بات کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد غلط نہیں تھا۔"
وہ جلدی جلدی بتانے لگا کہ مبادا وہ پھر بھاگ ہی نہ جائے۔ایک آدمی فرزام سے ٹکرایا اور فرزام ذرا سا لڑھک کر سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔لیکن افق نامی بت ویسے ہی کھڑا رہا۔جیسے کچھ سن نہیں رہی اور اس کے سامنے کوئی اپنے بولنے کا شوق پورا کر رہا ہے۔جیسے وہ دکان کے باہر زنانہ ریڈی میڈ کپڑے پہنے پلاسٹک کی عورت کھڑی ہے۔جس کا تعلق بازار سے تو ہے' لیکن زندگی سے نہیں۔
"افق۔۔۔!" فرزام کو اسے آواز دینی پڑی۔وہ دونوں کے سامنے رش میں اور کتنی دیر کھڑے رہ سکتے تھے۔ وہ چونکی۔۔۔اور فرزام کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے ذیلی سڑک کی طرف مڑ گئی۔نیلے گنبد کی طرف جانے والی سڑک پر واقعی اس کے پیروں تلے کی زمین پھٹ رہی تھی اور وہ دھنستی ہی جارہی تھی۔آخر وہ دھنس کیوں رہی ہے؟ پاتال میں کیوں جارہی ہے؟ اسے کون نیچے ہی نیچے کھینچ رہا ہے؟ امان سے تو وہ نفرت کرتی تھی ۔۔۔ہے نا؟ پھر فرزام جیسے لڑکے کے منہ سے شادی کا سن کر وہ پاتال کی طرف کیوں جارہی ہے؟
چال میں تیزی آگئی۔نیلے گنبد کی طرف تھوڑا اور فاصلہ طے ہوا۔ذرا اور آگے۔ایک اور سڑک تک۔
امان نامی دلدل نے ایک بار نگل تو لیا تھا اسے۔۔۔ اس کے ہاتھوں اپنی عزت تار تار کروا تو چکی تھی۔اب وہ کیوں اسی شخص کے نام پر اندر دھنستی جارہی ہے؟ شادی کے نام پر اسے کیا یاد آگیا ہے؟ اب وہ کیا کچھ اور برباد کرے گا۔۔۔ وہ پسینے میں بھیگ گئی اسے لگا۔امان کا باپ اس کے پیچھے آرہا ہے۔۔۔ آگے بھی وہی ہے دائیں بائیں بھی وہی ہے۔۔۔اس نے اپنے اندر کی چیخ کو بمشکل روکا۔
اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے امان نام کی دھڑکن کو اپنے دل کے اندر نئے سرے سے دھڑکتے سنا اور وہ ڈر گئی۔اگر پھر اس دل نے اسی کے نام پر دھڑکنا شروع کردیا تو۔۔۔ تو امان پھر سے جیت جائے گا۔۔۔ وہ اسے دھوکا دینے اس کے اندر پھر سے آگیا تھا۔اس بار وہ یہ دھوکا نہیں کھائے گی۔۔۔ اپنے گھر کی گلی کے سرے پر وہ رک گئی۔
واپس پلٹی تو دس قدم کے فاصلے پر فرزام کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔وہ گڑبڑا گیا۔۔۔ جس حالت میں وہ تیزی سے اس کے پاس سے نکلی تھی اس کا سوچ کر فرزام اس کے پیچھے گھر تک آرہا تھا۔
وہ چلتی اس کے قریب آئی اور آگے ہو کر چلنے لگی۔ وہ پیچھے آنے لگا۔سڑک پار کر کے وہ عجائب گھر کے ہرے بھرے باغ میں آکر کھڑی ہو گئی۔دوبارہ اس نے فرزام کی طرف نہیں دیکھا۔دراصل وہ کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔جو سُر تال اس کے اندر سالوں پہلے شادی کے نام پر بجے تھے۔۔۔ اب وہی سُر تال ماتم

WWW.PAKSOCIETY.COM

کررہے تھے۔ افق اس ماتم کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ اس شخص کے لیے یہ ماتم اور کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اگر وہ یہ ماتم کرے گی تو وہ نئے سرے سے اس پر جان دینے لگے گی۔

☆ ☆ ☆

امان عدن نامی لڑکے کے بارے میں افق، فرزام کو بتانے لگی۔ اس کے باپ کا اس کی عزت پر حملے کو چھوڑ کر اس نے ان سے ملاقات کے متعلق بھی بتا دیا۔

جب اس نے بات ختم کرلی تو اس نے خاموشی سادھ لی کہ کیا اب بھی یہ فرزام نامی لڑکا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بہت دیر تک فرزام بھی خاموش رہا۔

"ماما نے ٹھیک کہا تھا کہ افق کے اندر بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔"

اس نے اتنا کہا اور خاموش ہوگیا۔ افق کو جیسے جواب مل گیا کہ وہ اسے انکار کررہا ہے۔ جس طرح اسے اس کے پروپوز کرنے پر خوشی نہیں تھی۔ ایسے ہی انکار پر بھی دکھ نہیں تھا۔ اسے عدن کا خوف تھا کہ وہ پھر نہ اس کے اندر آن بسے۔ اس کا خیال پھر نہ اسے آلے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اتنی بڑی بات سن کر وہ اس سے شادی کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک ہی دے گا۔

"تم جیسی لڑکی کو کوئی بھی آسانی سے بے وقوف بنا سکتا ہے۔"

اس کی اگلی بات سن کر وہ زمین میں گڑ گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے اسے یہ سب بتا کر۔ اس کے بعد وہ دوسرا شخص ہے جسے اس نے اس بارے میں معلوم ہونے دیا۔ یہ بات اس نے اپنے اندر راز کی طرح نہیں ایک گناہ کی طرح چھپا کر رکھی تھی۔ اس نے اپنے گناہ کا خود ہی پردہ چاک کردیا۔ اب یہ اس کا مذاق اڑائے گا۔ وہ جو اسے سمجھ رہا تھا۔ اس کے الٹ سمجھے گا۔ وہ اٹھنے لگی۔

"جو چھوڑ جاتے ہیں، وہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔"

اٹھنے کے لیے پر تولتی افق نے اس کی طرف دیکھا۔

"اس نقصان پر انہیں افسردہ ہونا چاہیے ہمیں نہیں افق۔" وہ مسکرایا۔ افق بیٹھ گئی۔

فرزام نے اسے رومی کے بارے میں بتا دیا۔ دو لوگوں نے وہاں بیٹھے بیٹھے خود کو بیان کردیا۔ افق کو اب زندگی میں کسی مرد کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے تو خود کو امان سے بچانا تھا، وہ اس جیسے شخص کے لیے جوگ لینا نہیں چاہتی تھی۔

فرزام اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو شامل کرنے سے ڈرتا تھا جو آئیں اور پھر اسے چھوڑ جائیں اور وہ ٹوٹ جائے۔ وہ دونوں فی الحال اپنے اپنے اندرونی ادوار کے خاتمے کے لیے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ان دونوں میں "محبت" نامی احساس کہیں بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

مسز گوہر افق کے گھر جاکر اس کا ہاتھ مانگ آئیں۔ جسے فوراً قبول کرلیا گیا۔ جمال اور اسد کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ انہیں اتنا پیارا "بھائی جان" مل رہا تھا۔ طے یہ پایا کہ فرزام کے جانے سے پہلے نکاح کردیا جائے گا۔

فرزام کے کاغذات میں تھوڑی سی ہی کمی بیشی رہ گئی تھی۔ جن کے لیے وہ بھاگ دوڑ کررہا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے جو اس کا ویزا منسوخ کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہرحال اب تو وہ ہر طرح کی اور ہر مقام پر اچانک سے مل جانے والی مشکلات کا عادی ہوچکا تھا۔

کبھی کبھار ہی مسز گوہر کی احمر سے بات ہوجاتی تھی۔ انہوں نے اسے فرزام کے نکاح میں شرکت کی دعوت دی۔ اتنے پیسے لگا کر وہ صرف نکاح میں شرکت نہیں کرسکتا تھا اور پھر اسے ڈر تھا کہ پیسوں کا تقاضا پھر سے نہ کرلیا جائے۔ اس نے بہانے سے انکار کردیا۔

مسز گوہر نے کبھی اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کا کاروبار کتنا اچھا چلنے لگا ہے اور اس کاروبار کے لیے

دونوں ماں بیٹے اور ان کی ہونے والی بہو نے کتنی محنت کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کا بیٹا ان کے برے وقت میں حصے دار نہیں بنا تھا تو اچھے میں بننا بھی پسند نہیں کرے گا۔

احمر اپنی ماما سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ وہاں کیسے اور کہاں رہ رہی ہیں۔ پوچھنے کا مطلب تھا، پھر امداد بھی کرنا اور ابھی ابھی انہوں نے بلڈنگ کا گھر چھوڑ کر ایک ڈبل اسٹوری گھر لیا تھا۔ اب وہ لیڈز میں کسی کو جواب دہ بھی نہیں تھا کہ تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے اتنا بڑا گھر لینے کے لیے اور نئے ماڈل کی کار تم نے کیسے لے لی؟ نئے سال کی چھٹیوں میں تم یورپ کیسے گھوم آئے؟ اب وہ وہاں کھل کر پر آسائش زندگی گزار رہا تھا۔

اس کا انگریز نما بھائی سیکنڈ ہینڈ بائیک چلاتا رہا تھا۔ ماں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کھڑی ہوکر کٹنگ کرتی رہی تھی۔ لیکن جو بھی تھا۔ وہ مسز گوہر اور فرزام کے لیے بہت اچھا تھا۔ وہ ایک پر آسائش زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ لیکن وہ کمینے اور غاصب نہیں بنے تھے۔ تو ایسی آسائشوں سے محنت اور خواری بھلی۔ چیزوں کی تعداد میں کمی ہوجانی چاہیے۔ خوبیوں کی نہیں۔ نیکی کی توفیق ملے نہ ملے۔ گناہ سے دوری کی ضرور ملنی چاہیے۔

مسز گوہر کو اتنا شوق ضرور تھا کہ احمر اپنے بھائی کی شادی میں آجائے۔ کم سے کم کوئی ایک تو دوسرے کی شادی میں شرکت کرے۔ لیکن تانیہ کے ہوتے، وہ نہیں آئے گا۔

جمعے کے دن دوپہر کے وقت بند گلی کے ہرے رنگ کے دروازے کے گھر میں فرزام اپنی چھوٹی سی بارات لے کر اترا۔ اس نے ڈیزائنر سفید شلوار سوٹ پہنا تھا۔ ہلکے سرخ دوپٹے کو جو دولہا کے لیے ہوتے ہیں گلے میں ایک بل دے کر ایک سرا پیچھے اور ایک آگے رکھا تھا۔ اتنی سی ہی تیاری میں وہ شہزادہ لگ رہا تھا، جو کشمیر کی کلی کو لینے کے لیے آیا تھا۔ باراتیوں میں سب ہی کاریگر اور استقبال کرنے والوں میں افق کے چچا،

پیارے بچوں کے لئے

پیاری پیاری کہانیاں

بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت -/300 روپے
ڈاک خرچ -/50 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماموں، بھابھی اور چند اور لوگ شامل تھے۔ جہیز کے نام پر دعائیں تھیں اور بری کے نام پر فرزام سامرد۔

افق رخصت ہو کر فرزام کے گھر آگئی۔ فرزام نے ماں کو افق کے بارے میں اس کی بتائی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اب بس ان دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے کہ وہ کیسے ایک دوسرے کو ماضی کی تکلیفوں سے نکالتے ہیں۔

افق نے مسز گوہر کا لایا سرخ رنگ کا شرارہ پہنا تھا اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی ایک طرف اور اس کا دھواں دھواں ہوتا روپ ایک طرف۔ خود کو نارمل رکھنے کے باوجود وہ وحشت زدہ سی نظر آرہی تھی۔ جیسے ابھی سب چھوڑ چھاڑ بھاگ جائے گی۔

مسز گوہر دونوں کی تصویریں بنا رہی تھیں۔ فرزام کی دلہن کے لیے انہوں نے تھوڑے سے زیورات بنا لیے تھے۔ وہ انہوں نے پہلے ہی افق کو دے دیے تھے۔ افق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ کافی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں۔

نکاح دوپہر کے وقت ہوا تھا اور شام تک افق گھر آگئی۔ رات کو ان تین لوگوں نے فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کیا۔ ماں کو گھر ڈراپ کر کے وہ ایسے ہی تھوڑی سی ڈرائیو کے لیے کار ادھر ادھر گھماتا رہا۔ اب ایسا تھا کہ انسان بہت سے فیصلے بہت مضبوطی سے کر تو لیتا ہے۔ لیکن جب ان فیصلوں کے راستوں پر سے گزارتا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔

فرزام ایک اچھا اور انصاف پسند لڑکا تھا، لیکن اس کے کانوں میں ماضی میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر قطار در قطار درختوں کے سایوں میں چہل قدمی کرتے اور کسی جھیل کے کنارے بیٹھے بنے گئے خواب آبشار کے جھرنے کی طرح رواں تھے۔

وہ ذہن کو جھٹک رہا تھا۔ پھر بھی کانوں میں سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک خفیف سی کپکپاہٹ اس کے اندر تھی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ کسی کو دھکا دے کر گھر سے باہر نکال کر دروزہ مقفل کر دینے سے کوئی زندگی سے نہیں چلا جاتا۔ دل جو دھکے لگاتا ہے۔ دل والوں کو نکالنے کے لیے وقت آنے پر ان دھکوں کا بھانڈا پھوٹ ہی جاتا ہے۔

اس نے افق کو دیکھا دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے وہ تازہ تازہ پینٹ سے بنائی گئی دیوی لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسی دیوی جیسا لگ رہا تھا، جسے حنوط کر کے تابوت میں بند کر دیا گیا ہو، تازہ تازہ وجود پر صدیوں پرانا چہرہ۔ چند گھنٹوں کی دلہن کا صدیوں سے ناتا۔

"آئس کریم کھاؤ گی؟"

"جی! کھالوں گی۔" آواز اتنی دھیمی تھی کہ بمشکل فرزام نے سنا۔

"میرا خیال تھا کہ تم کہو گی۔ میرا کھانے سے ہی پیٹ بھر گیا۔" وہ ہنسا تاکہ وہ بھی ہنسے۔

"پھر میں نہیں کھاتی۔" وہ ہنسی نہیں۔ سنجیدہ ہی رہی۔ وہ اس کے مذاق کو سمجھی ہی نہیں۔

"جب تک تم میں حس مزاح آئے گی۔ میری حس مزاح مر چکی ہو گی۔ میں تو تمہیں ایک دو لطیفے سنانے جا رہا تھا۔ لیکن مجھے تو تمہیں لطیفے سمجھانے بھی پڑیں گے۔"

وہ چپ رہی۔ ہولے سے کبھی کبھی گود میں رکھے ہاتھوں کو جنبش دے دیتی۔ ایسے سمٹ کر بیٹھی تھی جیسے بہت خوف زدہ ہو۔ بہت برے وقت پر اسے یاد آرہا تھا وہ۔ دوسری بار کسی کے ساتھ کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پہلی بار کا بیٹھنا یاد آرہا تھا۔

دونوں میں خاموشی رہی۔ بنا کہے دونوں ہی سمجھ گئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رشتے کو سمجھنے اس رشتے کو نبھانے، دوست بن کر ہی سہی، ساتھ ساتھ، خوشی خوشی زندگی گزارنے میں انہیں وقت لگے گا۔

☼ ☼ ☼

فرزام کے پاس چند ہفتے ہی تھے۔ اس کا ویزا آچکا تھا۔ وہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ افق نے اچھے نمبروں سے بی اے پاس کر لیا تھا۔ اسے ساتھ لے جا کر اس

نے اس کا پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ایڈمیشن کروا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ریگولر اسٹڈی کرے۔ افق کا کہنا تھا کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح یونیورسٹی جا کر اس کا بہت وقت صرف ہو گا۔ لیکن فرزام کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کام سے نکل کر اپنے لیے بھی کچھ کرے۔

کلاسز شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ فرزام کے جانے سے پہلے ایک اور پیش رفت ہوئی۔ جس نے ان کی زندگی میں تھوڑی اور تبدیلی کر دی۔ افق کی اماں کا گھر ایک بند گلی میں تھا۔ اس گلی کے دونوں گھر ایک پارٹی مارکیٹ بنانے کے لیے خریدنا چاہتی تھی۔ اس گلی کے سرے پر سڑک تھی اور اس سڑک پر بہت سی دکانیں تھیں۔ جو پارٹی وہ جگہ لینی چاہتی تھی اسے راتوں رات ہی جگہ چاہیے تھی۔ اسی لیے انہیں اچھی خاصی قیمت کی پیش کش کی جا رہی تھی۔ رقم اتنی اچھی تھی کہ انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ افق کا خاندان فی الحال مسز گوہر کے گھر میں رہے گا۔ آئندہ کے لیے کچھ بھی پلان کیا جا سکتا تھا۔

دونوں گھر بک گئے۔ بھابھی مرکزی شہر سے دور چار مرلے کے گھر میں چلی گئیں۔ افق کا گھرانہ مسز گوہر کے گھر میں آگیا۔ جس ہال نما کمرے میں سامان پیک کر کے رکھا جاتا تھا۔ وہاں لکڑی سے پارٹیشن کروا لیا گیا۔ ان کے پچھلے گھر سے بڑا اور کھلا کمرا بن گیا۔ فرزام نے ایک بیڈ لا کر وہاں سیٹ کر دیا۔ آرڈر لینے اور سپلائی کرنے کی ذمہ داری جمال نے سنبھال لی۔ فرزام کی موٹر بائیک اسے دے دی گئی۔

گھر بکنے سے جو رقم وصول ہوئی تھی اسے افق نے مسز گوہر کے حوالے کیا۔ وہ اسے بزنس میں لگانا چاہتی تھی۔ دونوں پارٹنرز کی طرز پر برابر آگئے۔ اب وہ ایک خاندان بن گئے تھے۔ انہیں مل کر محنت کرنی تھی۔ وسائل کا حل مل کر نکالنا تھا۔ وسائل اور کامیابی کے لیے مل کر جدوجہد کرنی تھی۔ وہ سب جدا جدا تھے۔ لیکن ان میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ لفظ "محنت" کو سیکھ چکے تھے۔ کامیابی کے راستے خدا کے ہاتھ میں۔ لیکن ان سب نے اپنی اپنی سیڑھیاں بنالی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات گئے وہ اس کی پیکنگ کر رہی تھی۔ اس گھر کی ایک ہی رونق تھی، فرزام۔ اور وہ جا رہا تھا۔ جانے سے پہلے وہ سب کو کرائے کی کار میں خوب گھماتا رہا۔ جمال اور اسد نے زندگی میں تفریح نام کی چیز نہیں دیکھی تھی۔ اب وہ ہر وقت فرزام کے ساتھ چپکے رہتے۔

جمال تو اب گھر ہی میں ہوتا تھا۔ رات کو ہی پریس جاتا تھا، لیکن اسد اسکول سے آنے کے بعد فرزام کے ساتھ ساتھ رہتا۔ جتنی بار بھی وہ خریداری کرنے کے لیے گیا، اسد اس کے ساتھ ہی رہا۔ اکثر تینوں مال پر چہل قدمی کرتے۔ بھنے ہوئے چنے کھاتے۔ آئس کریم، گولے گولے گپے۔۔۔ اور نہیں تو، فرزام ان کے ساتھ شرط باندھ کر دوڑ لگانے لگتا۔

اس کا معمول تھا، مسز گوہر کے ساتھ چھٹی والے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
مرگ سوہنا

آمنہ ریاض
قیمت -/250 روپے
ملنے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

دن باغ جناح جانا، چہل قدمی کرنا، کبھی کبھی بیڈ منٹن کھیل لیتے اب وہ سب ساتھ جانے لگے تھے۔ اسد اور جمال اس کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ اماں سب کو ایسے ہنستے کھیلتے دیکھ دیکھ نہالی ہوتی جارہی تھیں۔ صحت اچھی ہوہی گئی تھی۔ لیکن اس اطمینان و سکون نے اور اچھی کردی تھی۔

بیڈ منٹن کھیلتے وہ ریکٹ افق کے ہاتھ میں بھی دیتا تو وہ سر نفی میں ہلادیتی۔ وہ پکڑا کر دور سامنے جاکر کھڑا ہوجاتا۔ جب وہ ہر شٹل کو مس کردیتی تو ایسے شرمندہ ہوتی جیسے بہت بڑا گناہ کرلیا ہے اور باغ جناح کے سب ہی لوگ اس کے گرد اکٹھے ہوکر "شیم، شیم" کہہ رہے ہیں۔

"افق! آخر ریکٹ کو ایسے۔۔۔ ایسے پکڑنے میں تمہارا کیا جاتا ہے۔" وہ قریب آکر پھر سے بتاتا کہ ریکٹ کو کیسے پکڑنا ہے۔ اس کے دور جاتے ہی وہ پھر سے بھول جاتی۔

"اس شٹل سے تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟ یہ دیکھو! اس میں کوئی بم فٹ نہیں ہے۔"

وہ ریکٹ اسد یا جمال کو پکڑادیتی۔ فرزام دور سے چلاتا۔ "واپس کرو اسد اسے۔" وہ واپس اس کے ہاتھ میں پکڑادیتے۔

"کھیلتی کیوں نہیں ہو افق باجی۔۔۔ ایسے کھیلو۔۔۔ ایسے۔" اسد بھی اس کے پاس آکر بتاتا۔

فرزام نے اس کی طرف ہٹ کی اور وہی پہلی ہٹ اس نے ریورس کی تو وہ ریکٹ چھوڑ چھاڑ، دل پر ہاتھ رکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ اسد اور جمال نے تالیاں بجائیں۔ وہ چلتا ہوا قریب آیا۔

"اسد! میں جارہا ہوں۔ لیکن تم یاد سے یہاں آکر یادگاری پودا لگا جانا۔ ٹھیک یہاں۔۔۔" جہاں افق کھڑی تھی، وہاں کھڑے ہوکر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے فرزام بھائی! اور کچھ۔۔۔؟"

"میرا خیال ہے، اتنا ہی کافی ہے۔" ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ریکٹ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی کہ جاؤں یا یہیں رہوں۔

پھر وہ اس کے ساتھ لمبی لمبی سڑکوں پر چہل قدمی کرتا۔ ہلکی پھلکی باتیں کرتا۔ ایک بار اسے خریداری کے لیے لے گیا۔ اسے اپنی پسند کے لیے کھدی اور سوتی کے کرتے اور جینز کے کپڑے نما تنگ پاجامے لے کردیے۔ پمپ شوز لے کردیے۔ بڑے بڑے کلاسیک ہلکے رنگوں کے ہینڈ بیگز لے کردیے۔

"تمہاری یونیورسٹی وارڈ روب تیار ہے۔" اس کا کہنا تھا کہ کپڑے کم ہی ہوں۔ لیکن صاف ستھرے ہوں۔ وہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ نفیس ہو اچھے رنگ اور اچھے کپڑے میں ہو۔

اسے اپنے یونیورسٹی بیگ میں کیا کیا رکھنا ہے۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا۔

"کسی سے ڈرنا نہیں اور سب سے ہائے ہیلو رکھنی ہے۔" اس نے سمجھایا کہ "لوگوں کے ڈر کو اپنے اندر سے نکال دو۔۔۔ ان سے فاصلے پر رہو۔ لیکن انہیں جانچتی رہو۔ جب ہم زیادہ لوگوں کو جانچ لیتے ہیں تو کم بے وقوف بنتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے لگتے ہیں، بہادر بننے لگتے ہیں۔"

اس کی پیکنگ مکمل ہوگئی۔ اسے صبح کی فلائٹ سے جانا تھا۔ سب لوگ کھلی چھت پر موجود باتیں کررہے تھے۔ اسد نے ابھی سے رونا شروع کردیا تھا اور فرزام اسے بہلا رہا تھا۔ جب وہ کمرے میں آیا تو وہ اس کے کپڑے استری کررہی تھی۔ وہ بیگ کی زپ کھول کر سرسری نظر سامان پر ڈالنے لگا۔

"افق۔۔۔!" آواز دی۔ اس نے سوئچ بند کردیا کہ کوئی کام ہوگا۔

"ارے نہیں۔ تم کام کرتی رہو۔۔۔ میں یہاں کرسی پر بیٹھا بات کررہا ہوں۔"

اس نے سوئچ آن کردیا اور پھر سے استری کرنے لگی۔

"مجھے چند سال تو لگ ہی جائیں گے امریکا میں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور خاموش ہی رہا۔ اگلی بات

کے انتظار میں افق نے ہی مڑکر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسے دیکھتے پاکر وہ جھٹ سیدھی ہوگئی۔

"تم مجھے یاد کروگی۔۔۔؟ ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔۔ روز فون کیا کروں گا۔۔۔ ایسے میں یاد کیا کرنا؟" وہ سوال پوچھ کر خود ہی ڈر گیا کہ اگر اس نے "نہ" کہہ دیا یا کوئی بھی جواب نہ دیا تو۔۔۔ تو اس نے جواب کی گنجائش ہی ختم کردی۔

افق نے اثبات میں سرہلادیا۔

"ایک اور بات پوچھ لوں۔۔۔؟" انداز بچکانہ تھا۔ لیکن دراصل اسے بچکانہ بنایا گیا تھا۔

"جی! میں سن رہی ہوں۔" یہ نہیں کہا۔ ضرور ضرور۔۔۔ اس سوال پر وہ خود بھک سے اڑ گئی کہ نجانے کیا پوچھ لے۔

اس نے دیکھا کہ وہ استری شدہ شرٹ کے کالر کو پھر سے استری کررہی ہے، بار بار اسے استری کررہی ہے۔ سوال پوچھنے کی نوبت ہی ختم ہوگئی۔ جب اس نے افق کو وقت دے ہی دیا تھا اور بنا کہے اس سے مانگ بھی لیا تھا۔ پھر اسے ایسے اس سے دل لگی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

افق نے اسے جاتے دیکھا اور چاہا کہ اسے روک کر پوچھے کہ کیا پوچھنا تھا۔ لیکن وہ ایسا کر نہیں سکی۔ ابھی اس میں اتنی ہمت نہیں آئی تھی اور ابھی وہ اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی وہ ہر سوال پوچھے جانے سے ڈرتی تھی۔ ہر جواب کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابھی تو وہ صرف فرزام کا احترام کرتی تھی۔۔۔ صرف احترام۔۔۔ باقی سب جذبوں کے لیے نجانے کتنا وقت درکار تھا۔

ہفتہ کی رات ان سب نے اسے خدا حافظ کہا۔۔۔ نرالی کو گھسیٹتے اس نے ایک اور بار مڑکر خاص طور پر افق کو دیکھا۔ وہ جلد ہی اسے بھی بوسٹن بلالے گا۔

☆ ☆ ☆

افق کے پیسوں اور کچھ اپنی بچت کو مسز گوہر نے استعمال کیا اور قذافی اسٹیڈیم میں ایک دکان کرائے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ برطانیہ جانے سے پہلے ان کا خواب رہا تھا یہاں ایک دکان حاصل کرنا۔ لیکن اس وقت یکے بعد دیگرے ان کے حالات بدلتے ہی چلے گئے اور وہ خواب پورا نہیں ہوسکا۔ اب دکان انہیں حاصل ہوگئی تھی۔ کچھ تزئین و آرائش کروا کر انہوں نے اس کا افتتاح کردیا۔ افتتاح کچھ ایسے تھا کہ پانچ سو اور ہزار میں سیل لگادی گئی تھی اور تین کی خریداری پر ایک جوڑا مفت تھا۔ یہ پیش کش اگلے پندرہ دنوں تک کے لیے تھی۔ اس افتتاح کے لیے انہوں نے نئے کپڑے بنائے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اسٹاک میں رکھے اچھی حالت کے پرانے کپڑے بھی ڈسپلے کردیے تھے۔ اسد اور جمال دکان کے سیلز مین بن گئے۔ بیس دن کے اندر اندر سارا اسٹاک ختم ہوگیا۔

مسز گوہر کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اب انہیں من چاہا منافع ہورہا تھا۔ چند بڑے اسٹورز کے آرڈرز کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے برانڈ "چنر" کے لیے کام شروع کردیا۔ یہ اس علاقے میں کھلنے والی پہلی مکمل بچوں کے ملبوسات کی دکان تھی۔ جس میں ہر رنگ، کپڑے، ڈیزائن، کام اور ہر طرح کے ایونٹ کے لیے لباس ملتے۔۔۔ انہیں آرڈر بھی دیا جاسکتا تھا تھیم بھی۔ آرڈر اور تھیم ورک کے لیے وہ تھوڑے سے زیادہ پیسے چارج کرتے تھے۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی میچنگ پاؤچ اور زیورات کا کام بھی شروع کردیں گے۔ کام بڑھ جانے کی صورت میں انہیں کاریگر زیادہ رکھنے پڑتے اور اوپر نیچے اس گھر کو انہوں نے چھوٹا سا کارخانہ بھی بنادیا۔

(باقی آئندہ ماہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مہوش افتخار

میں ہیں ہمسفر

ناولٹ

"آغا بھائی کا فون تھا۔ بریرہ کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔" رفعت بیگم نے کرسی سنبھالتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے بیٹے، بہو اور چھوٹی بیٹی کو مطلع کیا، جو اس اطلاع پہ یکدم پرجوش ہو گئی تھی۔

"ہیں کب؟" ہاتھ روک کر اس نے ماں کی جانب دیکھا۔ خاندان میں بہت عرصے بعد شادی کی کوئی تقریب ہونے والی تھی اور وہ بھی آغاماموں کے گھر۔ جو تھے تو اس کی امی کے کزن مگر اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خاندان کے بزرگوں کے گزر جانے کے بعد اگر کوئی ان کے ننھیال کو جوڑے ہوئے تھا تو وہ آغا فرمان تھے۔ جن کی ہمہ صفت اور ملنسار طبیعت کے باعث سب ان کی دل سے عزت اور قدر کرتے تھے اور انہوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی ہمیشہ سب کے دکھ سکھ کو اپنا جان کر ان کی عزت و اہمیت کا مان رکھا تھا۔

"بقر عید کے پانچویں دن۔" انہوں نے بیٹی کے پُرجوش چہرے کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

"عید پہ۔" اس نے خوشگوار حیرت سے کہا۔ "اور مہندی وغیرہ؟"

"عید کے چوتھے روز مہندی ہے اور تیسرے روز گھر میں ہی مایوں کا چھوٹا سا فنکشن ہے۔" انہوں نے تفصیل سناتے ہوئے بہو کے ہاتھ سے چاولوں کی ڈش پکڑتے ہوئے اپنی پلیٹ میں چاول نکالے۔

"زبردست آئیڈیا ہے۔ پھر آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے اپنی طرف سے تو معذرت کرلی ہے۔ میں فریحہ کو اس حال میں چھوڑ کے نہیں نکل سکتی۔" انہوں نے بہو کی جانب اشارہ کیا جو پریگننٹ تھی اور عید کے بعد کی ہی تاریخ ڈاکٹر نے دے رکھی تھی۔ برہان کی بھی یہاں موجودگی بے حد ضروری ہے۔"

"لیکن امی! شادی میں کسی کی شرکت بھی تو لازمی ہے۔۔۔ وہ سب کے ساتھ اتنا کرتے ہیں اور بریرہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔" فریحہ نے ساس کی طرف دیکھا۔ بریرہ، فرمان صاحب کی اولادوں میں آخری نمبر پہ تھی۔ وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔

"جانتی ہوں۔ اسی لیے تو جب انہوں نے بچیوں کو بھیجنے کے لیے کہا تو میں ثروت کی فیملی کا سوچ کے خاموش ہوگئی۔ لیکن جب انہوں نے بتایا کہ ان میں سے کوئی بھی لاہور میں نہیں، تو میں انکار نہیں کر سکی۔" انہوں نے رسان سے کہا تو نمرہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"لیکن امی! آپ کو ہامی بھرنے سے پہلے ایک بار فضہ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ میرا نہیں خیال کہ وہ جائے گی۔" سب ایک پل کو خاموش سے ہوگئے۔

"میں سمجھاؤں گی تو چلی جائے گی۔ ویسے بھی آغا بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ اس سے خود بات کریں گے۔ مریم کو بھی وہ خود ہی کال کرنے کا کہہ رہے تھے۔"

"وضع داری نبھانا تو کوئی ان سے سیکھے۔ سچ میں مجھے تو کبھی کبھی ان پہ رشک آتا ہے، ہر بات کا خیال رکھتے ہیں۔" برہان نے ماں کی بات سن کر ستائشی لہجے میں کہا تو رفعت کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن اتوار تھا۔ اس لیے فضہ بھی گھر پہ تھی۔ ورنہ دن میں ہسپتال کی مصروفیت اور شام میں رفاہی ادارہ، جس سے کہ وہ منسلک تھی، اس کی ذمہ داریاں اسے خود اپنے لیے بھی زیادہ وقت نہیں دیتی تھیں۔ اس لیے اتوار والے دن وہ خوب آرام کرتی تھی۔ مریم کی بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ میکے کا چکر اتوار کو لگائے، تاکہ سب کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع مل سکے۔

ابھی بھی وہ تینوں بہنیں مع اپنی اکلوتی بھابھی اور رفعت بیگم کے لاؤنج میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ جب فضہ کے موبائل پہ فرمان صاحب کی کال آئی تھی۔

بریرہ کی شادی کا سن کے وہ حقیقتاً بہت خوش ہوئی تھی۔ لیکن ان کے فون کرنے کا مقصد جان کے وہ بے اختیار ہوں، ہاں پہ اتر آئی تھی۔ محبت سے اس سے آنے کے لیے اصرار کرتے ہوئے انہوں نے باتوں باتوں میں اس کی تسلی کا سامان بھی کردیا تھا۔

مریم نے بھی اس سے فون لے کر فرمان صاحب کو ڈھیروں مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ اپنے آنے کا یقین بھی دلایا تھا اور تھوڑی دیر مزید گفتگو کے بعد فون بند کردیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کا پروگرام پکا ہے۔" فضہ نے بڑی بہن کی جانب دیکھا۔

"ہاں بھئی۔ ہمارے آغا ماموں سے اپنے نرمزاج اور ہم نے ان کے منہ کو جانا ہے۔ وہاں اور کون آئے گا کون نہیں، ہمارا اس سے کوئی لینا دینا نہیں نہ ہی ہم کسی کے پیچھے لگ کے اپنے خاندان سے کٹ آف ہو سکتے ہیں۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے؟" بہن کی بات پہ فضہ کی نظریں اس پہ ٹھہریں۔

"کسی نے نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ ہم سب کے ذہنوں میں یہ بات ضرور ہے۔ کیونکہ ان چھ سالوں میں کبھی اگر لاہور کا ذکر بھی کیا گیا ہے تو تم پہلو بچا کے نکل گئی ہو۔ امی یا پھر میں نے ہی ہر طرح کی خوشی، غمی بھگتائی ہے۔۔۔ مگر اب ہم چاہتے ہیں کہ تم اس فیز سے پوری طرح نکل آؤ۔" نرمی سے کہتے ہوئے مریم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شروع میں ایسا تھا۔ لیکن اب میں حقیقتاً اس فیز سے نکل آئی ہوں۔ میرے لیے کسی کا ہونا نہ ہونا اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ نہ ہی وہ میرے لیے اتنی اہمیت کے حامل ہیں کہ میں ان کی وجہ سے خود پہ پابندیاں لگاتی پھروں۔" اس نے رسان سے جواب دیا۔ تو مریم اسے سراہتے ہوئے بولی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مگر تمہیں یہ بات دنیا پہ بھی واضح کرنا ہوگی۔ تاکہ اگلوں کو بھی اس حقیقت کا پتا چلے کہ اگر وہ آگے بڑھ چکے ہیں تو تم بھی انہیں فراموش کرچکی ہو۔"

"مجھے کسی پہ کچھ واضح نہیں کرنا۔ ویسے بھی میری اپنی اتنی مصروفیات ہیں کہ میرے پاس ان خرافات کے لیے ٹائم نہیں۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"خرافات کے لیے وقت نہ سہی لیکن دنیا داری کے لیے تمہیں وقت نکالنا پڑے گا۔ آغا بھائی نے ہم سب کو بہت پیار سے بلایا ہے اور تمہیں تو انہوں نے خاص طور پہ الگ سے فون کیا ہے۔ اتنا مان کون کسی کو دیتا ہے۔ اس لیے اب تمہارا فرض ہے کہ تم ان کی عزت رکھو۔"

رفعت نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ تو وہ مارے بے بسی کے اک گہری سانس کھینچ کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے جہاز سے نکل کر، چھ سال بعد ان ہواؤں کو اپنے اندر اتارا تھا جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ جو اس کی ہر خوشی کی گواہ اور ہر درد کی رازداں بھی تھیں، تب اس کا دل بے اختیار بھر آیا تھا۔

اپنی آنکھوں سے چھلک جانے والے کتنے ہی خاموش آنسو ٹشو پیپر میں جذب کرتے ہوئے اس نے بڑی ہمت سے قدم بڑھائے تھے اور پھر سر اٹھائے ایرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آئی تھی۔ جہاں خود فرمان صاحب کو اپنے بڑے بیٹے کے ہمراہ دیکھ کے وہ دل سے ان کی محبت کی قائل ہوگئی تھی۔ اس کے سر پہ شفقت سے پیار دیتے اور نمرہ کو خود سے لگاتے ہوئے ان کی اپنی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ مگر وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے، واقعی سب کا حال احوال کرنے لگے تھے۔

لاہور شہر کی وہی رونقیں، وہی شان تھی۔ ہر چیز پہلے سے بڑھ کے خوب صورت اور سنوری ہوئی تھی۔ بہت سی جگہیں بہت سی باتیں یاد دلا گئیں۔ دل میں بے اختیار اک ہوک سی اٹھی تھی۔۔۔ بے جان چیزیں اور مقامات سب وہیں رہ گئے تھے۔ بدل گئے تھے تو صرف بڑے بڑے دعوا کرنے والے بظاہر مضبوط لیکن درحقیقت کمزور اور بودے انسان!

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں تیرا پیماں جاناں
یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں
ہم بھی کیا سادہ تھے، ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غم دوراں سے جدا ہے، غم جاناں، جاناں
اب تیرا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے امکاں جاناں

دو ماہ پیشتر:۔

"تھینکس گاڈ کہ آپ انہیں بروقت لے آئے، ورنہ اگر تھوڑی سی بھی تاخیر ہو جاتی تو خدانخواستہ کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی ہو سکتا تھا۔" ڈاکٹر نے آئی سی یو سے باہر آتے ہوئے اپنے ساتھ چلتے فرجاد کو مطلع کیا تو اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

تب ہی ان دونوں کو دیکھ کے حیدر صاحب سمیت زری اور احمر تیزی سے ان کی جانب گئے تو فرجاد نے سُرعت سے خود کو سنبھالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کیا۔

"پلیز ڈاکٹر صاحب انہیں یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔" اس کی درخواست پہ ڈاکٹر سہیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تبھی وہ تینوں ان کے قریب چلے آئے۔

"ڈاکٹر صاحب! میری وائف اب کیسی ہیں؟" حیدر صاحب کے پریشانی سے استفسار کرنے پہ ڈاکٹر سہیل دھیرے سے مسکرا دیے تھے۔

"اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ ہلکا سا انجائنا پین تھا۔ مگر بروقت ٹریٹمنٹ نے مسئلے کو بڑھنے سے بچا لیا۔" انہوں نے "مائیو ہارٹ اٹیک" کو انجائنا پین کا نام دیتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو فرجاد بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچ کے رہ گیا۔ حیدر صاحب ڈاکٹر سہیل سے مزید چند ایک باتیں پوچھنے لگے تو آنکھوں میں آنسو لیے زری اس کے بازو سے آ لگی۔

"بھائی! امی ٹھیک تو ہو جائیں گی نا؟" اس کے بازو سے چہرہ ٹکائے وہ روتے ہوئے بولی تو فرجاد نے بے اختیار اسے خود سے لگا لیا۔

"بالکل! وہ ٹھیک ہی ہیں۔"

"تو پھر انہیں آئی سی یو میں کیوں رکھا ہے؟" روتے ہوئے اس نے بے قراری سے اس کے سینے سے سر اٹھایا۔

تب ہی ڈاکٹر سہیل نے قدرے اونچی آواز میں ان سب کو مخاطب کیا تو فرجاد اور زری تیزی سے ان کی جانب متوجہ ہوئے۔

"آپ سب اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کی والدہ خوش رہیں۔ انہیں ہر طرح کی ٹینشن اور ذہنی دباؤ سے پلیز دور رکھیں۔" وہ انہیں پروفیشنل انداز میں باور کرواتے آگے بڑھ گئے تو سب لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے۔

"احمر! تم پاپا اور زری کو لے کر گھر چلے جاؤ۔ میں یہاں امی کے پاس رکوں گا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولا تو سب نا چاہتے ہوئے بھی گھر جانے کے لیے راضی ہو گئے کہ ایک تو مریض کے ساتھ صرف ایک اٹینڈینٹ کو رکنے کی اجازت تھی اور دوسرا گھر پہ زری کے دونوں بچے ملازمہ کے پاس تھے اور وہ انہیں چھوڑ کر یہاں اسپتال میں نہیں رک سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

چوبیس گھنٹوں کے بعد مسز حیدر کو گھر آنے کی اجازت مل گئی تھی۔

گھر آنے کے بعد، وہ گھر والوں کی بھرپور توجہ کا مرکز بن گئی تھیں۔ مگر فرجاد کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ماں کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ذات ہی ان کی سب سے بڑی پریشانی تھی اور یہ بارِ ندامت اسے اندر ہی اندر مجرم بنائے دے رہا تھا۔ اب بھی وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کیے گھر میں تھا۔ جہاں زری کے دونوں بیٹے اس کی گود میں چڑھے بیٹھے تھے اور وہ سب مسز حیدر کے ساتھ لاؤنج میں موجود تھے۔

"دیکھ لو زری! آخر تمہارے بیٹوں نے مجھے اپنا ماموں مان ہی لیا۔" اس نے فخریہ انداز میں طیب کو چاکلیٹ کھول کے دیتے ہوئے کہا تو زری کے ساتھ ساتھ احمر بھی مسکرا دیا۔

"جی جی کیوں نہیں۔ آدھے شہر کی سویٹس اور چاکلیٹس ان بے ایمانوں کو رشوت میں دینے کے بعد یہ آپ کو ماموں تو کیا نانی بھی ماننے کے لیے تیار ہو جاتے۔" احمر نے مسکراتے ہوئے اپنے لندن پلٹ بھانجوں کو گھورا تو فرجاد کے ساتھ ساتھ زری اور مسز

حیدر بھی ہنس پڑیں۔

"بدتمیز! کس طرح میرے بچوں کو باتیں سنا رہے ہو۔" زری نے ہنسی کے درمیان چھوٹے بھائی کو گھورا۔

"بچوں کو نہیں۔ ان کی مطلب پرستی کو باتیں سنا رہا ہوں۔ قسم سے صحیح انگریز بن گئے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں دیکھوں گی تمہارے بچے کتنے پاکستانی بنتے ہیں۔" وہ اپنی مسکراہٹ دبائے مصنوعی خفگی سے بولی تو احمر نے جان بوجھ کے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"ہک ہا۔۔۔ یہ کیسی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے تو اس دن کے آثار دور تک نظر نہیں آتے۔" اس نے یک لخت چہرے پہ اداسی طاری کرتے ہوئے بہن کی جانب دیکھا تو مسز حیدر نے بے اختیار اسے ٹوک دیا۔

"اللہ نہ کرے، اللہ میرے بچوں کو پھلنا پھولنا نصیب کرے۔ خبردار! جو دوبارہ منہ سے ایسی بات نکالی۔"

"میرے کہنے یا نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے امی حضور سب کچھ تو آپ کے بڑے صاحبزادے کے ہاتھ میں ہے۔" اس نے کن انکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھا جو اس موضوع کے چھڑتے ہی اپنی تمام تر توجہ بھانجوں کی جانب مبذول کر چکا تھا۔

"اس کو اگر اس بات کا احساس ہوتا تو رونا کس بات کا تھا۔" فرجاد پہ نظریں جمائے انہوں نے شکایتی لہجے میں کہا تو اس کے چہرے پہ تکلیف در آئی۔ "کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اس نے اس وقت جذبات میں آ کر وہ فیصلہ تو کر لیا تھا۔ مگر اب یہ نا صرف خود پچھتا رہا ہے۔ بلکہ دل ہی دل میں ہم سب کو اس سب کا ذمہ دار بھی مانتا ہے۔"

"پلیز امی! میں نے ایسا کبھی بھی نہیں سوچا۔ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ میں نے ہمیشہ خود لیا ہے۔ اور اپنے کیے ہوئے فیصلوں پہ میں نے کبھی بھی کوئی پچھتاوا محسوس نہیں کیا۔" ماں کے الزام پہ وہ بے اختیار تڑپ اٹھا تھا۔

"اگر ایسا ہے بھائی تو آپ کیوں امی کو ان لائیعنی سوچوں میں گھرنے پہ مجبور کر رہے ہیں۔ آپ ان کی بات مان کیوں نہیں لیتے؟" زری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو فرجاد بے بسی سے ماں، بہن کو دیکھ کر رہ گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اگر تم لوگوں کو لگتا ہے کہ شادی ہی میری سچائی کا ثبوت ہے، تو میں تیار ہوں۔" ان کی جانب دیکھتا وہ اچانک بولا تو وہ تینوں اپنی جگہ پہ حیرت زدہ سے رہ گئے۔

"آپ۔۔۔ آپ سیریسلی کہہ رہے ہیں بھائی؟" زری نے بے یقین نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یعنی ہم آپ کے لیے لڑکی دیکھ لیں؟" زری نے خوشگوار حیرت سے تصدیق چاہی تو اس کی بات پہ فرجاد کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا احمر کے لیے اس بے تکے سوال پہ مزید خاموش رہنا مشکل ہو گیا۔

"میرے خیال میں لڑکوں کی شادی کے لیے لڑکی ہی دیکھی جاتی ہے۔"

وہ اپنی مسکراہٹ دبائے شرارت سے بولا تو زری اور مسز حیدر کھل کے ہنس پڑیں۔ ماں کو یوں ہنستا دیکھ کے فرجاد کے اندر سکون سا پھیل گیا۔ اس کے اس فیصلے سے اگر اس کی ماں کو خوشی مل سکتی تھی، تو شاید پھر یہ اتنا مہنگا سودا نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے اقرار نے پورے گھر میں ہلچل مچا دی تھی۔ دن رات خاندان بھر کی اور خاندان سے باہر کی مختلف لڑکیاں زیرِ غور تھیں۔ زری کا پاکستان میں قیام چونکہ محض ایک ماہ کا رہ گیا تھا۔ اس لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ جو بھی ہونا ہو، اس کے سامنے ہو جائے۔ ابھی بھی وہ تینوں باپ بیٹا آفس سے لوٹے تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

آگے وہ دونوں بمع فرجاد کی چھوٹی خالہ کے ان کے پڑوس میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

"اچھا ہوا آپ لوگ آگئے۔ اب کم از کم میں وہاں ٹینشن فری ہو کے بیٹھ سکوں گی۔" زری نے ملازمہ کو چائے لانے کا کہتے ہوئے صوفے پہ رکھا اپنا پرس اٹھایا۔

"کیوں پہلے کون سی پریشانیاں تھیں تمہیں؟" احمر نے اپنا لیپ ٹاپ، پارہ صفت سائرہ کی پہنچ سے دور کرتے ہوئے کہا۔

"یہی جو اسی وقت تمہیں ستا رہی ہیں۔" زری دوبدو بولی تو اس کے جواب پہ سب ہی مسکرا دیے۔

وہ اپنے دونوں شیطان ان سب کے سپرد کرتی، امی اور خالہ کے ساتھ چلتی بنی تو احمر، فرجاد کو اپنی یہ قربانیاں یاد رکھنے کی نصیحت کرتا چائے پینے میں مشغول ہو گیا۔

چائے کے دوران فرجاد کے دوست کی کال آگئی تھی وہ بچوں کے شور کی وجہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا اور جب کال اٹینڈ کر کے واپس آیا تو احمر اور حیدر صاحب دونوں کو غائب پا کے بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔

مائر کی آواز کچن سے آتی سن کے وہ طیب کی جانب آیا تھا جو صوفے پہ نجانے کس کا موبائل نہیں لیے بیٹھا تھا۔

"ادھر آؤ میرے پاس۔" اسے اٹھا کر گود میں بٹھاتے ہوئے وہ خود صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"یہ فون کس کا ہے بھئی؟" پیار سے اس کے ہاتھ سے فون لیتے ہوئے اس نے خود تھام لیا تھا۔

"میں نے تصویریں دیکھنی ہیں۔" طیب نے مچلتے ہوئے فون اس سے واپس لینا چاہا۔ تو فرجاد نے ہاتھ اوپر کر لیا۔

"اچھا، میں خود دکھاتا ہوں۔" اس کی بات وہ خلاف توقع آرام سے مان گیا تو وہ "مین مینیو" پہ جا کے تصویریں کھولنے لگا۔

"یہ دیکھو۔۔۔ واہ واہ۔۔۔ یہ کون ہے بھئی؟" جھک کر طیب سے مخاطب ہوتے وہ ایک ایک کر کے تصویریں آگے بڑھانے لگا۔ یہ موبائل کس کا تھا۔ وہ جان چکا تھا۔

ایک کے بعد ایک تصویریں بدلتے وہ اسکرین پہ نگاہیں جمائے بیٹھا تھا، جب اچانک ایک تصویر پہ اس کا ہاتھ تھم سا گیا تھا۔ بری طرح چونکتے ہوئے اس نے بے اختیار موبائل کو قریب کیا تھا۔ گو کہ تصویر میں موجود شخصیت پہلے سے کافی فربہی مائل ہو چکی تھی۔ مگر اس چہرے کو وہ پہلی ہی نظر میں پہچان چکا تھا۔ عام حالات میں بھی وہ اگر کسی سے ایک بار مل لیتا تھا تو اسے شاذ و نادر ہی کبھی بھولا کرتا تھا۔ جبکہ اس انسان کو تو وہ کبھی فراموش کر ہی نہیں سکتا تھا۔

مگر جو بات اس کے لیے شدید حیرت کا باعث تھی وہ صرف یہ نہیں تھی کہ اس کی تصویریں اس موبائل میں کہاں سے آئی تھیں بلکہ یہ وہ اس چہرے کے ساتھ موجود دوسرا چہرہ تھا۔ بے اختیاری کے عالم میں اس نے انگوٹھے کو سکرین پہ پھیرا تھا اور تصویر بدل گئی تھی۔ یہاں بھی وہی دونوں چہرے تھے، ہنستے اور مسکراتے ہوئے۔ اس سے اگلی تصویر میں بھی یہی دونوں باقی سب کے ساتھ کھڑے تھے اور اگلی میں بھی اور اس سے اگلی میں بھی۔

ہر گزرتی تصویر کے ساتھ فرجاد کے چہرے کا رنگ بدلتا چلا جا رہا تھا اور حیرت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں اور ذہن جو کچھ اسے سمجھا رہا تھا، وہ اس کا دل کسی طور قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے سے حقیقت بدلنے والی نہ تھی۔ ہر تصویر ان دونوں لوگوں کے درمیان گہری شناسائی کو ظاہر کر رہی تھی۔

اسے لگنے والا دھچکا اتنا شدید تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو کے رہ گئی تھیں۔ وہ کسی بت کی مانند اپنی جگہ پہ ایستادہ ہو کے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حال کی گاڑی خصوصی راستوں سے گزرتی، آغا ماموں کے جانے پہچانے اور خوب صورت بنگلے کے پورچ میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

ان کے استقبال کو سب ہی اہل خانہ باہر آ کھڑے ہوئے تھے۔ جن میں کئی نئے چہروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ان میں سر فہرست آغا ماموں کے تیسرے اور چوتھے نمبر کے بیٹوں کی بیگمات اور کئی ننھے منے سے چہرے تھے۔

مامی اور بریرہ کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی بے حد تپاک سے ملے تھے۔ انہیں ساتھ لیے سب قافلے کی صورت اندر چلے آئے تھے۔ جہاں ایک طویل نشست کے بعد بریرہ انہیں لیے ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ان کا سامان پہلے ہی یہاں رکھ دیا گیا تھا۔

"فضہ آپی۔ یہ پوری الماری خالی ہے، آپ لوگ آرام سے اپنا سارا سامان اس میں سیٹ کر لیجئے گا اور اگر کوئی جیولری وغیرہ ہے تو اندر لا کر بھی موجود ہے۔ اس کی چابیاں اور الماری کی باقی چابیاں یہ دونوں میں سے کسی ایک سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی ہیں۔" اس نے بیڈ کے دائیں بائیں رکھے ٹیبلوں کی طرف اشارہ کیا تو فضہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپی! آپ پلیز ذرا چیک کر لیں، چابیاں یہاں ہیں بھی یا نہیں؟"

اس کے کہنے پہ فضہ اثبات میں سر ہلاتی اٹھ کر بیڈ کے دائیں جانب رکھے سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی۔ یہاں کی چین میں پڑی چابیاں دیکھ کر جہاں وہ مطمئن ہوئی تھی، وہیں اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے گلابی لفافے اور اس پہ رکھی سرخ گلاب کی ادھ کھلی کلی دیکھ کے وہ بے اختیار چونک گئی تھی۔

جھجکتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کے کلی کو چھوا تھا۔

اور پھر پرائی چیز کا سوچتے ہوئے دراز بند کر دی تھی۔ لیکن جب نمرہ واپس آئی تھی تب اس نے قدرے تعجب سے اسے اس بارے میں بتایا تھا اور وہ مارے اشتیاق کے جھٹ دراز کھول کے دیکھنے کھڑی ہو گئی تھی۔

"کھول کے دیکھوں؟" اس نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

پھر اس کے تنبیہی انداز میں پکارنے کے باوجود کلی سمیت لفافہ اٹھا کر اندر موجود پرچا نکال لیا۔

"ویلکم ہوم۔۔۔" با آواز بلند پڑھتے ہوئے اس نے تعجب سے فضہ کو دیکھا، جو اس دو لفظی پیغام پہ خود بھی حیرت سے بہن کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"اب رکھو اسے واپس۔" اس کے ڈپٹنے پہ نمرہ نے پرچا اسی طرح تہہ کر کے لفافے میں ڈال دیا اور پھر اسے کلی کے ساتھ واپس دراز میں رکھ دیا۔

"ویسے عجیب بات ہے، کلی بالکل تازہ ہے۔ یوں جیسے تھوڑی دیر پیشتر رکھی گئی ہو۔" اس نے فضہ کے پاس بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ اس کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں بالکل فریش پھول ہے۔"

"تم کہو تو بریرہ سے پوچھوں؟" نمرہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"رہنے دو۔ آتے ساتھ ہی بندہ سوال جواب کرتا اچھا نہیں لگتا۔" وہ رسان سے کہتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

فرحت خالہ اور اپنے دونوں ماموؤں سے مل کر فضہ کی پلکیں بے اختیار بھیگ گئی تھیں۔ وہ تینوں بھی اسے کتنی ہی دیر خود سے لگائے کھڑے رہے تھے۔ نمرہ چونکہ ان سالوں میں تین چار بار امی کے ساتھ چکر لگا چکی تھی۔ اس لیے اس کی وہ کیفیت نہ تھی جو فضہ ان سب کو اپنے سامنے پا کے محسوس کر رہی تھی۔ ویسے بھی انہیں اپنے خالہ اور ماموؤں سے بہت پیار تھا۔ کیونکہ ان کے بابا تو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس لیے رشتوں کے حوالے سے جو بھی پیار ملا تھا' اپنے ننھیال سے ہی ملا تھا۔ اب بھی فرحت خالہ اسے وقتاً" فوقتاً" نہال ہو کے چوم رہی تھیں۔ جس پہ اس کے کزنز نے اچھا خاصا مذاق بنالیا تھا۔

ان کے سگے خالہ اور ماموؤں کی فیملیز کے علاوہ آغا ماموں کے اپنے بہن بھائی بھی فیملیز سمیت مدعو تھے جس کی وجہ سے اچھی خاصی تقریب کا سا سماں ہو گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کے ڈھولک رکھ لی گئی تھی۔ جس میں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔ مرد حضرات نے البتہ اپنی محفل ڈرائینگ روم میں جمائی تھی۔ اتنے عرصے بعد اتنے پُرلونق اور اپنائیت بھرے ماحول کا حصہ بن کے فضہ کو بہت اچھا لگا تھا۔

رات میں فرحت ــــ ان کو اپنے گھر لے گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ دن فرحت خالہ کے گھر گزار کے وہ صبح' واپس آغا ماموں کے گھر آگئی تھیں۔ جہاں شام میں مایوں کے فنکشن کی تیاریوں نے خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

فنکشن میں چونکہ باہر سے کسی کو بھی انوائیٹ نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے تقریب گھر کے ہی بڑے سے لان میں رکھی گئی تھی۔ جس کی آرائش کا انتظام لڑکیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد سب ہی تیار ہونے اپنے اپنے کمروں کی جانب چل دیے تھے۔ کیونکہ نو سوا نو بجے تک بریرہ کے سسرال والوں نے رسم کرنے کے لیے آجانا تھا۔

"یار' یہاں میں نے اپنے گولڈن جھمکے رکھے تھے ــــ کسی نے دیکھے تو نہیں؟" بریرہ کی چچا زاد بہن نے ڈریسنگ ٹیبل پہ ہاتھ مارتے ہوئے با آواز بلند کمرے میں موجود لڑکیوں سے پوچھا۔ جن پہ عجیب سی ہڑبونگ سوار تھی۔ ہر کوئی آدھی ادھوری تیاری سمیت ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ وہ ساری لڑکیاں مایوں کی آرائش کے سلسلے میں صبح ہی اپنا اپنا سامان لیے آگئی تھیں۔ ــــ اور اب بریرہ اور فضہ کے کمرے میں قبضہ جمائے' تیاری میں مصروف تھیں۔

"گولڈن جھمکے میں نے کسی کے ہاتھ میں دیکھے تو تھے۔" نوین نے بال بناتے ہوئے ایک پل کو رک کے سوچا۔

"ارے ہاں! وہ تو مانو کے ہاتھ میں تھے۔" اس نے بڑی بھابھی کی پانچ سالہ بیٹی کا نام لیا تو سارہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس کے تاثرات پہ فضہ سمیت نمو اور عائشہ کی ہنسی بھی چھوٹ گئی۔

"تو اللہ کی بندی پکڑے کیوں نہیں؟" وہ روہانسی سی بولی۔

"میں سمجھی اپنی اماں کے لے کر گھوم رہی ہے۔" نوین بے چارگی سے بولی تو سارہ اسے گھورتی تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔

اسی پل واصف بھائی ہاتھوں میں ہار' گجروں اور گلاب کی پتیوں سے بھرے شاپرز اٹھائے اندر داخل ہوئے تھے۔

"یہ لو بھئی۔ تم لوگوں کے ہار پھول وغیرہ۔" انہوں نے شاپرز آگے بڑھائے تو فضہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے انہیں تھام لیا۔

"آپ کون ہیں محترمہ؟" زرد جوڑے میں ملبوس فضہ کے سرخ و سفید چہرے پہ نگاہیں جماتے ہوئے انہوں نے شرارت سے پوچھا تو اس کے ساتھ ساتھ سب کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"واصف بھائی!" اس نے مصنوعی خفگی سے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے جھٹ اپنے چہرے پہ حیرت طاری کرلی۔

"ارے یہ تو اپنی ڈاکٹر صاحبہ ہیں ــــ یار فضہ! خود پینٹ کیا ہے یا کسی ایکسپرٹ سے نقشہ بدلوایا ہے؟ باخدا پہچان میں نہیں آرہیں۔" انہوں نے معصومیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ اچھا طریقہ ہے تعریف کرنے کا۔ آپ سیدھے طریقے سے نہیں کہہ سکتے کہ میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تو واصف اپنی اس بیباری اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

نرم خو سی کزن کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیے جو معمول سے ہٹ کر ہلکے پھلکے میک اپ اور نفیس سی جیولری میں واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"کوئی شک نہیں۔ ماشاء اللہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ پر خلوص لہجے میں بولے تو فضہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"تھینک یو۔"

وہ سب تیار ہو کے باہر آئیں تو نظریں بے اختیار لان کی سجاوٹ پہ جا ٹھہریں۔ ہر کوئی ان کی کاوش کو سراہتے ہوئے بریرہ کے سسرال والوں کا منتظر تھا۔

تب ہی واصف بھائی کی بیگم نے اسے پھول لانے کے لیے کہا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی اندر چلی آئی تھی۔

کچن میں موجود فریج کھول کر اس نے شاپر زنکال کے وہاں موجود چھوٹی سی میز پر رکھے تھے۔ اسی وقت ملازمہ ہاتھ میں پلیٹیں لیے چلی آئی تھی۔

"باجی! وہ رخی باجی کہہ رہی ہیں کہ آپ گجرے اور ہاروں والا پیکٹ مجھے دے دیں اور پتیاں نکال کر ان پلیٹوں میں ڈال دیں۔ میں پھر یہ پلیٹیں باہر لے آؤں گی۔" اس نے واصف بھائی کی بیگم کا پیغام اسے دیا۔ تو اس نے ہاروں والا شاپر اس کے حوالے کر دیا جسے لیے وہ باہر نکل گئی اور وہ خود وہ دوسرا پیکٹ کھول کے جلدی جلدی پتیاں پلیٹوں میں ڈالنے لگی۔

تب ہی اس کی نظر شاپر میں موجود پتیوں کے بیچ میں رکھے ایک چھوٹے سے گلابی لفافے سے ٹکرائی وہ بے اختیار چونک گئی۔ حیران ہوتے ہوئے اس نے وہ لفافہ اٹھا کر نظروں کے سامنے کیا جو اوپر سے کھلا ہوا تھا۔

معاً اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا اور اسے پہلے روز اپنے کمرے کی دراز میں رکھا وہ گلابی لفافہ اور وہ گلاب کی کلی یاد آ گئی تھی۔ اس نے اندر موجود پرچا نکال کر نظروں کے سامنے کیا تھا۔

اجاڑ محلوں کی داستانیں جو تم کہو تو سنائیں تم کو
بہت سا ہم جاگتے رہے ہیں، چلو ذرا سا جگائیں تم کو

تم ہی ہو جو روشنی سی بن کر ہماری آنکھوں میں آ بسے ہو
جب اپنی آنکھیں ہی کہہ دیا ہے تو پھر بھلا کیوں بلائیں تم کو

غبار آلود راستوں میں تلاش کر کر کے تھک گئے ہیں
کہاں پہ جا کر بسے ہو، کہاں سے ہم ڈھونڈ لائیں تم کو

تمہیں تو سکھ آ گئے میسر، تمہیں تو ہم یاد ہی نہیں ہیں
مگر یہ بتاؤ کہ ہم جو چاہیں تو کس طرح سے بھلائیں تم کو

کہو کہ جاذب یہ جھوٹ ہے نا کہ تم نے اس کو بھلا دیا ہے
ابھی تلک جس کی شوخ یادیں ہر ایک لمحے ستائیں تم کو

یہ کیا تھا؟ اور کس نے رکھا تھا؟ کیا اس کے ساتھ کسی قسم کا مذاق کیا جا رہا تھا یا یہ دونوں پیغامات کسی اور کے لیے تھے؟

الجھتے ہوئے اس کی نظریں ایک بار پھر پرچے پہ دوڑنے لگی تھیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بالآخر اس نے پرچا واپس لفافے میں ڈال دیا تھا۔

اپنا کام مکمل کر کے وہ کچن سے باہر نکل آئی تھی۔ اس ہنگامے میں وہ بھلا اس لفافے کے متعلق کسی سے کیا پوچھتی۔ نمرہ بھی فی الوقت سب کے ساتھ باہر موجود تھی۔ اس لیے وہ اوپر اپنے کمرے کی جانب چلی آئی تھی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ تیز قدموں سے بائیں طرف والے سائیڈ ٹیبل کی طرف آئی تھی۔ لیکن جونہی اس نے اس کی نچلی دراز کھولی تھی وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا، بالکل ایسے انداز میں اس کے ہاتھ اوپر والے دراز کی جانب اٹھے تھے۔ لیکن نہ صرف وہ بلکہ دوسرے سائیڈ ٹیبل کے درازوں میں بھی کہیں گلابی لفافے اور اس کلی کا نشان نہ تھا۔ اب یا تو ان کی غیر موجودگی میں وہ دونوں چیزیں کسی نے اٹھا کر پھینک دی تھیں یا پھر جس نے رکھی تھیں اس نے اٹھالی تھیں۔

اس عجیب و غریب صورت حال پہ الجھتے ہوئے بے اختیار اس کی نظریں ہاتھ میں پکڑے اس نئے لفافے پہ آ ٹھہری تھیں اور اس خدشے کے زیر اثر کہ کہیں یہ بھی ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ اس نے اٹھ کر اسے الماری میں رکھے اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ اور پھر اسی

متعلق سوچتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

مایوں کی تقریب بھرپور رہی تھی۔ سب نے بے حد انجوائے کیا تھا۔ مہمانوں اور خاندان والوں کے رخصت ہونے کے بعد فضہ اور نمرہ سمیت سبھی گھر والوں نے مل کے اندر باہر سے گھر سمیٹا تھا۔ بریرہ اس دوران سب کے منع کرنے کے باوجود چھوٹے موٹے کام نپٹاتی رہی تھی۔ یوں رات گئے جب وہ بستر پہ آ کر لیٹی تھیں تو فضہ کے ذہن سے وہ لفافہ بالکل نکل گیا تھا۔

دوسرے دن وہ بریرہ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ جب اچانک بریرہ پرجوش سی آواز میں "بھائی آپ!" کا نعرہ لگاتی داخلی دروازے کی جانب لپکی تھی۔ اس کی پکار پہ سب کے ساتھ ساتھ فضہ کی نظریں بھی آنے والے کی طرف اٹھی تھیں اور پھر گویا وہ سانس لینا بھول گئی تھی۔

لاؤنج کے انتہائی سرے پہ اس کے عین مقابل ہنستا مسکراتا کوئی اور نہیں بلکہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا درد مجسم کھڑا تھا۔ وہ شخص جس کی صورت بھی وہ دوبارہ کبھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر جسے آج چھ سال بعد اچانک اپنے روبرو پا کر اس کا دماغ اس حد تک ماؤف ہو گیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنا تک بھول گئی تھی۔

اس کے برعکس باقی تمام افراد خوشگوار سی حیرت لیے اس کی جانب بڑھے تھے، جو فضہ کی موجودگی سے انجان بریرہ کے سوالوں کا مسکراتے لہجے میں جواب دے رہا تھا۔

"ایسا ہو سکتا تھا بھلا کہ میری بہن کی شادی ہوتی اور میں نہ پہنچتا۔"

محبت سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ کے آغا ماموں کے گلے جا لگا تھا۔ اس کے روشنیاں بکھیرتے چہرے پہ اپنی دہشت ناک نگاہیں جمائے وہ بھری محفل میں اپنی ذات میں بالکل تنہا کھڑی تھی جب اسے اپنے بازو پہ ایک مہربان سا لمس محسوس ہوا تھا۔ بے اختیار اس کی خالی نظریں اپنے دائیں جانب اٹھی تھیں اور اپنے پہلو میں نمرہ کو کھڑا دیکھ کے وہ اس کا ہاتھ اپنے برف سے ہاتھ میں تھامے، ایک جھٹکے سے پلٹ کے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ یہ جانے بنا کہ اندر غائب ہوتے سبز آنچل کے پیچھے اٹھنے والی بہت سی نظروں نے آنے والے کو بھی کسی کے محفل چھوڑ جانے کا احساس دلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیوں آیا وہ میرے سامنے! کیوں، کیوں؟" اپنے کمرے کی تنہائی ملتے ہی وہ درد سے بلبلا اٹھی تھی۔

"میں اب یہاں ایک منٹ نہیں رہوں گی۔" سختی سے اپنے آنسو پونچھتی وہ قطعیت سے الماری کی جانب بڑھی تو اب تک خاموشی سے اس کا ساتھ دیتی نمرہ کاٹ دار لہجے میں بول اٹھی۔

"ضرور جاؤ تاکہ اس شخص کو اچھی طرح پتا چل جائے کہ اتنے سالوں میں تم اسے بھلا نا تو دور اس کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت بھی مجتمع نہیں کر سکیں۔" اس کی بات پہ فضہ کے الماری کھولتے ہاتھ یک لخت ساکت ہو گئے تھے۔

"کیا کہا تھا تم نے مریم آپی سے کہ کسی کا ہونا نہ ہونا تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا اور یہ کہ تم اس فیز سے نکل آئی ہو۔" غصے سے بولتی نمرہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

"جھوٹ بولتی ہو تم! کیونکہ اگر تمہارے الفاظ میں رتی برابر بھی سچائی ہوتی تو تم اس وقت یہ تماشا کرنے کے بجائے وہاں سب کے درمیان اس شخص کی ذات کی نفی کر کے اپنے کہے کو ثابت کر رہی ہوتیں۔ یوں بزدلوں کی طرح بھاگ جانے کی تیاریاں نہیں کر رہی ہوتیں!" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ کھولتے ہوئے لہجے میں بولی تو فضہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

"تم صحیح کہتی ہو۔ میرا ہر دعوا بودا نکلا۔۔۔ میں زندگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ کچھ بھی نہیں!"

"بند کرو یہ خود ترسی کی باتیں اور اگر تم چاہتی ہو فضہ مسعود کہ ناکامی کا یہ شرمناک احساس دوبارہ تمہیں کبھی نہ ہو۔ تو بہادری سے سب کے سامنے اس شخص کا سامنا کرو اور یہ بات یاد رکھنا کہ خود کو اپنی اور دوسروں کی نظروں میں سرخرو کرنے کا یہ موقع شاید پھر دوبارہ تمہیں کبھی نہ ملے۔" بات کرتے کرتے اس نے رو دی ہوئی بہن کے شانے پہ نرمی سے ہاتھ رکھا تو فضہ کے آنسوؤں میں شدت در آئی۔

☼ ☼ ☼

فضہ، جس خاموشی سے لاؤنج سے نکلی تھی، اسی خاموشی سے دو ڈھائی گھنٹے بعد سب کے درمیان واپس آموجود ہوئی تھی۔ گو کہ اس کے چہرے کا پھیکا پن اور آنکھوں کی سرخی اس کے رونے اور ذہنی انتشار کی چغلی کھا رہی تھی، مگر پھر بھی کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ یوں جیسے کوئی غیر متوقع بات ہوئی ہی نہ ہو۔

اسے یوں مضبوطی سے خود کو سنبھالے دیکھ کر نمرہ کو بے حد اطمینان ہوا تھا۔

دوسرے دن بارہ بجے کے قریب مریم اپنے بچوں کے ہمراہ پہنچ گئی تھی۔ اس کی آمد سے فضہ اور نمرہ کو ان دیکھا سا تحفظ کا احساس ہوا تھا۔

ثروت خالہ کی فیملی کی لاہور واپسی اور شادی میں متوقع آمد کا سن کے اس کی نظریں بے اختیار فضہ کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ مگر جب اس نے کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا تب وہ اندر ہی اندر مطمئن اور خوش ہو گئی تھی۔

شام میں سب لڑکیوں نے مل کے ڈھولک رکھ لی تھی۔ ڈھولک کی آواز نے گھر میں سماں سا باندھ دیا تھا۔ مریم کی فرمائش پہ فضہ کچن میں ملازمہ کے ساتھ چائے تیار کر رہی تھی۔ جب فخر بھائی نے آکے اسے مزید آٹھ بندوں کے لیے چائے بنانے کا کہا تھا۔ ان کی بات پہ اس نے پہلے سے تیار شدہ چائے کے ساتھ چند ایک لوازمات ٹرالی میں رکھے تھے اور گھر والوں کے لیے ملازمہ کو نئے سرے سے چائے کا پانی رکھنے کی ہدایت کرتی، وہ ٹرالی لیے ڈرائنگ روم کی جانب چلی آئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ پر دستک دیتی، فخر بھائی دروازہ کھول کے باہر آئے تھے اور اسے منتظر کھڑا دیکھ کے نرمی سے بولے تھے۔

"ارے یار! سب اپنے ہی ہیں۔ تم لے جاؤ ٹرالی۔" ان کے کہنے پہ وہ مطمئن سی دروازہ کھول کے ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی تھی۔

"السلام ــــ" جونہی اس کی نظر اپنے کزنز کے درمیان ٹانگ پہ ٹانگ رکھے قہقہے لگاتے شخص سے ٹکرائی تھی۔ اس کا سلام اس کے منہ میں ہی رہ گیا تھا۔ لیکن صرف لحظہ بھر کو۔ اگلے ہی پل وہ سرعت سے خود کو سنبھالتی نگاہیں جھکا گئی تھی۔

"السلام علیکم!" وہ سپاٹ لہجے میں کہتی ٹرالی لیے آگے بڑھی تو صوفے پہ براجمان ہستی نے اس آواز پہ چونکتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھا اور پھر جیسے اس کی آنکھیں اس کے وجود پہ جم سی گئی تھیں۔ یوں جیسے یقین نہ آرہا ہو کہ وہ اس کے سامنے آگئی تھی اور شاید یہی بے یقینی کی کیفیت باقی سب کی بھی تھی۔ تب ہی تو کمرے میں یک لخت سناٹا چھا گیا تھا۔ جسے واصف بھائی نے بڑے غیر محسوس انداز میں توڑا۔

"شکر ہے بھئی۔ تم کچھ کھانے کے لیے بھی لائی ہو۔ قسم سے سخت بھوک لگ رہی تھی۔" وہ سیدھے ہوتے ہوئے بولے تو باقی سب نے بھی خود کو سنبھال لیا۔ جبکہ وہ دھیرے سے گلا کھنکھار تا رخ موڑ کے مرتضیٰ سے بات کرنے لگا تھا۔

"آپ جائیں آپی! ہم چائے بنالیں گے۔" اس کی حالت کے پیشِ نظر عمر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا تو فضہ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا چینی دان اس کی جانب بڑھا دیا اور پھر پلٹ کے متوازن قدموں سے چلتی باہر نکل آئی۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے بے اختیار اس نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے جھنجھناتے اعصاب کو نارمل کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔ تب

ہی اندر سے ایک مانوس اور زندگی سے بھرپور قہقہہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا اور اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔

"کسی کی ذات کو اپنے قدموں تلے روند کر کوئی بھلا اتنا مطمئن اور خوش کیسے ہو سکتا ہے؟" زخم خوردہ نگاہیں بند دروازے پہ جمائے اس نے حیرت اور دکھ سے سوچا تھا اور پھر بوجھل قدموں سے کچن میں جانے کے بجائے اوپر چھت پہ چلی آئی تھی۔

سرکرسی کی پشت پہ ڈالے اس نے اپنی خالی نگاہیں نیلے آسمان پہ جمادی تھیں۔ تب ہی کسی گاہر بوجھ سے آزاد قہقہے لگاتا بے فکر چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ ٹھہرا تھا جو پہلے سے بڑھ کے شاندار سراپے کا مالک بن چکا تھا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

ہاں ہوتے ہیں کچھ لوگ جو زندگی میں کسی مقام کو جب پیچھے چھوڑ جاتے ہیں تو اس کی جانب پلٹ کر دیکھنا تو دور اس کے بارے میں سوچنا بھی بے وقوفی سمجھتے ہیں اور کچھ اس جیسے بیوقوف بھی ہوتے ہیں جو بظاہر تو اپنی زندگی میں آگے بڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن ان کا اندر وہیں کہیں اس مقام کے گرد کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس سے تو آج تک کسی غیر کو فراموش نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تو پھر ان کے اپنے تھے۔

ہم سے زندگی کی حقیقت نہ پوچھ وصی
بہت پُر خلوص لوگ تھے جو تنہا کر گئے

واقعی، انہیں جن ہستیوں سے ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ ملا تھا، ان کے بارے میں تو انہوں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا کہ وہ انہیں کبھی کوئی چھوٹا سا درد بھی پہنچا سکتے ہیں۔ اسی لیے شاید جب ان کے ہاتھوں دلوں پہ ضرب لگی تھی تو نہ صرف رشتے ٹوٹے تھے بلکہ مان، اعتبار اور محبت ہر چیز بکھر کر رہ گئی تھی۔ ورنہ اسے یاد تھا کہ کیسے ان کے لیے ثروت خالہ کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی اور انہیں بھی ان چاروں بہن بھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی بہن سے بھی بہت پیار تھا۔ اسی حد تک کہ دونوں بہنوں نے اپنے شوہروں اور سسرال والوں کی رضامندی سے بچپن میں ہی اپنے بچوں کے رشتے آپس میں طے کر دیے تھے۔ چار سالہ برہان کو ثروت نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور ایک ماہ کی فضہ کو پانچ سالہ سکندر سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

یہ اور بات تھی کہ دونوں کو اپنے اس رشتے کا علم بہت بعد میں جا کر ہوا تھا تب جب سکندر اپنا ایم ایس کر رہا تھا اور فضہ میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی۔ مگر دونوں کو ہی بزرگوں کے اس فیصلے نے خوشی سے سرشار کر دیا تھا۔ خاص طور پہ سکندر جس کی دلی مراد از خود بر آئی تھی۔

اپنی اس پسندیدگی کا اظہار وہ اب اکثر فضہ سے کرتا رہتا تھا۔ جسے چاہے جانے کے پرکیف احساس نے خود بھی سکندر کی محبت میں گرفتار کر دیا تھا۔ مگر اپنی متانت اور فطری جھجک کے ہاتھوں وہ اکثر اظہار سے پہلو بچا جایا کرتی تھی۔

دوسری جانب برہان نے بھی اس رشتے کو خوشی سے قبول کیا تھا۔ مگر سکندر کے برعکس وہ جذبوں کو وقت سے پہلے عیاں کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس کا اظہار زارا کو فقط میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے تک ہوتا تھا۔ جس پہ زارا کو اس سے خاصا گلہ تھا۔ اس کے یہ گلے صرف اس کی ذات تک محدود تھے۔ لیکن اندر کا یہ کھنچاؤ بعض اوقات اس کے رویے میں بھی در آتا تھا۔ خصوصاً فضہ کے ساتھ، جو اپنی اچھی بھلی کزن کے یوں اچانک بدل جانے پہ حیران بھی ہوتی تھی اور پریشان بھی۔ مگر چونکہ وہ اب پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی تھی، اس لیے زارا کی ایسی ہر بات کو درگزر کر دیا کرتی تھی۔ وہ ان لایعنی باتوں کو اہمیت دے کے آنے والے وقت کے لیے کوئی الجھنیں نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کس قدر خوب صورت بال ہیں تمہارے۔ مگر تم نے انہیں پڑھائی کے چکر میں بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔" مریم آج میکے آئی ہوئی تھی۔ فضہ اس کے پاس لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ جب امی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

باتیں کرتی مریم کا دھیان اس کی پشت پہ بڑی چوٹی پر پڑا تھا۔ جو پہلے کے مقابلے میں قدرے پتلی ہو گئی تھی۔

"ہاں تو بال بے چارے کیا کریں' نہ ڈھنگ سے کھاتی ہے یہ لڑکی اور نہ ہی ذہن کو سکون دیتی ہے۔ جب دیکھو کتابوں میں سر دیا ہوتا ہے۔" رفعت جو پہلے ہی اس کی روٹین سے خاصی نالاں تھیں۔ خفگی سے بولیں تو مریم اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"جاؤ جا کے تیل لے کر آؤ۔ میں تیل لگا دوں۔ پہلے سے کتنے کمزور ہو گئے ہیں تمہارے بال۔" اس نے اس کی چوٹی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے محسوس کیا۔

"ابھی نہیں آپی' مجھے اپنی اسائنمنٹ پوری کرنی ہے۔" وہ بہن کی طرف دیکھتی بے چارگی سے بولی تو مریم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اوں ہوں بعد میں کرنا۔۔۔ جاؤ تیل لے کر آؤ۔" اس کے قطعی لہجے پہ فضہ منہ بناتی' پاتھ روم سے جا کر تیل لے آئی اور پھر بال کھول کے بہن کے سامنے کارپٹ پہ بیٹھ گئی۔ مریم اس کے پیچھے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔ اس کی انگلیوں کی سرسراہٹ سے بہت جلد فضہ کو بھی سکون ملنے لگا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بہن کی "چمپی" سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب لاؤنج کا دروازہ کھول کے سکندر اور زارا داخل ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کے مریم اور رفعت دونوں کھل اٹھی تھیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں سکندر نے ایک نظر آنکھیں بند کیے بیٹھی فضہ پہ ڈالی تھی اور پھر شرارت سے لبوں پہ انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود دبے قدموں سے چلتا صوفے کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی حرکت پہ رفعت اور مریم بے اختیار مسکرا دی تھیں۔ مگر زارا کو بھائی کی یہ شوخی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ وہ منہ بناتی خاموشی سے جا کے ایک طرف رکھے کاؤچ پہ ٹک گئی تھی۔

سکندر نے صوفے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کے فضہ کے لمبے بالوں کی لٹ زور سے کھینچی تھی۔

"آؤچ!" اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔

"اوف آپی آرام سے۔" وہ ہاتھ اٹھا کے سر سہلاتے ہوئے بولی تو مریم اپنی ہنسی دبائے فقط "اچھا" ہی کہہ پائی تھی۔ تب ہی سکندر نے ہاتھ بڑھا کے پہلے سے زیادہ زور سے اس کے بال کھینچے تو فضہ بلبلا اٹھی۔

"ہائے! آپی یہ آپ کیا۔۔۔" وہ تڑپ کے بہن کی طرف پلٹی تو نظر صوفے کے پیچھے کھڑے سکندر سے جا ٹکرائی جو بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس کے ساتھ مریم اور رفعت کی ہنسی بھی چھوٹ گئی تھی۔

"میں بھی کہوں میری آپی میں کس جلاد کی روح گھس گئی ہے۔" وہ رخ موڑ کر بال لپیٹتے ہوئے مسکراتے لہجے میں بولی۔ تو اس کی بات پہ سکندر کا قہقہہ گونج اٹھا۔

"اچھا تو تمہارا مطلب ہے کہ میرا بھائی جلاد ہے۔" استہزائیہ لہجے پہ فضہ نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا تھا اور کونے میں رکھے کاؤچ پہ زارا کو براجمان دیکھ کے اس کے چہرے پہ شرمندگی پھیل گئی تھی۔

"ہاں تو ایسے کام کرے گا تو جلاد ہی کہلائے گا ناں۔" مریم تیل کی بوتل اٹھا کر بند کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بولی تو خفت زدہ سی فضہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لائیں دیں میں رکھ آؤں۔" وہ سکندر کی طرف دیکھے بنا بہن سے مخاطب ہوئی تھی۔ مریم نے بوتل اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"جاؤ جا کے چائے کا پانی رکھو۔" مریم نے دھیرے سے کہا' وہ اثبات میں سر ہلاتی پلٹنے کو تھی کہ زارا ایک بار پھر بول اٹھی۔

"رہنے دیں آپی! اس نے پڑھنا ہو گا۔" اس کی بات پہ فضہ نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ حالانکہ اس نے یہ بات بظاہر عام سے لہجے میں کہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں جو ایک عجیب چبھتا ہوا سا تاثر تھا' وہ فضہ کو اس کی اصل نیت کا پتا دے گیا تھا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ بعد میں پڑھ لے گی وہ۔" مریم کے رسان سے جواب دینے پہ اس نے

دکھ بھری نظروں سے زارا کی جانب دیکھا تھا اور پھر اک گہری سانس لیتی اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ثروت بیگم نے مہینے کا سودا سلف منگوانے کے لیے لاکر کھولا تھا۔ وہ ماہانہ حساب کر کے پیسے نکالنے میں مصروف تھیں۔ جب زارا ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ لاکر کھلا دیکھ کے وہ اشتیاق سے آگے بڑھی تھی اور ایک جانب رکھے ثروت بیگم کے زیورات کے ڈبے نکال کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی مصروفیت پہ ثروت نے ایک اچٹتی نظر بیٹی پہ ڈالی تھی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھیں۔

"امی! دیکھیں' یہ کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے ان کی شادی کا بھاری گلوبند پہن کے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے ماں کو پکارا اور پھر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ماشاء اللہ بہت پیارا لگ رہا ہے۔ بس اس کے موتی چینج ہو جائیں تو بالکل نئے ڈیزائن کا لگے گا۔" وہ بغور سیٹ کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔ تو زارا انگلی میں پہنی سیٹ کے ساتھ کی بڑی سی انگوٹھی کو ستائشی نظروں سے دیکھتی واپس ڈبوں کی جانب متوجہ ہوئی۔

"امی! میرا ڈائمنڈ کا سیٹ کہاں ہے؟" اس نے ایک ایک کر کے ڈبے چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بینک میں ہے۔" وہ سر اٹھائے بنا بولیں تب ہی دروازہ کھول کے سکندر اندر داخل ہوا اور بیڈ پہ زیور پہنے بیٹھی زارا کو اردگرد ڈبے پھیلائے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"یہ تم کیا بنی بیٹھی ہو؟"

"اچھا ہے ناں؟" اس کے سوال کو نظر انداز کیے اس نے الٹا سوال کیا تو سکندر شوخ نظروں سے بہن کو دیکھتا ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"میرے خیال میں امی! بریان کو بلوانہ لیا جائے؟" اس کی بات پہ ثروت نے مسکراتے ہوئے بیٹی کی جانب دیکھا تو اس کے لبوں کی مسکراہٹ یک لخت سمٹ سی گئی۔

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" وہ تلخ لہجے میں کہتی کانوں میں پہنے جھمکے اتارنے لگی تھی۔ اس کے انداز پہ ثروت کے ساتھ ساتھ سکندر بھی چونک گیا تھا۔

"کیا مطلب؟" سکندر نے سنجیدگی سے بہن کی جانب دیکھا۔ تو وہ لحظہ بھر کو جھجک سی گئی۔

"پتا نہیں' مجھے یہ بات آپ کے سامنے کرنی بھی چاہیے یا نہیں؟" وہ دھیرے سے نظریں جھکاتے ہوئے بولی تو سکندر الجھ سا گیا۔

"فار گاڈ سیک یار' وی آر لائک فرینڈز۔۔۔ بولو کیا بات ہے۔"

"بھائی مجھے' مجھے نہیں لگتا کہ بریان اس رشتے سے خوش ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی تو دونوں ماں بیٹے کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اس نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ثروت نے پریشان نظروں سے بیٹی کے چہرے کو تکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن اس کا رویہ اس کی ناپسندیدگی کو صاف ظاہر کرتا ہے۔" وہ بوجھل لہجے میں گویا ہوئی تو دونوں کے دل کو قدرے تسلی ہوئی۔

"مجھے تو ایسا کبھی نہیں لگا بیٹا۔ کیا پتا یہ تمہارا وہم ہو۔" ثروت کے نرمی سے کہنے پہ وہ بے اختیار جھلا اٹھی۔

"آپ کو ایسا کبھی کیوں نہیں لگا' اس بارے میں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ لیکن امی میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ رویوں اور لہجوں کو پہچاننے کا سینس ہے مجھ میں اور اگر آپ لوگوں کو میری بات پہ یقین نہیں تو آپ خود غور کر کے دیکھ لیجیے گا۔" تلخ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتی وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تو ثروت اور سکندر بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

اس دن رفعت نے کڑھی بنائی تھی اور چونکہ کڑھی سکندر کو بہت پسند تھی اس لیے انہوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خاص طور پہ ایک ڈبہ بھر کے بہن کے گھر بھجوانے کے لیے تیار کیا تھا۔ ان کا ڈرائیور چند دنوں کی چھٹی لے کر گیا ہوا تھا۔ تب ہی اتفاقاً" برہان آفس سے گھر آگیا تھا ۔اس کی آدھے گھنٹے بعد ایک کلائنٹ سے میٹنگ تھی ۔وہ اسی سلسلے کی ایک ضروری فائل لینے گھر پہنچا تھا۔ فرحت کا گھر اس کے آفس کے راستے میں ہی آتا تھا' اس لیے وہ رفعت کے اصرار پہ ڈبا گاڑی میں رکھے' ان کے گھر چلا گیا تھا۔ چوکیدار کے دروازہ کھولنے پہ اس نے پہلے تو سوچا کہ ڈبا اس کے حوالے کردے' مگر پھر یہ سوچ کر کہ خالہ کہیں بُرا نہ مان جائیں۔ وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلا آیا۔ ملازمہ نے اسے ڈائیننگ روم میں بھیج دیا تھا۔ جہاں وہ سب کھانا کھا رہے تھے۔

اسے دیکھ کر بے اختیار سب کھل اٹھے تھے۔ خالہ' خالو کو سلام کرتا وہ سکندر کے گلے لگا تھا جو اس کے استقبال کو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایک چور سی نظر بے نیازی سے کھانا کھاتی زارا پہ ڈالتے ہوئے برہان نے ہاتھ میں پکڑا ڈبہ سکندر کی جانب بڑھا دیا تھا۔

"یہ امی نے کڑھی بھجوائی ہے۔" اس کی بات پہ سکندر نے خوشی سے ڈبا تھام لیا تھا۔

"واہ زبردست! چلو آؤ تم بھی کھانا کھاؤ۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو برہان دھیرے سے مسکرا دیا۔

"پھر کبھی یار۔ آج مجھے بہت ضروری کام ہے۔" اس کی بات پہ زارا نے معنی خیز انداز میں ہولے سے گلا کھنکھارا تو ثروت بیگم کی نظریں بیٹی کی جانب اٹھ گئیں۔ جس کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ آ کے غائب ہوگئی تھی۔ اگلے ہی پل وہ بھانجے کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

"ایسی بھی کیا جلدی بیٹا۔ یہ دس منٹ کی ڈرائیو پہ تو تمہارا آفس ہے۔" وہ نرمی سے بولیں تو برہان شرمندہ ہوگیا۔

"جی خالہ! لیکن میں اس وقت واقعی لیٹ ہو رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اگلی دفعہ ضرور کھاؤں گا۔" وہ رسان سے بولا تو ثروت بے اختیار خاموش ہوگئیں۔

"اوکے یار! اللہ حافظ!" وہ سب سے الوداعی کلمات کہتا آخر میں سکندر سے ہاتھ ملا کے باہر نکل گیا تو وہ خاموشی سے اپنی جگہ پہ واپس بیٹھ گیا۔

"کڑھی ڈالوں تمہارے لیے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد ثروت نے ڈبے کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھا تو اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"رات میں کھالوں گا۔" اس کے جواب پہ ثروت کی نگاہیں بے اختیار اس کے چہرے پہ ٹھہر گئی تھیں۔ جس پہ پھیلا پُرسوچ سا تاثر اس کی الجھن کا غماز تھا۔

☆ ☆ ☆

اس واقعے کے بعد سکندر نے لاشعوری طور پہ زارا کے ساتھ برہان کے رویّے پر غور کرنا شروع کردیا تھا۔ تب اسے بھی یہ بات محسوس ہوئی تھی کہ پہلے کے مقابلے میں برہان اب قدرے تکلف سے زارا سے بات کرتا ہے۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے سے کہیں بھی سکندر کو یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس رشتے سے ناخوش ہے۔

اپنا تجزیہ اس نے ماں کے سامنے بہن کے ساتھ ڈسکس کیا تھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے اس وہم کو دل سے نکال دینے کے لیے کہا تھا۔ بیٹے کی بات پہ ثروت بیگم کے دل میں ڈھیروں سکون اتر آیا تھا۔ ورنہ جس دن سے انہوں نے زارا کے منہ سے یہ بات سنی تھی' وہ بے تحاشا پریشان ہوگئی تھیں۔ لیکن اب وہ نہ صرف مطمئن ہوگئی تھیں۔ بلکہ انہوں نے دل ہی دل میں یہ طے کرلیا تھا کہ وہ جلد رفعت سے برہان اور زارا کی شادی کی بات کریں گی۔ فضہ کی میڈیکل کی پڑھائی کے پیچھے انہیں زارا اور برہان کے معاملے کو مزید لٹکانا کسی طور مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

ماں کے اس خیال پہ سکندر خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے تصور میں تو ہمیشہ دونوں شادیاں اکٹھی انجام پا آئی تھیں۔ لیکن فضہ کی میڈیکل کی پڑھائی نے اس کے دل کی خواہش کو پورا کرنا مشکل بنا دیا تھا۔ وہ اندر ہی

اندر جھنجلا گیا تھا۔ کیا تھا اگر جو فضہ اس کی خاطر اپنا ایم بی بی ایس شادی کے بعد مکمل کرلیتی؟ اپنے اس خیال کو اسے ایک دن فضہ کے سامنے زبان دینے کا موقع مل گیا تھا۔

وہ سب کزنز مل کر آؤٹنگ کے لیے نکلے تھے۔ جب باتوں باتوں میں موضوع گفتگو آج کل کی لڑکیوں پہ جا پہنچا تھا۔

"توبہ کرو' آج کل کی لڑکیاں اتنی خود سر ہیں کہ وہ اپنی خواہشات کے آگے کسی چیز کو اہم نہیں جانتیں۔ کمپرومائز کس چڑیا کا نام ہے' ان کو معلوم تک نہیں۔" مرتضیٰ' نازش کی بات پہ استہزائیہ لہجے میں بولا تو فضہ کے لیے خاموش رہنا مشکل ہوگیا۔

"آپ ساری لڑکیوں کے لیے یہ بات نہیں کہہ سکتے مرتضیٰ بھائی۔ ہمارے ہاں تو آج بھی ہر معاملے میں زیادہ تر کمپرومائز عورت ہی کرتی ہے۔ خاص طور پہ شادی کے بعد تو ایڈجسٹمنٹ کے نام پہ صرف لڑکی ہی ہر طرح کا کمپرومائز کرتی ہے۔ کبھی آپ نے کسی لڑکے کو شادی کے بعد خود کو اپنی بیوی کے مطابق ڈھالتے دیکھا ہے؟" وہ اپنے ماموں زاد کی طرف دیکھتی رسان سے بولی تو وہ بے اختیار پاس بیٹھے سکندر کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے شرارت سے مسکرا دیا۔

"ہاں! ڈھالے گا ناں اپنا یہ شہزادہ خود کو تمہارے مطابق۔ جب تم ہسپتال کے لیے نکلا کرو گی' یہ کھانا پکایا کرے گا' بچے سنبھالے گا اور جب تم تھکی ہاری آیا کرو گی تب تمہارا سر بھی دبایا کرے گا۔ کیوں سکندر؟" اس کی بات پہ جہاں سب نے قہقہہ لگایا تھا وہیں فضہ کے ساتھ ساتھ سکندر بھی مسکرا دیا تھا۔

"ویسے اگر فضہ! میں تم سے یہ کہوں کہ تم میری خاطر اپنی میڈیکل کی پڑھائی کچھ عرصے کے لیے چھوڑ دو تو تم کیا کرو گی؟" سکندر نے اچانک اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تو سب معنی خیزی سے "او" کرتے فضہ کی جانب دیکھنے لگے۔ جو سکندر کی آنکھوں سے چھلکتی سنجیدگی دیکھ کے ایک پل کے لیے چپ سی ہوگئی۔

"تو میں آپ سے ریکویسٹ کروں گی کہ مجھے اتنے مشکل امتحان میں مت ڈالیں۔" ایک نظر اس پہ ڈالتی وہ پلکیں جھکا گئی تھی۔ اس کے جواب پہ سکندر کی آنکھوں میں دکھ کی کیفیت پھیل گئی تھی۔ یعنی سکندر کی ذات اس کے لیے اہم تھی مگر اتنی اہم نہیں کہ وہ اسے اپنی پڑھائی پہ فوقیت دے دیتی۔

"تم تو بہت ہوشیار نکلیں یعنی فیصلہ کرنے کے بجائے بندوق سکندر کے کندھے پر رکھ دو گی؟" مرتضیٰ نے ہنستے ہوئے کہا تو سکندر طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔ اس کے چہرے سے چھلکتی خفگی کو چور نظروں سے دیکھتی فضہ کے لبوں پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔ کاش کہ نمرہ اور برہان کی طرح آج وہ بھی سب کے ساتھ آنے کے بجائے گھر رک جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

"اور وہ جو تم ابھی کمپرومائز کی بات کر رہی تھیں۔ اس پہ کیا خود عمل نہیں کرو گی؟" ایک نظر بھائی پہ ڈالتے ہوئے زارا نے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں سوال کیا تو فضہ افسردگی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی' سکندر کلائی پہ بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالتا بے تاثر لہجے میں بولا۔

"میرے خیال میں چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔" اس کے کہنے پہ سب ہی ہاں میں ہاں ملاتے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور بظاہر بات وہیں ختم ہوگئی تھی۔ مگر سکندر کے رویّے کا کھنچاؤ سب کے سامنے فضہ کو شرمندگی سے دوچار کر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔ جسے چھپانے کو وہ پلکیں جھکا گئی تھی۔

دوسری طرف سکندر بھی سارا راستہ خاموش رہا تھا ۔ڈیڑھ دو گھنٹے کی ساری خوشی اچانک کہیں کھو سی گئی تھی۔ بھائی کی اس کیفیت کو زارا نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ مگر جب وہ گھر پہنچے تھے' تب گاڑی سے اترنے سے پہلے اس نے نرمی سے اس کا بازو تھام لیا تھا۔ جس پہ وہ بے اختیار چونک کر بہن کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آپ کو پتا ہے بھائی! میرا اور آپ کا المیہ کیا ہے؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ دل گرفتی سے بولی تو سکندر بغور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ہم دونوں جن لوگوں کو اپنی اولین ترجیح قرار دیتے ہیں' ان دونوں کی ترجیحات میں ہم کہیں بہت بعد میں آتے ہیں۔" لبوں پہ اک دکھ بھری مسکراہٹ لیے وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی' دروازہ کھول کے اتر گئی تھی اور پیچھے بیٹھا سکندر' بوجھل دل لیے نجانے کتنی دیر اندر ہی گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

برہان اپنی روٹین کے مطابق' شام میں ٹینس کھیلنے جم خانہ پہنچا تھا۔ دو سیٹ کھیلنے کے بعد وہ اور اس کا دوست ایک طرف رکھی کرسیوں پہ آ بیٹھے تھے۔ گھونٹ گھونٹ پانی پیتے وہ اپنی سانس بحال کرتے ہوئے ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے جب فرحان کے اشارہ کرنے پہ برہان کی نظریں خود سے ذرا فاصلے پہ موجود ایک لڑکی کی جانب اٹھی تھیں' جو خاصی پریشانی سے وہاں موجود چیزوں کے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے شاید کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی مس' اینی پرابلم؟" چند لمحوں بعد بھی جب اس کی تلاش ختم نہ ہوئی تو برہان نے یونہی بائے داوے اس سے پوچھ لیا۔

"میرا موبائل نہیں مل رہا۔" وہ سر اٹھاتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

"آپ نے کہاں رکھا تھا؟" برہان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں ٹیبل پہ میری باقی چیزوں کے ساتھ پڑا تھا۔ میں چند لمحوں کے لیے اپنی فرینڈ سے بات کر کے واپس آئی تو موبائل ٹیبل پہ سے غائب تھا۔" وہ متفکر سی بولی تو برہان اس کی بات سن کے حیران رہ گیا۔

"آپ اپنی چیزیں یونہی چھوڑ گئی تھیں؟" اس کے تعجب سے استفسار کرنے پہ اس نے شرمندگی سے اثبات میں سر ہلایا تو برہان اپنے سامنے کھڑی عقل مند خاتون کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پھر تو یہ ہونا ہی تھا۔" اس کی بات پہ وہ خفت زدہ سی ان کے قریب چلی آئی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو پلیز ایک بار اپنے موبائل سے میرا نمبر ڈائل کر دیں۔ کیا پتا وہ یہیں کہیں ہو۔" اس کی ریکویسٹ پہ برہان نے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پھر مطلوبہ نمبر ملا کے فون کان سے لگا لیا۔ تبھی اردگرد مدھری رنگ ٹون نے اس لڑکی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو بھی چونکنے پہ مجبور کر دیا۔ بے اختیار وہ اس کی مدد کو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

چند لمحوں کی تلاش کے بعد بالآخر انہیں اس کا موبائل پیچھے کیاری میں لگے پودوں کے درمیان مل گیا تھا۔

"تھینکس گاڈ!" لپک کر فون اٹھاتے ہوئے اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ "پتا نہیں کس بدتمیز نے یہ حرکت کی ہے....." وہ فون صاف کرتی برہان کی طرف پلٹی۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ اگر آپ میری ہیلپ نہ کرتے تو میں یقیناً" آج اس سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔" وہ تشکرانہ لہجے میں بولی تو برہان دھیرے سے مسکرا دیا۔

"اٹس آل رائٹ لیکن آپ لکی ہیں جو یہ آپ کو مل گیا۔ دوبارہ اتنی بے احتیاطی سے کام مت کیجیے گا۔" وہ رسان سے کہتا' فرحان کے ساتھ پلٹ کے اپنی کرسیوں کی جانب بڑھنے لگا تو اس نے پیچھے سے پکار لیا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔" اس کے سوال پہ جہاں برہان پل بھر کو ٹھٹکا تھا وہیں فرحان کے لبوں پہ معنی خیز سی مسکراہٹ در آئی تھی' جسے چھپانے کو وہ بے اختیار رخ پھیر گیا۔

"برہان مسعود۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"اوکے برہان صاحب! پھر ملاقات ہو گی۔ بائے۔" وہ مزے سے کہتی اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تو برہان اس کی حرکت پہ اچھنبے سے مسکراتا ہوا پلٹ

کے آگے بڑھ گیا۔ جبکہ اس کے ساتھ چلتے فرحان کے دانت اب پوری طرح نکل آئے تھے۔

"پھر کیا خیال ہے برہان صاحب' دوبارہ کب ملنا ہے؟" اس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"بکو مت!"

لیکن آنے والے دنوں میں وہ لڑکی' جب بھی برہان کو نظر آئی تھی' وہ اس سے سلام دعا کے بغیر آگے نہیں بڑھی تھی۔ یوں نہ چاہتے ہوئے بھی برہان کی اس ساحرہ نصیر نامی لڑکی سے علیک سلیک ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اتوار کا دن تھا۔ سکندر کچھ دیر پہلے سو کے اٹھا تھا اور اب ناشتے کا منتظر تھا ان کے پاپا اپنے دوست کی طرف جانے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ زارا فون پہ چپکی اپنی کسی سہیلی سے باتوں میں مصروف تھی۔

تب ہی ملازمہ کسی لڑکی کی آمد کا پیغام لیے اندر چلی آئی تھی۔ جو سکندر یا پھر ثروت بیگم سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کی بات پہ حیران ہوتے ہوئے' سکندر نے ملازمہ کو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے لیے کہا تھا اور پھر ماں کو لیے' اس سے ملنے چلا آیا تھا۔

انہیں دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ رسمی سے تعارف کے بعد وہ اپنے اصل مدعا کی جانب آئی تھی۔

"دیکھیں آنٹی! میں آپ لوگوں سے جو بات کرنے آئی ہوں اسے پلیز حوصلے سے سنیے گا۔" دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں تمہید باندھی تو نہ چاہتے ہوئے بھی ثروت بیگم اور سکندر پریشان ہو گئے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ برہان اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" اس کی بات پہ ان دونوں کے سر پہ جیسے چھت آ پڑی تھی۔ وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جو ان کے قدموں تلے سے زمین سرکانے کے بعد نادم لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"آپ یقین کریں میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ وہ منگنی شدہ ہے۔ مگر جب مجھے اس حقیقت کا علم ہوا تب میں نے اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ مجھے اور اپنی منگیتر کو دھوکا دینے کے بجائے' ہم دونوں میں سے کسی ایک کو چن لے۔ تب اس نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ جلد آپ سب کو میرے بارے میں بتا دے گا۔ مگر پھر وہ اس موضوع سے دامن بچانے لگا اور رفتہ رفتہ مجھ سے بھی گریز برتنے لگا۔ تب میں سمجھ گئی کہ اس نے مجھ سے محض فلرٹ کیا ہے۔ لیکن میں نے اسے پوری سچائی سے چاہا ہے اور میں آج آپ کے پاس یہی درخواست لے کر آئی ہوں کہ آپ پلیز میری مدد کریں' کیونکہ وہ آپ کی بیٹی کے ساتھ نہ تو مخلص ہے اور نہ ہی اس سے برہان کو کوئی لگاؤ ہے۔ لیکن اگر آپ لوگ یہ رشتہ ختم کر دیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ میری طرف لوٹ آئے کیونکہ میں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو سکندر جو بڑے ضبط سے اس کی بات سن رہا تھا' سخت لہجے میں بول اٹھا۔

"بند کرو یہ ڈراما! کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس ساری بکواس کا جو تم نے ابھی کی ہے۔" اس کی بات پہ وہ لڑکی غصے سے اپنے آنسو پونچھتی پرس کھولنے لگی تھی۔

"میں جانتی تھی کہ آپ لوگ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔" اس نے پرس میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک لفافہ نکالا تھا اور پھر اسے سینٹر ٹیبل پہ پھینک دیا۔

"یہ رہا ثبوت..... اب شاید آپ کو میری باتوں کا یقین آ جائے۔" اس کے نڈر انداز پہ دونوں ماں بیٹے کی آنکھیں سراسیمگی کے عالم میں سامنے پڑے خاکی لفافے پہ جا ٹھہری تھیں۔

اگلے ہی پل سکندر نے سرعت سے آگے بڑھ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لفافہ اٹھاتے ہوئے کھول لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہاں میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ مگر یہ' یہ تصویریں ۔۔۔" برہان نے اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ ایک نظر تمام حاضرین محفل کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی تصویروں کی طرف دیکھا تھا' جن میں وہ مختلف پوز میں ساحرہ نصیر کے ساتھ تھا۔ یہ ساری تصویریں جم خانہ میں الگ الگ دنوں پہ لی گئی تھیں اور جس ہوشیاری سے لی گئی تھیں اس کی بدولت دونوں کے درمیان گہرا تعلق ظاہر ہو رہا تھا۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس لڑکی کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں تھا۔

"یہ تصویریں بالکل غلط انداز سے لی گئی ہیں۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ لوگ میرا یقین کریں میں تو اس لڑکی سے سوائے رسمی۔۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا سکندر کا خون کھول اٹھا تھا۔ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے برہان کا گریبان پکڑ لیا تھا اور اس کی اس حرکت پہ ان کے ساتھ آئے ان کے ماموں اور آغا فرمان سرعت سے اٹھ کر اس کی جانب لپکے تھے جبکہ روتی ہوئی رفعت' نمرہ اور فضہ کی مارے خوف کے چیخ نکل گئی تھی۔

"کمینے! الو کے پٹھے! جھوٹ بولتے ہو۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔" آغا فرمان اور ریاض ماموں نے زبردستی اس کے ہاتھ سے برہان کا گریبان چھڑاتے ہوئے سکندر کو پیچھے ہٹایا تھا۔ مگر وہ کسی طور ان دونوں کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

اس دہشت ناک منظر پہ آنسو بہاتی فضہ نے بے اختیار آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"اس سے پوچھیں ماموں۔ اگر یہ اس لڑکی کو نہیں جانتا تو ان تصویروں میں کیا اس کا باپ۔۔۔" باوجود بے تحاشا غصے کے سکندر نے یک لخت اپنی زبان کو روکتے ہوئے' خون آشام نگاہوں سے برہان کو گھورا تو مسلسل حوصلے اور صبر سے کام لیتے برہان کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

"میں نے کب انکار کیا ہے کہ یہ میں نہیں ہوں۔ ہاں یہ میں ہی ہوں۔ مگر جس کسی نے بھی یہ تصویریں کھینچی ہیں بہت چالاکی اور مہارت سے کھینچی ہیں۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" اپنی صفائی دیتا وہ بے اختیار چلا اٹھا تھا

"ہاں اب تو تم نے یہی کہنا ہے۔ مگر کیا کوئی لڑکی اتنی جرات کر سکتی ہے کہ بغیر کسی سچائی کے وہ انجان لوگوں کے گھر تک پہنچ جائے اور بالفرض اگر ہم آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی اسی حقیقت کو جھٹلا بھی دیں' تب بھی زارا سے تمہاری بے زاری اور گریز کا تو میں خود گواہ ہوں۔ تمہیں اس رشتے سے کتنا انٹرسٹ ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں!" کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتا' سکندر کٹیلے لہجے میں بولا تو برہان اس الزام پہ تڑپ اٹھا۔

"اب تم زیادتی کر رہے ہو سکندر۔ میں نے اس رشتے اور زارا کو دل سے قبول کیا ہے۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں جو اپنی مرضی کے خلاف کیے گئے فیصلے نبھاتا پھروں۔"

"جانتا ہوں کہ کتنے دل سے تم نے اس رشتے کو قبول کیا ہے۔" سکندر نے کاٹ دار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن اب یہ سب باتیں بے معنی ہو گئی ہیں۔ تم اس لڑکی کو جانتے ہو یا نہیں۔ مگر مجھے تم جیسے بدکردار آدمی کے ساتھ اپنی بہن کے حوالے سے کوئی رشتہ نہیں جوڑنا۔"

اس کی بات پہ جہاں برہان کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا تھا۔ وہیں مسعود صاحب کی باقی فیملی پہ سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"زبان کو لگام دو سکندر۔" فرمان صاحب نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔ "یہ فیصلہ کرنا تمہارا نہیں ہمارا

کام ہے۔"

"مگر یہ صرف سکندر کا نہیں ہم سب کا فیصلہ ہے۔" خاموشی سے آنسو بہاتی ثروت اچانک سرد لہجے میں بولیں۔ تو ایک پل کے لیے گویا سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"یہ' یہ تم کیا کہہ رہی ہو ثروت؟" رفعت نے لرزتے لہجے میں بہن سے سوال کیا۔ تو وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سختی سے بولیں۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میری بیٹی مجھ پہ اتنی بھاری نہیں کہ میں اسے کسی غلط انسان کے حوالے کر دوں۔ رہا سکندر تو یہ اب اس کی مرضی ہے کہ یہ تمہاری بیٹی سے رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے یا نہیں؟"

ان کے واضح اور دو ٹوک الفاظ پہ فرمان صاحب سمیت سب ہی حق دق رہ گئے تھے۔ جبکہ فضہ کی تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو گئی تھی۔ یہ سب کیا ہونے جا رہا تھا؟

بے اختیار اس کی آنسو بہاتی آنکھیں سکندر کی جانب اٹھی تھیں۔ جو لب بھینچے' دکھ بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"پلیز' پلیز خالہ! میرا یقین کریں۔ آپ کہتی ہیں تو میں قرآن تک اٹھا لوں گا۔ مگر یہ سچ ہے کہ میری اس لڑکی سے سوائے رسمی سی بات چیت کے دوسرا کوئی تعلق نہیں۔ میں اس لڑکی کا پتا لگوا کے اسے بہت جلد آپ سب کے سامنے بھی لا کھڑا کروں گا۔ اس نے یہ سب کیوں کیا' میں نہیں جانتا۔ مگر فی الوقت آپ جلد بازی میں ایسا کوئی قدم مت اٹھائیں جس سے ہمارے رشتے بکھر جائیں۔" برہان' بے قراری سے ثروت بیگم کے قدموں میں بیٹھ گیا تو فضہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"بچہ ٹھیک کہہ رہا ہے ثروت۔۔۔ تم اسے اپنی سچائی ثابت کرنے کا ایک موقع تو دو۔" ایک نظر برہان پہ ڈالتے ہوئے فرمان صاحب نے دھیمے لہجے میں انہیں سمجھایا۔

"نہیں فرمان بھائی۔ یہ بات اب نہ صرف میرے دل سے اتر گئی ہے بلکہ میری بچی بھی اب کسی طور اس رشتے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا دل بہت بری طرح ٹوٹا ہے اور میں اس کے حوصلوں کو مزید آزمانا نہیں چاہتی۔" دھیرے سے کہتے ہوئے انہوں نے اپنے گھٹنوں پر سے برہان کے ہاتھ ہٹا دیے تو وہ لب بھینچے انہیں دیکھ کر رہ گیا اور پھر شکستگی کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو میں بھی ان معاملوں میں زور زبردستی کا قائل نہیں۔ لیکن میری بہن کا اس سارے قصے میں کوئی قصور نہیں۔ آپ پلیز اسے کسی غلط فہمی کی سزا مت دیجئے گا۔" نظریں جھکائے اس نے التجائیہ انداز میں کہا تو رفعت اور نمرہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں۔ جبکہ فضہ نے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹنے کے لیے سختی سے اپنے لبوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ انہیں کبھی اپنے رشتے بچانے کے لیے اپنی ہی عزیز از جان ہستیوں کے سامنے سسکنا پڑے گا۔

"قصور تو میری بہن کا بھی کوئی نہیں تھا برہان مسعود! اگر تم نے اسے پھر بھی سزا دی۔۔۔ تم نے انتہائی بے رحمی سے نا صرف اس کی بلکہ میری محبت کو بھی برباد کر ڈالا۔" دل گرفتی سے کہتے ہوئے سکندر نے زخم خوردہ نظروں سے فضہ کی جانب دیکھا تو اس کا دل جیسے رک سا گیا۔ وہ کیا کہنے والا تھا اسے جیسے پہلے ہی اس کے فیصلے کا علم ہو گیا تھا۔

"فضہ! میری بہن آج تمہارے بھائی کی وجہ سے اذیت میں مبتلا ہے اور میں اتنا خود غرض نہیں کہ تم سے رشتہ جوڑ کے نہ صرف اس کے لیے بلکہ اپنے پورے گھر کے لیے ساری زندگی کی تکلیف کا سامان کر ڈالوں۔۔۔ برہان تمہارا بھائی ہے۔ تم اسے چھوڑ نہیں سکتیں اور میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ چیزوں کو مزید الجھانے کے بجائے میں ساری تکلیف اپنے دل پہ جھیل لوں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اپنے بھائی کی طرح تمہیں بھی میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی خاص فرق

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں پڑنے والا!" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ یک لخت تلخی سے مسکرایا تو فضہ کے بہتے اشک جیسے تھم سے گئے۔

یہ 'یہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اتنا بڑا الزام۔ وہ بھی سب کے سامنے! کیا اسے نہیں پتا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھی۔ یا پھر اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینے اور اپنے موقف کو مزید مضبوط کرنے کے لیے اسے یہی بہتر لگا تھا کہ وہ سرے سے اس کی محبت سے ہی انکاری ہو جائے۔ کیا انصاف کا یہی تقاضا تھا کہ وہ جاتے جاتے اس کی محبت کو بھی داغدار کر جاتا؟"

ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی وہ دکھ سے سوچے چلی گئی تھی یہاں تک کہ سکندر دل میں اس کی خاموشی کا ملال لیے اس کے سامنے سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا تھا۔ فضہ مسعود نے اس کی بات کی کوئی تردید نہیں کی تھی' اس تلخ حقیقت نے سکندر کے اندازے پہ جیسے تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔ اس کا دل بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔

ادھر برہان اس ناانصافی پہ تڑپ اٹھا تھا۔ اپنی بہن کی بربادی کی وجہ خود کو قرار دیتے ہوئے وہ ماں باپ کے قدموں میں گر کے بے اختیار رو دیا تھا۔ اس کی اس حرکت پہ ماں اور بہنیں تڑپ اٹھی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے بھائی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر اس پہ تو جیسے اپنی سچائی ثابت کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔

آنے والے دنوں میں فرمان کے ساتھ مل کر اس نے اس فراڈ لڑکی کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔ لیکن نہ تو اس کا کوئی سراغ ملا تھا اور نہ ہی یہ معمہ کبھی حل ہو سکا تھا کہ اس نے یہ سب کیوں کیا تھا؟

اس واقعے کے چھ ماہ بعد مریم اپنی فیملی کے ساتھ کراچی شفٹ ہو گئی تھی۔ اور سال بھر بعد مسعود صاحب کی ہارٹ اٹیک کی وجہ سے اچانک ہونے والی موت نے ان سب کو زندگی کے سب سے بڑے غم اور نقصان سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ ان سب کے لیے بہت کڑا وقت تھا۔ ان سب کی کفالت کی ذمہ داری اچانک برہان پہ آ پڑی تھی۔ جس نے بہتر سے بہترین کی کوشش میں اپنی پرانی کمپنی چھوڑ کے کراچی کی ایک جانی پہچانی فرم جوائن کر لی تھی۔ یوں وہ سب بھی لاہور چھوڑ کے کراچی آ گئے تھے۔

زندگی نئے سرے سے اپنے سفر پہ رواں دواں ہو گئی تھی وقت کچھ اور آگے سرکا تھا۔ برہان کی شادی ہو گئی تھی۔ فضہ بھی اپنا میڈیکل مکمل کر کے جاب جوائن کر چکی تھی۔ اس دوران اس کے لیے کتنے ہی رشتے آئے تھے۔ مگر ابھی شاید اسی کا نصیب کھلنے کا وقت نہیں آیا تھا یا کچھ اور کہ اس کی کہیں بات نہیں ٹھہری تھی۔ اپنی روح پہ اتنی تکلیف جھیلنے کے باوجود اس نے کبھی اپنی شادی کے حوالے سے اپنی ماں کو کوئی فیصلہ لینے سے نہیں روکا تھا۔ وہ انہیں اپنی ذات کی طرف سے مزید کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی تھی اور دیتی بھی کیوں؟ کیا وہ بے حس شخص' جس نے بنا کسی خطا کے محض ایک غلط فہمی کی بنا پہ اس کی محبت کو ہی جھٹلا دیا تھا' اس قابل تھا کہ وہ اس کے لیے جوگ لے کر اپنی ماں اور اپنے بھائی کو اذیت دیتی؟

دوسری طرف زارا کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ مگر سکندر کے لیے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا مشکل ہو گیا تھا۔ اپنے جذبوں کی بے قدری نے اس کا محبت پہ سے ایمان ہی اٹھا دیا تھا اور بنا محبت کے ایک خالی دل کے ساتھ وہ کسی بھی لڑکی کو بس یونہی اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اس فیصلے پہ وہ بہت مضبوطی سے قائم تھا کہ حالات نے اچانک پلٹا کھایا تھا اور وہ بالکل بے بس ہو گیا تھا۔

ثروت خالہ کی بہو تلاش کرنے کی خبر اڑتی ہوئی رفعت کے گھر تک بھی پہنچی تھی اور وہ نئے سرے سے رنجیدہ ہو گئی تھیں۔ مگر فضہ نے ایسی کسی خبر پہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر چکی تھی سو اب چاہے وہ شخص جیتا یا مرتا اسے اس سب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن — بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے فضہ نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر

WWW.PAKSOCIETY.COM

اٹھایا تھا۔
"شاباش ہے! ہم سب کب سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور تم یہاں بیٹھی ہو۔" اپنے پیچھے اچانک اسے نمرہ کی آواز سنائی دی تو وہ سرعت سے آنکھیں صاف کرتی سیدھی ہو بیٹھی۔
"میں بس آنے ہی والی تھی۔" خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے پلٹ کر چھوٹی بہن کو دیکھا۔ جو اس کی طرف آتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔
"تم رو رہی تھیں؟" نمرہ نے بغور اس کی جانب دیکھا تو وہ اک گہری سانس لیتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہاں۔" وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے بولی۔ نمرہ بے اختیار خاموش ہو گئی۔
"آؤ' نیچے چلتے ہیں۔" فضہ نے نرمی سے کہتے ہوئے بہن کا ہاتھ تھاما تو وہ اسی خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔

☆ ☆ ☆

دوسرا دن اپنے ساتھ مہندی کی تقریب کا ہنگامہ لے کر آیا تھا۔
اس لیے مامی نے آج خاص طور پہ مہندی لگانے والیوں کو بلوایا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے میکے اور سسرال سے بریرہ کی سب ہی کزنز اور بھابھیوں کو فون کر کے بلوا لیا تھا۔ اب لڑکیوں اور بچیوں کی لمبی قطار تھی جسے مہندی لگانے والی لڑکیاں بھگتا رہی تھیں۔
اس دوران گھر میں جس کا نہانا دھونا اور کپڑے استری کرنا رہتا تھا وہ فٹافٹ ان کاموں کو نپٹا رہی تھیں تاکہ فارغ ہو کے وہ بھی مہندی لگوانے کے لیے بیٹھ سکیں کھانا پکانا اور مرد حضرات کی وقت بے وقت چائے شربت کی فرمائش آج مکمل طور پہ ملازموں کے سپرد تھی۔
"تم شام میں تیار ہونے کے لیے پارلر چلو گی فضہ؟" فروا بھابھی نے مہندی لگواتے ہوئے اپنے دائیں جانب بیٹھی نند سے پوچھا جو بغور اپنی ہتھیلی پہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتے بیل بوٹوں کا جائزہ لے رہی تھی۔
"نہیں بھابھی۔" وہ اپنی مہندی پہ سے نظر ہٹاتے ہوئے بولی۔
"کیوں؟" انہوں نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
"آپ کو پتا تو ہے' میک اپ میں زیادہ کرتی نہیں ہوں اور بال میرے پہلے سے لیئرز (Layers) میں کٹے ہوئے ہیں' جنہیں میں خود ہی بلو ڈرائی کر لوں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو فروا کی نظر اس کی پونی پہ جا ٹھہری۔
"پہلے تو تمہارے بال بہت لمبے تھے ناں؟" انہوں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ تو فضہ کے ذہن میں کسی کی ستائشی نظریں جملے تازہ ہو گئے۔
"ہوں۔" اس نے پھیکی پڑتی مسکراہٹ کے ساتھ محض ہنکارا بھرتے ہوئے نگاہیں ایک بار پھر اپنی ہتھیلی پہ جما دیں۔
"تم نے اتنے لمبے بال کٹوائے کیوں؟" وہ نجانے کیوں اس کے بالوں میں پھنس گئی تھیں۔
"بھابھی! انہیں سنبھالنا بہت مشکل تھا اور پھر میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا تھا کہ ان کی صحیح دیکھ بھال کر سکوں۔ ویسے کیا کٹنگ مجھ پہ سوٹ نہیں کرتی؟" اس نے قصداً "بات کو گھماتے ہوئے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔
"تم پر تو ماشاء اللہ ہر چیز سوٹ کرتی ہے۔" اس پہ نظریں جمائے وہ ستائشی لہجے میں بولیں تو فضہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
"بہت شکریہ جناب!"
دونوں ہاتھوں پہ مہندی لگوا کے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اردگرد سے اپنے ہاتھ بچاتی وہ ایک طرف رکھے فلور کشنز کی طرف بڑھی تھی کہ ملازمہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے پاس چلی آئی۔
"باجی' وہ رخی باجی آپ کو اوپر بلا رہی ہیں۔" اس کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتی چلی گئی تھی۔
وہ تیز قدموں سے سیکنڈ فلور کی جانب بڑھی تھی۔

جہاں رخی بھابھی اور ان کے بچوں کے کمرے تھے۔ مگر آگے بھائیں بھائیں کرتا پورشن دیکھ کے وہ واپس جانے کو پلٹی تھی کہ نجانے کیسے اس کا پاؤں ماربل کے چکنے فرش پہ پھسل گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہوتی ایک مضبوط ہاتھ نے اسے بازو سے پکڑ کے گرنے سے بچا لیا تھا۔ سرعت سے خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنے مددگار کی جانب دیکھا تھا۔ لیکن جونہی اس کی نظر سکندر پہ پڑی تھی اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اپنے بازو پہ اس کے ہاتھ کا احساس فضہ کو جیسے کرنٹ لگا گیا تھا۔
"ہاؤ ڈیر یو! تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟" تڑپ کے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑاتے ہوئے وہ تیزی سے اس سے دور ہٹی تو سکندر جو اسے اچانک اپنے اتنے قریب پا کے ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا تھا' ہوش میں آ گیا۔
"آئی ایم ساری۔ یہ بالکل ایک بے اختیاری عمل تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تم....."
"شٹ اپ!" تنفر سے کہتے ہوئے اس کی بات سننے کی زحمت کیے بنا تیز قدموں سے زینے کی جانب بڑھی تھی کہ لب بھینچے کھڑے سکندر کا خون' اس درجہ بدتمیزی پہ کھول اٹھا۔
"تم خود کو سمجھ کیا رہی ہو؟ بات کرنے کی تمیز نہیں رہی کیا؟" اس نے ایک جھٹکے سے پاس سے گزرتی فضہ کا بازو پکڑتے ہوئے اپنے مقابل کھڑا کیا تو وہ اس کی اس درجہ جرات پہ پہلے حیران اور پھر بپھر اٹھی۔
"چھوڑو میرا بازو..... میں کہتی ہوں چھوڑو!" انگارے کی طرح سرخ چہرہ لیے وہ قہر برساتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی گیلی مہندی کی پرواہ کیے بنا دوسرے ہاتھ سے اپنے بازو میں پیوست اس کی انگلیاں ہٹانے کی کوشش میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا یہ جنون' یہ گریز دیکھ کے نجانے کیوں سکندر کا غصہ بھی بھڑک اٹھا تھا۔
"پہلے میری بات کا جواب دو!" اس کی انگارہ آنکھوں میں دیکھتا وہ بھنچے ہوئے لہجے میں بولا۔
"تم سے کلام کرنا میں اپنی توہین سمجھتی ہوں!" وہ نفرت سے چور لہجے میں بولی تو ایک پل کے لیے وہ ساکت رہ گیا۔ کیا وہ واقعی اس سے نفرت کرنے لگی تھی؟ نفرت؟ یعنی محبت کا مکمل خاتمہ' نہیں! وہ یہ ماننے کو بالکل تیار نہیں تھا۔ سکندر' فضہ مسعود کی ترجیحات سے سرے سے نکل جائے ایسا ممکن نہ تھا۔
"میں نہیں مان سکتا۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ مضبوط لہجے میں بولا تو اس کے اس درجہ پُریقین انداز پہ فضہ کا خون کھول اٹھا۔ مگر بظاہر اس کے لبوں پہ اک کاٹ دار مسکراہٹ آ ٹھہری۔ شاید آج حساب برابر کرنے کا وقت آ گیا تھا۔
"کیوں؟ کیوں نہیں مان سکتے؟ کس بات کا گھمنڈ ہے تمہیں؟ تم میں ایسا ہے کیا جو کوئی تم سے دوبارہ ملنے یا کلام کرنے کی خواہش کرے..... تم کچھ بھی نہیں ہو مسٹر سکندر! کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اپنے اس خوش فہمی اور خود پرستی کے خول سے باہر نکل آؤ!" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے اندر کی ساری کھولن اس پہ انڈیل دی تو سکندر کے لبوں پہ اک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"اور کچھ؟" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ زخم خوردہ سا بولا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی اذیت اور چہرے پہ پھیلے کرب نے نہ چاہتے ہوئے بھی فضہ کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔
"اب میری سنو..... میں اس لیے نہیں مان سکتا کہ جذبوں کا یہ الاؤ جب میرے اندر اب تک جل رہا ہے تو تمہارے اندر بھلا یہ کیسے سرد پڑ سکتا ہے؟ ہاں مجھے گھمنڈ ہے اپنی محبت کا جو اب تک تمہیں مجھ سے باندھے ہوئے ہے' چاہے تم کلام کرو یا نہ کرو۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں ان چھ سالوں میں جان چکا ہوں کہ سکندر' فضہ کے بغیر کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں!" اس کے بے یقین چہرے پہ نگاہیں جمائے' شدت جذبات سے سکندر کا گلا بند ہو گیا تو وہ بے اختیار خاموش ہو گیا۔ جبکہ فضہ کا رنگ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ یہ' یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے متوحش چہرے کو دیکھتے ہوئے سکندر نے آہستگی سے اس کا بازو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وہ کسی بت کی طرح بنا پلکیں جھپکائے اپنی جگہ پہ ایستادہ رہ گئی تھی اسے یوں ساکت کھڑا دیکھ کے سکندر نے دھیرے سے اسے پکارا تھا۔

"فضہ! فضہ کیا تم۔۔۔" لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا فضہ کا وحشت زدہ وجود جیسے ہوش میں آگیا تھا۔ گہرے گہرے سانس لیتی وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی تھی اور پھر پلٹ کر بھاگتی ہوئی زینہ عبور کرتی' اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بے یقینی' غصہ' وحشت اور نجانے کون کون سا احساس تھا' جس نے ایک ساتھ مل کر فضہ مسعود پہ دھاوا بول دیا تھا۔

ایک بے وزنی کی کیفیت تھی جو اس پہ طاری ہو گئی تھی۔ اسی خالی الذہنی کے عالم میں وہ اردگرد کی پرواہ کیے بنا' آندھی طوفان کی طرح دو منزلہ سیڑھیاں اترتی نیچے آئی تھی۔ لیکن آگے لاؤنج میں سب کو جمع دیکھ کے اس کے قدم وہیں دہلیز پہ جم گئے تھے اور آنکھیں سامنے نظر آتے منظر پہ گویا۔ ساکت ہو گئی تھیں۔ جہاں زار و قطار روتی ہوئی ثروت بیگم نے مریم کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔

"مجھے معاف کردو۔ مجھے معاف کردو میری جان کہ میں اپنے گھر' اپنے رشتوں کو اپنے ہی چراغ سے نہ بچا سکی۔ میں یہ جان ہی نہ سکی کہ میں جس بیٹی کی تکلیف پہ تڑپ کے تم لوگوں سے سوال جواب کرنے چلی آئی تھی۔ درحقیقت یہ سب اسی کی ایما پر ہوا تھا۔ وہ ہی تھی جس نے رضا کے ساتھ مل کر اس لڑکی کو برہان کے پاس بھیجا تھا۔" وہ ندامت سے چُور لہجے میں بولیں تو ان کے مقابل کھڑی مریم اور نمرہ سمیت باہر کھڑی فضہ بھی اس انکشاف پہ بھونچکا رہ گئی۔

"لیکن' لیکن اس نے یہ سب کیوں کیا؟ اور آپ آج چھ سال بعد یہ بات ہمیں بتا رہی ہیں۔" مریم کے لیے اپنی حیرت اور دکھ پہ قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

"میں تم لوگوں کو کیا بتاتی' ہم پہ تو خود یہ تلخ حقیقت دو ماہ پہلے بالکل اچانک کھلی ہے۔ جب ایک روز سکندر نے زارا کے موبائل میں اس لڑکی اور زارا کی حالیہ تصویریں دیکھ کے اسے پہچان لیا تھا۔ تب زارا نے سکندر کی بازپرس پہ ہم سب پر یہ جان لیوا انکشاف کیا کہ وہ اور رضا ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور انہوں نے ایک دوسرے سے شادی کرنے اور برہان سے زارا کا رشتہ ختم کروانے کے لیے ہی یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔"

نظریں جھکائے انہوں نے زارا کے شوہر اور اپنے داماد کا نام لیا تو نمرہ اور مریم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ جبکہ فضہ کے قدم بے اختیار لڑکھڑا گئے۔

"اتنا بڑا دھوکا!" تیزی سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس نے خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ یہ آج ہو کیا رہا تھا؟ اسے تو ان پے در پے ملنے والے جھٹکوں نے صحیح معنوں میں نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔

"میں سب کے سامنے کیا کہوں اور کس منہ سے کہوں' لیکن یہی حقیقت ہے کہ زارا کی خودغرضی نے نہ صرف میرے بچے کا دل اس کی زندگی برباد کر دی بلکہ میرے بے حد پیارے رشتوں کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ اس نے ہمیں تم میں سے کسی کے سامنے سر اٹھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔"

ثروت خالہ کی روتی ہوئی آواز فضہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے بے اختیار اپنی نڈھال آنکھیں بند کر لیں۔

"اب اس سب کا کیا فائدہ' سب کچھ تو ختم ہو گیا!" کرب سے سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جلن اتر آئی تھی۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ خالہ جان اب اس سب کو دہرانے سے بھلا کیا فائدہ؟" چند لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد اسے اپنے دل کا گلہ مریم کی رنجیدہ آواز میں سنائی دیا تو اس کی بند آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں پہ پھسل آئے۔

"ہاں جو ہونا تھا' وہ تو ہو چکا۔ مگر میں اپنے بچے کا کیا کروں۔ جو اس حقیقت کے کھلنے کے بعد اندر سے بالکل ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔۔۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ جس بہن کی محبت میں اپنا دل برباد کر رہا ہے۔ وہی اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہی ہے۔ وہ اس کی محبت کی قبر پہ اپنی خواہشات کا محل تعمیر کر رہی ہے۔ خودغرضی کے اس کھیل میں ہر طرف سے شکست تو میرے بچے کے حصے میں آئی ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی خواہش کھو دی بلکہ بہن جیسے پیارے رشتے کے ہاتھوں دھوکا کھا کے وہ تو بالکل تہی دامن رہ گیا۔"

ثروت بیگم یک لخت پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں۔ تو وہاں موجود سب کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا جو ایک ماں کو اپنی اکلوتی بیٹی اور ایک بھائی کو اپنی اکلوتی بہن کے ہاتھوں دھوکا کھا کے ہوئی تھی۔

"بیٹا! تم لوگ سکندر کو معاف کردو۔ اس کی جگہ اگر برہان بھی ہوتا تو شاید اس تکلیف کے وقت میں اپنی بہن اور اپنے گھر والوں کا ہی ساتھ دیتا۔ اس نے اپنے کہے کے مطابق نہ صرف اپنے بھائی ہونے کا حق ادا کیا بلکہ فضہ سے دستبردار ہونے کے بعد اس نے حقیقتاً" اس کی جدائی کی ہر اذیت اپنے دل پہ تنہا جھیل لی۔ ہم سب گواہ ہیں اس بات کے کہ ان چھ سالوں میں اس نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائی کا ہر فرض ادا کیا لیکن جہاں اس کی شادی کی بات آئی وہ دامن بچا گیا۔ ہاں لیکن جب ثروت کو ہارٹ اٹیک ہوا تب وہ اپنی ماں کی تکلیف کے آگے بے بس ہو گیا۔

انہی دنوں جب یہ سب اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہے تھے تب اچانک ایک روز ماضی کی سچائی اس پہ آشکار ہو گئی۔ اس وقت جو اس کی حالت ہوئی تھی اس نے زارا جیسی خودغرض اور بے حس لڑکی کو بھی رلا دیا تھا۔ مگر اس نے کسی قیمت پہ اسے معاف نہیں کیا۔ ہم میں سے کسی کے کہنے پہ بھی نہیں۔ ثروت نے بھی بیٹی سے لاتعلقی اختیار کر لی اور وہ یونہی روتی ہوئی واپس

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of 5 Painting
Books in English

Art With You
کی پانچوں کتابوں پر حیرت انگیز رعایت

Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

فی کتاب -/150 روپے
نیا ایڈیشن بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ
-/200 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

انگلینڈ چلی گئی۔ ان دنوں سکندر پہ صرف ایک جنون سوار تھا۔ کسی طرح تم سب سے معافی مانگ کر فضہ پہ اپنی پشیمانی اور محبت واضح کرنا وہ اتنا بے کل تھا کہ بعض اوقات مجھے اس پہ بے اختیار ترس آنے لگتا تھا۔" آغا ماموں کی بھاری آواز فضہ کے کانوں سے ٹکراتی اس کے آنسوؤں میں شدّت لے آئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے دیوار کے سہارے زمین پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"پھر اچانک بریرہ کی شادی کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تب اس کی منتوں پہ ہی میں نے تم سب سے ثروت اور اس کی فیملی کے لاہور میں نہ ہونے کی غلط بیانی کی تھی تاکہ تم سب کے ساتھ ساتھ فضہ بھی یہاں آسکے اور سکندر اور ثروت کو تم سب سے اپنی بات کہنے کا موقع مل سکے۔"

وہ اپنے ماں باپ کی شادی کے چار سال بعد بہت دعاؤں کے بعد ہوا تھا۔ اس حساب سے وہ اپنے ددھیال اور ننھیال دونوں کا بے حد پیارا بھی تھا۔ اس کے دادا کی خواہش تھی کہ اس کا نام فرجاد رکھا جائے جبکہ اس کے نانا نانی چاہتے تھے کہ نواسے کو سکندر کہہ کے پکارا جائے۔ حیدر صاحب اور ثروت بیگم نے کسی کا بھی دل نہیں توڑا تھا۔ انہوں نے بیٹے کا نام فرجاد سکندر رکھ دیا تھا۔ یوں ددھیال والے اسے فرجاد اور ننھیال والے سکندر کہہ کر بلاتے تھے۔

فرہان صاحب اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو چکے تھے۔ لاؤنج میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔ جسے کتنی دیر بعد مریم کی بھرائی ہوئی آواز نے توڑا تھا۔

"پتا نہیں ماموں' یہ سب کیوں ہوا اور کس لیے ہوا۔ لیکن شاید یہ تکلیف دیکھنا ہم سب کے نصیب میں تھا۔ اس لیے ہم چاہ کر بھی سچائی کو وقت سے پہلے نہ پا سکے۔ مجھے سکندر یا خالہ سے کوئی گلہ نہیں۔ وہ واقعی بے قصور ہیں مگر فضہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اسے اپنے رد کیے جانے سے زیادہ دکھ اپنے جذبوں سے سکندر کے انکار کا ہے۔"

"یہ وہم بھی زارا کا پیدا کردہ تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے اور سکندر کو برہان کی طرف سے بدگمان کیا تھا بلکہ فضہ کی طرف سے بھی سکندر کے دل میں وسوسے ڈال دیے تھے تاکہ جب ہم اس لڑکی سے ملیں اور وہ تصویریں دیکھیں تو ہمارے ذہنوں میں یہ خیال پہلے سے موجود ہو کہ برہان اس رشتے سے خوش نہیں۔"

اس کی بات کے جواب میں ثروت اک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئیں تو جہاں مریم ہکا بکا سی رہ گئی وہیں دروازے کے باہر بیٹھی فضہ کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اپنے ہر نقصان ہر تکلیف کا ماتم کرے۔ کوئی انسان بھلا اتنا کیسے گر سکتا ہے کہ ایک صرف اپنی خوشی کو پانے کی خاطر وہ بالکل ہی شیطان کا روپ اختیار کر جائے۔ اتنے پاپڑ بیلنے سے تو بہتر تھا کہ زارا سیدھے سبھاؤ اپنے والدین کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیتی۔ اس وقت کم از کم ایک ہی رشتہ ٹوٹتا' اتنے دل تو برباد نہ ہوتے آفرین تھی ثروت خالہ پہ جو اتنے لوگوں کے درمیان اپنی پیدا کردہ اولاد کی حقیقت کھولنے چلی آئی تھیں' ایک صرف ان کی بدگمانی دور کرنے کے لیے' ورنہ کون بھری دنیا کے سامنے اپنا دامن اٹھانے کی ہمت رکھتا ہے۔

"مریم! تم فضہ کو ساری سچائی بتاؤ گی نا۔ اسے کہو گی نا کہ اس کی خالہ اس سے معافی کی طلب گار ہے۔" وہ مریم کے ہاتھ تھامے ملتجی لہجے میں بولیں تو فضہ کا دل چاہا کہ وہ بھاگ کر ان سے لپٹ جائے مگر وہ ان کی طرح بہادر نہ تھی۔ اس میں اتنے لوگوں کے سامنے اپنے دکھوں پہ آنسو بہانے کا حوصلہ نہ تھا۔ اس لیے وہ خود کو سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سنہری قمقموں سے سجا گھر بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ فضہ کمرے کی بالکونی میں کھڑی نیچے جگمگ کرتے لان اور اردگرد چمکتی دیواروں کو پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ کر ایک

نظر دروازے کی جانب دیکھا تھا اور پھر کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنے دھیان میں وہ دروازے کی جانب بڑھی تھی۔ جب اس کی نظر دروازے کے قریب نیچے کارپٹ پر پڑے ایک چھوٹے سے گلابی لفافے سے ٹکرائی تھی اور وہ بری طرح چونک گئی تھی۔

"یہ' یہ تو۔" اسے بے اختیار وہ دو گلابی لفافے یاد آئے تھے۔

"لیکن یہ یہاں؟" الجھتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کے وہ لفافہ اٹھا لیا تھا جو حسب سابق اوپر سے کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر موجود پرچا نکال کے نظروں کے سامنے کیا۔

میرے دل کی ساری دھڑکنیں
میرے خواب میری چاہتیں
میرے ہم سفر ہیں نام تیرے
میں واروں تجھ پر جان یہ
یہ بصارتیں تجھے سونپ دوں
کوئی دکھ نہ ملے تجھے کبھی
میری روز و شب کی عبادتیں
میرے ہم سفر ہیں نام تیرے

جوں جوں اس کی نگاہیں لفظوں پہ سے پھسلتی گئی تھیں' اس کی الجھن دور اور لبوں پہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی تھی۔ تب ہی دروازے پہ دوبارہ دستک ہوئی تھی۔ لیکن اس بار اسے معلوم تھا کہ باہر کون تھا۔ اس نے آگے بڑھ کے اعتماد سے دروازہ کھولا تھا اور اس کے یقین کے عین مطابق فرجاد سکندر کا مسکراتا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

"تو یہ آپ تھے؟" اس نے مسکراتے ہوئے مقابل کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں جناب کہ تب بریرہ کی مایوں تھی اور آج ہماری مہندی ہے۔ آپ کو اصولاً" آج یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی تو سکندر کے چہرے پہ شوخی اتر آئی۔

"آج ہی تو دن تھا یہاں آنے کا..... ورنہ تمہارا یہ پیلا پیلا روپ میں بھلا زندگی میں دوبارہ کب دیکھ پاتا۔"

اس کے سادہ چمکتے روپ پہ اپنی مخمور نگاہیں جمائے وہ گمبھیر لہجے میں بولا تو اس کی محبت پہ فضہ کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی۔ بے اختیار وہ اپنی پلکیں جھکا گئی تھی اور فرجاد سکندر کو لگا تھا کہ اس سے بڑھ کر خوب صورت نظارہ شاید اس نے کبھی نہ دیکھا ہو۔

☆

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اُردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

صوفیہ سرود

حالِ دل کہوں کیسے

بیٹے پیدا ہوں تو خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مٹھائیاں بانٹی اور مبارک بادیں وصول کی جاتی ہیں۔ انہیں کمائی کا ذریعہ اور بڑھاپے کا سہارا سمجھا جاتا ہے۔ بیٹیاں پیدا ہوں تو دل پر جیسے بوجھ سا آگرتا ہے۔ لوگ بھی خوشی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اکثر تو باقاعدہ اظہار ہمدردی کرنے لگتے ہیں۔

میں اپنے کمرے میں فرش پر بیٹھا ہوں اور کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا جارہا ہے۔ جنوری کی سردی نے مجھے آکاس بیل کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میری ہڈیاں اور ان پر موجود گوشت کا ہر ریشہ برف کی طرح سخت ہورہا ہے۔ مجھے اٹھ کر دروازہ کھولنا ہے، لیکن اس سے پہلے میں آپ کو اپنی کہانی سنادوں۔

ستارہ ہمارے پڑوسی کی بیٹی تھی۔ میرے ماں باپ تب وفات پاگئے، جب انہیں لگا کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا ہے، لیکن انہیں شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا بیٹا ان کے جانے سے بکھر جائے گا۔ ستارہ کے والد صلاح الدین صاحب نے مجھے جذباتی سہارا دیا اور رفتہ رفتہ میں اپنی بکھری زندگی کو سمیٹنے کے قابل ہوا۔ میں نے اپنا سارا دھیان اپنی جاب پر مرکوز کردیا اور تھوڑے ہی عرصے میں میں نے کافی ترقی کرلی۔

ستارہ کو میں تقریباً بچپن سے جانتا تھا۔ ہم اکٹھے کھیلے کودے تھے۔ اپنے جیون ساتھی کے طور پر بھی میں نے اسے ہی چنا۔ میرے کوئی رشتہ دار تو تھے نہیں جو ستارہ کے والد سے اس بارے میں بات کرتے چنانچہ میں نے خود ہی ان سے ستارہ کا ہاتھ مانگا۔ میں ان کے سامنے پلا بڑھا تھا۔ وہ میرے اخلاق و کردار سے بخوبی واقف تھے پھر میں برسرروزگار بھی تھا۔ انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا یوں میری اور ستارہ کی شادی ہوگئی۔

کہتے ہیں، بنانے والا ہم میں کچھ کمیاں چھوڑتا ہے جنہیں ہمارا جیون ساتھی آکر پورا کرتا ہے۔ ہم دونوں بھی ایسے ہی Made for eachother قسم کا جوڑا تھے۔ دو سال خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے گزر گئے اور پتا بھی نہیں چلا۔ پھر ہماری زندگی میں ایک بہت بڑی خوشی آئی جس کا انتظار ہر شادی شدہ جوڑے کو ہوتا ہے۔ ہم ماں باپ کے عہدوں پر فائز ہونے والے تھے۔

میں اور ستارہ بے حد خوش تھے کہ ہماری فیملی مکمل ہونے والی تھی۔ اس کے چہرے پر تو جیسے نور برسنے لگا تھا۔ خیال تو اس کا میں پہلے بھی رکھتا تھا، اب اور زیادہ رکھنے لگا۔ جز وقتی ملازمہ ہٹا کر کل وقتی ملازمہ رکھ لی۔ گھر میں فروٹس، دودھ اور دیگر کھانے پینے کی چیزوں کی بہتات تھی۔ میں اکثر اسے ڈاکٹر سے چیک اپ کے لیے لے جایا کرتا۔ کبھی کبھار وہ اپنی امی کے ساتھ چلی جایا کرتی۔

ایک روز جب میں گھر آیا تو مجھے وہ مخصوص رونق ماند سی لگی جو کہ ہمارے گھر کا خاصہ تھی۔ میں بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہ جو نڈھال سی بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے گھر آنے پر جو چمک سی آجاتی تھی، وہ مفقود تھی۔ کپڑے بھی شکن آلود تھے اور بال بھی سنورے نہ تھے۔

"ستارہ! یہ کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔ کیا ہوا ہے؟" میری آواز میں فکرمندی تھی، جو ہر محبت کرنے والے شوہر کی آواز میں ہوتی ہے۔

جواباً اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ اس نے اپنا سر میرے شانے کے ساتھ ٹکا لیا اور میں نے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کردیا۔

"آج میں امی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ اس نے الٹرا ساؤنڈ کرنے کے بعد بتایا کہ۔" وہ ذرا سا رکی تو میرا حلق خشک ہونے لگا۔

"سب ٹھیک تو ہے نا ستارہ! بچہ تندرست ہے نا؟" میں نے بے صبری سے بولا۔

"ہاں بچہ بالکل تندرست ہے۔" وہ بولی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

"تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ اتنی پریشان کیوں ہو۔"

"دراصل وہ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ۔ کہ بیٹی ہے۔"

اس نے کچھ اس طرح سے سر جھکا کر کہا جیسے کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے۔ مجھے سن کر زور سے ہنسی آگئی۔

"حد ہے ستارہ! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"آپ کو سن کر افسوس نہیں ہوا۔" اس نے بڑی بے یقینی سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پاگل ہو کیا۔ افسوس کس بات کا خوشی کی خبر سن کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے نہ کہ افسوس کا۔" میری آواز پر جوش تھی، لیکن اس پر تو جیسے قنوطیت چھائی ہوئی تھی، پھر میں اس کی وجہ بھی سمجھ گیا۔

"ستارہ! بیٹا ہو یا بیٹی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو بیٹوں پر فخر کرتے ہیں اور بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔"

"اپنے ذہن میں جو بھی خدشات ہیں، وہ نکال دو۔ میں ان روایتی مردوں میں سے نہیں ہوں، جو بیویوں کو بیٹی پیدا ہونے پر مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔"

حقیقتاً" میرے نزدیک بیٹی اور بیٹا برابر تھے۔ میری بات سے اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اس کے چہرے کی رونق اور آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔

اور پھر کچھ عرصے بعد جب میں ایک موہنی سی پیاری سی گلابی گلابی گالوں والی گڑیا کو بازوؤں میں لیے کھڑا تھا تو لگ رہا تھا جیسے مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو بیٹی پیدا ہونے پر مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ میں تو اتنا خوش تھا کہ جیسے ساری کائنات کی خوشیاں مجھے مل گئی ہوں۔

میں نے اور ستارہ نے اس کا نام کائنات رکھا۔ بھورے بال اور نیلی آنکھیں، سرخی مائل گلابی ہونٹ اور ریشمی پلکیں۔ وہ بہت پیاری تھی۔ ایسے من موہنے نین نقش ایسی پیاری صورت۔ وہ ہماری شہزادی تھی۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے گھر میں رونق اور خوشیوں کی بہار آگئی۔ ہم دونوں اس کے لیے ڈھیروں شاپنگ کرتے، کپڑے خریدتے، کھلونے لیتے اور سارا دن اسے بازوؤں میں لیے باتیں کرتے، جبکہ وہ ابھی انہیں سمجھنے کے قابل بھی نہیں ہوئی تھی۔

پھر وہ توتلی زبان میں باتیں کرنا شروع ہوئی۔ "ابو تی ۔۔۔ امی تی" کہتی ہوئی وہ بہت پیاری لگتی۔ چلنا شروع کیا تو گھر میں ہر چیز کی جیسے شامت آگئی۔ ہر وہ چیز جس تک اس کا ہاتھ پہنچ سکتا تھا، وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی۔ ستارہ نے ڈیکوریشن پیسز اور کچن کے تمام ٹوٹنے والے برتن ایسی جگہوں پر رکھ دیے جہاں اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔

ہمارے گھر جو بھی آتا، وہ ہر ایک سے بہت جلدی مانوس ہو جاتی۔ اپنی باتوں سے وہ سب کا دل موہ لیتی۔ میں آفس سے آتا تو دروازہ کھلتے ہی وہ نیلی پیلی فراک میں ملبوس بھاگی ہوئی آتی اور میں اسے بازوؤں میں اٹھا لیتا۔ جتنی دیر میں کھانا کھاتا وہ میرے پاس بیٹھ کر بنا نہیں کون کون سی باتیں کرتی رہتی اور میں ہوں ہاں کرتا رہتا۔ میں اپنے دن کا بیشتر وقت اس کے ساتھ گزارتا۔ میں ستارہ اور کائنات اکثر نزدیکی پارک میں شام کو جایا کرتے، جہاں وہ دیگر بچوں کے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتی۔

قدرت خدا کی کہ کائنات کے بعد ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور ہماری ساری توجہ اور پیار بس اسے ہی مل گیا۔ ہمارے گھر آنے والی بڑی بوڑھیاں بیٹا نہ ہونے پر اظہار افسوس کرتی تھیں۔ ان کی باتیں انوکھی ہوتی تھیں جنہیں سن کر میں اور ستارہ ہنسنے لگتے تو کبھی کبھار غصہ آجاتا۔ کبھی کوئی بزرگ خاتون کہتیں "پتر میٹھے میوے، اللہ ہر کسے نوں دیوے" اور کوئی کہتیں "جمن پتر تے ونڈو موتی چور لڈو" لیکن کوئی یہ نہ کہتا کہ بیٹی اللہ کی رحمت ہے۔

ستارہ کی ایک رشتہ دار بوا کہتیں کہ "بیٹے ماں باپ کا بڑھاپا سنبھالتے ہیں اپنی کمائی ان پر خرچ کرتے ہیں جبکہ بیٹیاں یہ سب کرنے سے قاصر ہوتی ہیں میرا نظریہ

نظر اس سے قطعی مختلف تھا۔ میں نے بہت سے بیٹوں کو دیکھا تھا جن کے ماں باپ رُل رہے تھے۔ ان کی دیکھ بھال ان کی بیٹیاں کرتی تھیں۔ یہ میرا ذاتی خیال تھا کہ اللہ نے بیٹیوں کو زیادہ رحم دل بنایا ہے۔ وہ والدین کی زیادہ فرماں بردار اور خدمت گزار ہوتی ہیں۔ رہی بات کمانے کی تو آج کل تو ہر دوسری لڑکی کام کر رہی تھی۔

کائنات کب میٹرک میں آئی اور کب اس نے انٹر کیا۔ پتا ہی نہ چلا۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی اس کی غیر نصابی سرگرمیاں بھی قابل ذکر تھیں۔

ہمارے ایک کمرے کی پوری ایک سائیڈ پر الماری بنی ہوئی تھی جس میں اس کی شیلڈز، ٹرافیاں اور دیگر پرائزز سجے ہوئے تھے۔ ستارہ نے اسے گھرداری کی تربیت بھی دینا شروع کر رکھی تھی۔ اکثر اتوار کو وہ کوئی نئی ڈش ٹرائی کرتی اور اسے میرے پاس لے کر آتی اور کہتی۔

"ابو جی! آپ کے لیے سرپرائز ہے۔ اپنی آنکھیں بند کریں۔"

میں آنکھیں کھولتا تو شان دار سی سجاوٹ لیے ڈش میرے سامنے ہوتی جو ہمیشہ ذائقے میں بھی لاجواب ہوتی۔ اس کا داخلہ بی ایس میں ہوا تو اس نے شہر کے بہترین ہوٹل میں ڈنر لیا۔ ڈھیر ساری شاپنگ کی اس کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی انجوائے کیا۔ ہم دونوں کی خوشی تو اس کی خوشی میں تھی۔

ہم ایک پرفیکٹ فیملی تھے، جہاں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ چھوٹے موٹے نشیب و فراز بھی آتے رہے، جن سے خوشیوں کا احساس مزید بڑھ جاتا تھا۔ ہمارا کوئی بیٹا نہ تھا، لیکن ہمیں بیٹی ہونے کا کوئی غم نہ تھا، جس طرح عام طور پر جاہل لوگوں کو ہوتا ہے۔ میں خوش تھا کہ اللہ نے مجھے بیٹی دی۔

اور پھر ہماری زندگی میں نشیب آیا۔ جس کمپنی میں، میں کام کر رہا تھا، وہ دیوالیہ ہو گئی۔ اچھی بھلی چلتی گاڑی اچانک رک جائے اور سفر کرنے کا کوئی اور ذریعہ بھی نہ ہو تو بندہ جس طرح محسوس کرتا ہے، میں نے ویسا ہی محسوس کیا۔ شکر ہے کہ میری تھوڑی بہت بچت موجود تھی، میں نے ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور بنا لیا۔ اس دوران ستارہ اور کائنات نے مجھے جو مورل سپورٹ دی اس نے مجھے کام کرنے کی خوب ہمت دی۔

ایک سال کے قلیل عرصے میں اسٹور کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا۔ کائنات کا چوتھا سمسٹر تھا۔

ایک روز یونہی میں کمرے میں بیٹھا بور ہو رہا تھا۔ ستارہ کچن میں کسی کام میں مصروف تھی اور کائنات یقیناً" اپنے کمرے میں۔ میں اٹھ کر کائنات کے کمرے میں چلا گیا، لیکن کمرا خالی تھا شاید وہ کہیں اور تھی۔ میں یونہی اس کے کمرے کی چیزوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ کمرا بے حد صاف ستھرا تھا۔ کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک سائیڈ پر موجود ٹیبل پر چند بکس موجود تھیں۔ پین ہولڈر میں وہ نفیس پین جو اس کی پچھلی سالگرہ پر ستارہ نے اسے گفٹ کیا تھا۔ میں آگے بڑھ کر بکس دیکھنے لگا جو یقیناً" اس کے کورس سے متعلق تھیں۔ ضخیم کتابیں جو غیر ملکی مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں۔ یقیناً" بہت مہنگی تھیں۔ اچانک مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ کائنات نے اپنی سمسٹر فیس کے علاوہ مجھ سے کبھی پیسے نہیں لیے تھے۔ اس کا مجھے اچھی طرح علم ہے۔ اور میں کتنا لاپروا رہا ان اخراجات سے۔۔۔ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے کہ وہ اتنی مہنگی کتابیں خریدتی۔

گھر کا خرچ میں ہی چلاتا تھا۔ ستارہ کے پاس بھی اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ کائنات کو دیتی۔ میں پریشان سا سوچ رہا تھا۔ تب ہی کائنات اپنی جھونک میں اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا ابو!" مجھے گم صم سا کھڑا دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کائنات! تم نے آج تک مجھ سے سمسٹر فیس کے علاوہ کبھی پیسے نہیں لیے، تو تم اپنے دیگر اخراجات کیسے پورے کرتی ہو۔" اس کی رنگت ذرا سی اڑی یا شاید مجھے محسوس ہوا۔

"دیگر اخراجات ہوتے کون سے ہیں ابو! میں نے یونیورسٹی سے کبھی کچھ کھایا ہی نہیں۔ ہمیشہ گھر آکر ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھانا کھاتی ہوں۔"

"اور یہ اتنی مہنگی بکس کیسے خریدیں؟" میں نے فوراً" پوچھا۔

"بکس۔ ابو وہ۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی' لیکن میں اس کے جواب کا منتظر رہا۔

"میں ایک اکیڈمی میں ٹیوشن پڑھاتی ہوں یونیورسٹی کے بعد۔" اس نے مجرمانہ انداز میں اعتراف کیا۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں۔" میں حیرت سے گنگ کھڑا تھا۔

"میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آپ پر کام کا بہت لوڈ تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ مجھے کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ آپ کہتے' جتنے پیسے چاہئیں مجھ سے لے لو۔"

"ہاں تو اس میں غلط کیا ہے؟" میں نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"ابو! میری یونیورسٹی کی فیس پہلے ہی اتنی زیادہ ہے۔ میں آپ پر اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔" اس کے اتنے نرم انداز پر میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا اور اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کائنات! تم میرے لیے بوجھ نہیں ہو۔ تم اور ستارہ میری فیملی ہو' ایک خوب صورت ذمہ داری۔ تم فوراً" سے پہلے ٹیوشن چھوڑ دو تمہیں جب اور جتنے پیسے چاہئیں' مجھ سے بولو۔"

"ابھی تو نہیں چھوڑ سکتی ابو! یہ مہینہ ختم ہو لینے دیں۔" میری سعادت مند بیٹی نے جواب دیا تو میں مسکرا دیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ستارہ کو پہلے سے معلوم تھا بلکہ کائنات نے ٹیوشن سینٹر جوائن کرتے وقت ماں کو بتایا تھا۔ میں نے اس کی بھی خوب خبر لی۔

شاید میں ہی جاب ختم ہونے کے بعد سے گھر کے معاملات سے لاپروائی برتنے لگا تھا اور پھر اسٹور اسٹیبلش کرنے میں' میں نے گھریلو معاملات سے کافی حد تک منہ موڑے رکھا تھا۔

زندگی میں خوشیوں اور غموں دونوں کا گزر ہے۔ جو لوگ صرف خوشی چاہتے ہیں' وہ زندگی کی بہت بڑی حقیقتوں کو نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر تکلیفیں اور غم نہ ہوں تو خوشی کا وجود بھی مٹ جائے۔ اجالوں کا وجود اندھیروں سے ہوتا ہے۔ مالی مشکلات کو بھی ہم نے رب کی رضا سمجھ کر قبول کیا تھا۔ شکر ہے یہ معاملات بھی کافی حد تک سنبھل گئے تھے' لیکن اس ایک ڈیڑھ سال میں ستارہ اور کائنات نے خاصا صبر کا مظاہرہ کیا۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے کوئی چیز نہ خریدی' کپڑا نہ جوتا۔

اور پھر ہماری ہنستی بستی فیملی کو ایک اور دھچکا لگا۔ ستارہ کے دونوں گردے ناکارہ ہوگئے۔ نجانے کب اور کیسے انہوں نے کام کرنا چھوڑا تھا۔ ہم نے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کروادیا۔ میری تو حالت بری تھی۔ ستارہ اور کائنات میری زندگی کے ستون تھے۔ میری خوشی' سکون اور آسودگی ان سے وابستہ تھی۔

ڈاکٹر نے فوراً" گردوں کا ٹرانسپلانٹ تجویز کیا۔ میں اسے گردہ دینا چاہتا تھا مگر جب میں نے اپنے ٹیسٹ وغیرہ کروائے تو رپورٹ میں پتا چلا کہ میں اسے گردہ نہیں دے سکتا تھا۔ میرا بلڈ گروپ نہ صرف مختلف تھا بلکہ ٹشوز بھی کام صحیح نہیں کرتے تھے اور اگر گردہ دے بھی دیا جاتا تو وہ ٹرانسپلانٹ ہونے کے بعد دوبارہ ناکارہ ہوجاتا۔

پھر کائنات نے اپنا ایک گردہ ستارہ کو دیا۔ وہ دن بہت کٹھن تھے' لیکن ایک آندھی تھی' گزر گئی۔ روپیہ پیسہ خرچ ہوا مگر ستارہ کی زندگی سے زیادہ قیمتی تو کچھ بھی نہ تھا۔ کائنات کی اسٹڈی میں وقفہ آگیا' لیکن وہ ذہین تھی' اس نے کمی کو جلد ہی پورا کرلیا۔ ہماری زندگیوں میں پھر سے ٹھہراؤ آگیا۔ اسٹور کی آمدنی کچھ زیادہ تو نہ تھی' لیکن اتنی ضرور تھی کہ گھر کا خرچ چل رہا تھا اور کائنات کی یونیورسٹی کی فیس پوری ہو رہی تھی۔

پھر کائنات کا ایس بھی مکمل ہوگیا اور اسے فوراً" جاب مل گئی اس کے رشتے بھی آنے لگے۔ میں تو جیسے

بوکھلا گیا۔ یہ وقت بھی آنا تھا میں تو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ بیٹی کی رخصتی خوشی کے ساتھ ایک تکلیف دہ عمل بھی ہے' لیکن ایک نہ ایک دن تو یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔

اور پھر ایک لڑکا مجھے اور ستارہ کو کائنات کے لیے مناسب لگا۔ اچھی ملازمت کر رہا تھا اور خوش شکل' بااخلاق بھی۔ کائنات کی رضامندی سے ہم نے اس کا رشتہ طے کردیا۔ ستارہ نے بھی اپنے تئیں کمیٹی ڈال رکھی تھی اور میرے پاس بھی کچھ جما جتھا تھا۔

ہم نے اس کا جہیز تیار کیا جس میں ضرورت کی قریباً" ہر چیز موجود تھی اور دعاؤں تلے رخصت کردیا۔ اس کے اس گھر سے جانے کے بعد یہ احساس مزید شدت سے ہوا کہ بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ کائنات کے ہونے سے گھر میں جو رونق ہوتی تھی وہ اب مفقود ہو چکی تھی۔

میں اسٹور سے گھر آتا تو کائنات مجھے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیتی تھی۔ پانی چائے کھانا۔ کسر تو ستارہ بھی کوئی نہیں چھوڑتی تھی' لیکن کائنات آخر کائنات ہی تھی۔ وہ تو ہر چیز بہم پہنچانے میں اتنی عجلت کا مظاہرہ کرتی جیسے تاخیر گناہ ہو۔ اس کی رخصتی کے بعد ہمارے گھر میں عجیب اداسی سی در آئی۔ ہم دو ہی تو فرد ہوتے تھے گھر میں۔ ستارہ کے اکیلے پن کا سوچتے ہوئے میں جلدی واپس آجایا کرتا تھا۔ ویسے میں نے ایک ایماندار شخص ملازمت پر رکھ لیا تھا جو پہلے سے موجود دو ملازموں کی سپروژن بھی کرتا تھا اور کام بھی۔

کائنات اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس کا اندازہ ہمیشہ اس کے رویے سے ہوتا تھا۔ کسی رشتہ دار کے توسط سے پتا چلا کہ اس کے سسرالیوں میں سے کسی نے ایک دفعہ کہا کہ "گاڑی نہیں تو ہمیں ایک موٹر سائیکل تو دینی ہی چاہیے تھی' لیکن ہم نے کبھی ایسی بات نہ سنی نہ کبھی کائنات نے بتایا۔ وہ جب جب ہم سے ملنے آتی تھی ہمیں اندازہ ہوتا کہ وہ ہمیں اور اپنے گھر کو کتنا مس کرتی تھی۔ ہم بھی تو اسے یاد کرتے تھے۔ دن میں کئی بار رات کو سونے سے پہلے تک۔ اور جب ستارہ اپنے اور میرے لیے رات کو دودھ گرم کرکے لاتی تو مجھے شدت سے اس کی یاد آتی۔ اس سے پہلے یہ ڈیوٹی کائنات نے سنبھالی ہوئی تھی۔ اور پھر ہم دونوں اس کی باتیں کرتے کرتے سو جاتے تھے۔

میرے کمرے کا دروازہ بری طرح دھڑدھڑایا جا رہا تھا۔ لگتا ہے اب کہ ٹوٹ ہی جائے گا' لیکن ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ میری کہانی باقی ہے۔ مجھے آپ کو سمجھا لینے دیں کہ بیٹیاں نہیں ہونی چاہئیں اور کیوں نہیں ہونی چاہئیں؟

کائنات کی شادی کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں اور ستارہ محض دو مرتبہ اس سے ملنے اس کے سسرال گئے۔ البتہ ہم اس کی خیریت روز ہی فون پر دریافت کرلیا کرتے تھے۔ ایک دن میں اسٹور سے واپس آیا تو ستارہ بجھی بجھی سی لگی۔ میرے دریافت کرنے پر بولی۔

"میں نے گھنٹہ بھر پہلے کائنات کو فون کیا۔ فون اس کی نند نے اٹھایا۔ دو چار منٹ آئیں بائیں شائیں کرنے کے بعد کائنات سے بات کروائی۔ ویسے تو وہ ہمیشہ کی طرح بول رہی تھی' لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اسے ضرور کوئی پریشانی ہے۔" ستارہ کی آواز سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر میں بھی بے چین ہوگیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائیں' لیکن پھر کل پر موقوف کردیا۔

اگلے دن ہم دونوں اس کے گھر پہنچ گئے۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی سامنے برآمدے میں پلنگ پر نظر پڑی' جہاں کوئی خاتون دراز تھیں اور دروازے کی جانب پشت کیے کوئی ان کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھا۔

"کیا مرے مرے ہاتھوں سے دبا رہی ہو۔ ذرا اچھی طرح دباؤ۔" چند قدم برآمدے کے نزدیک بڑھانے پر ہمارے کانوں میں آواز پڑی جو یقیناً" کائنات کی ساس کی تھی۔ دبانے والی نے ذرا کی ذرا ایک سائیڈ پر دیکھا تو میں اور ستارہ بھونچکا رہ گئے۔ وہ کائنات تھی۔

ہم برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ کائنات نے ہمیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر ہمارے پاس آئی۔ ستارہ سے گلے مل کر اس نے مجھ سے ماتھے پر پیار لیا تو معلوم ہوا اس کا جسم تو بخار میں دہک رہا تھا۔ اس کی ساس بھی اب اٹھ بیٹھی تھی اور قدرے گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

کائنات ہماری تواضع کے لیے کچن میں جانے لگی تو میں نے بازو سے پکڑ کر اسے ساتھ والی کرسی پر بٹھادیا۔ کائنات کی ساس بھی ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

"بہت خوشی ہوئی آپ لوگ آئے۔ ایک آدھ فون ہی کردیتے ہمیں یا شاید آپ نے کائنات کو کیا ہی ہوگا۔" وہ بولی، لیکن اس کے الفاظ کے برعکس اس کے تاثرات سے کوئی خوشی ظاہر نہیں ہورہی تھی۔

اس کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی، لیکن ہر بات اس بات پر منتج ہوتی کہ انہوں نے ہماری بیٹی کو بڑے عیش و آرام میں رکھا ہوا ہے اور اسے ہر آسائش میسر ہے۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے اس کی باتیں سننے میں مصروف تھے پھر یہ خاموشی ستارہ نے توڑی۔

"کائنات! تمہیں بخار ہے۔" ستارہ کا لہجہ کڑا تھا' یقیناً" اس نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

"نہیں امی جی! میں ٹھیک ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر جو گھبراہٹ آئی۔ اس نے مجھے ہلکا سا غصہ دلادیا۔ وہ کس سے گھبرا رہی تھی۔

"ادھر لاؤ دکھاؤ مجھے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"اسے بخار ہے برسوں سے' پھر ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا۔ اب تو بالکل ٹھیک ہے۔" ان کی ساس جلدی سے بول اٹھی۔

"ٹھیک تو وہ ابھی بھی نہیں ہے۔" ستارہ نے کہا۔

اتنے میں کائنات کی نند اسکواش لے کر آگئی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں کائنات کا شوہر بھی آگیا۔ اس کے تاثرات بھی کم و بیش باقی گھر والوں جیسے ہی تھے۔ باقی سب کی طرح اسے بھی ہمیں دیکھ کر جیسے سانپ سونگھ گیا۔

ستارہ کائنات کو لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی اور میں باہر رہ گیا۔ کائنات کا شوہر مسلسل ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں مصروف تھا' لیکن میرا دھیان کہیں اور ہی تھا۔ کچھ دیر بعد ستارہ اکیلی ہی کمرے سے برآمد ہوئی اور بالکل عام سے انداز میں کائنات کی ساس سے مخاطب ہوئی۔

"کافی دن ہوگئے ہیں کائنات رات ٹھہری نہیں ہمارے گھر۔ اس لیے ہم اسے ساتھ لے جاتے ہیں چند دن رہ کر آجائے گی۔" اتنا سنتے ہی ساس صاحبہ کا تو منہ بن گیا' لیکن بیٹا جلدی سے بولا۔

"جی آنٹی ضرور۔ چند دن کائنات آپ لوگوں کے پاس رہ لے گی تو اچھا محسوس کرے گی۔"

اور یوں ہم اسے لے کر واپس گھر آگئے۔ اتنی آسانی سے تو اس نے بھی کچھ نہ بتایا اور جب میں زندگی میں پہلی مرتبہ ... اس سے بے حد سختی سے مخاطب ہوا تو وہ رو پڑی۔

سسرالیوں کے طعنے اور چھوٹے چھوٹے نشتر تو بہت پہلے ہی شروع ہوگئے تھے۔ وجہ تھی جہیز کا کم ہونا۔ اے سی' کار' موٹر سائیکل جیسی چیزوں کا نہ ہونا اور ہم نے سونا بھی تو محض پانچ تولے ہی ڈالا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے شوہر نے اسے چھوٹی چھوٹی بات پر تھپڑ مارنا شروع کردیے تھے اور دو دن قبل جب وہ کچن میں کام کررہی تھی اور پیاس لگنے پر کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگی تو اس دوران اس کی نند نے ذرا سا کچن میں جھانکا اور واپس جاکر نجانے کیا بولی کہ ساس صاحبہ تن فن کرتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں کہ "بی بی پہلے کام ختم کرلو' پھر اپنے کمرے میں جاکر خوب آرام کرلینا۔ کچن میں بھی آکر سونا ہی ہے تو جہیز میں ایک نوکرانی بھی لے آتی تھی اماں ابا سے کہہ کر۔" پھر رات کو جب بیٹا آیا تو بات کو نجانے کیا سے کیا بنا کر کان بھرے کہ وہ بیوی سے تکرار کرنے لگا۔ کائنات نے صفائی دی' لیکن وہ اسے پیٹنا شروع ہوگیا۔ اسے بخار تھا' لیکن گھر میں ہی پیناڈول کھلا دی گئی۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی زحمت کسی سے نہ ہوئی۔ اس دوران وہ کام بھی کرتی رہی' ساس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹانگیں بھی دباتی رہی اور مفت کی گالیاں بھی کھاتی رہی۔

میں اور ستارہ ساری بات سن کر ششدر رہ گئے۔ کس قدر جاہل لوگ تھے بات بات پر ہاتھ اٹھانے والے۔ کائنات کی تربیت پر مجھے یقین تھا۔ فرماں برداری، ہمدردی اور برداشت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ زبان چلانے والی تھی، نہ نخرے دکھانے والی کام چور۔ تب ہی میں نے اسے واپس نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایسے کیسے بھیج دیتا اپنی پھول سی بیٹی کو پٹنے کے لیے۔

ہفتہ گزرا تھا کہ اس کے ساس سسر اسے لینے آئے کہ بیٹے کی ملازمت کا مسئلہ تھا سو وہ نہ آسکا۔ میں نے ان سے دوٹوک بات کی کہ انہیں جہیز کی کمی بیشی کی وجہ سے کوئی تکلیف ہے تو مجھ سے بات کریں۔ اپنے زبان کے جوہر اور ہاتھوں کا زور میری بیٹی پر نہ آزمائیں۔ پہلے تو خوب چڑھے پھر کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔

کائنات کو میں نے بھجوا دیا اور اس سے اگلے ہفتے ایک اے سی بھی بھجوا دیا۔ آخر میرا سب کچھ کائنات کا ہی تو تھا بس جس وقت اس کا بیاہ ہوا تھا، تب ہاتھ تنگ تھا۔

لیکن اس کے بعد تو ایک طویل سلسلہ تھا فرمائشوں کا۔ اگلے چھ ماہ میں، میں نے اسے ایک فریج بھجوایا اور موٹر سائیکل کے لیے پیسے جمع کرنے لگا، لیکن سکون نہ رہا تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ نجانے کائنات کس حالت میں ہوگی۔

ستارہ بھی ہر وقت بے چین سی رہتی۔ رات کو اکثر جاگ اٹھتی۔ مجھ سے کچھ کہتی تو نہیں تھی، لیکن میں اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ نجانے یہ دونوں ماں بیٹیاں کس مٹی سے بنی ہوئی تھیں۔ ہر چیز اندر اندر چھپائے پھرنا۔

میری بات بس ختم ہونے والی ہے۔ آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا ویسے بھی میں اب کمرے میں بیٹھا تو نہیں رہ سکتا نا۔

ایک دن کائنات اور اس کا شوہر آئے۔ وہ پہلے کی نسبت بہت کمزور اور زرد سی لگ رہی تھی۔ اس کا شوہر تو کھانا کھا کر چلا گیا کہ دو دن بعد آؤں گا اور اپنے ساتھ بائیک پر لے جاؤں گا۔ اس کے پاس ذاتی بائیک تو تھی نہیں، ظاہر تھا کہ وہ کس بائیک کی بات کر رہا تھا۔ یہ ایک طرح کی بلیک میلنگ تھی۔

میں اگرچہ پیسے جمع کر رہا تھا، لیکن ابھی موجودہ رقم مطلوبہ رقم سے کافی کم تھی۔ میں نے کائنات کو بتایا کہ "بیٹا! جیسے ہی رقم پوری ہوگی، میں بائیک خرید کر بھجوا دوں گا۔" میری بات سن کر وہ رو دی۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی تھی، میں نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"میرا جو کچھ ہے، سب تمہارا ہی تو ہے۔ والدین کا سب کچھ اولاد کا ہوتا ہے اور اگر میں اپنی آمدنی اپنی کائنات پر خرچ نہیں کروں گا تو کس پر کروں گا۔"

اس کے جانے سے ایک دن قبل میں نے اور ستارہ نے اسے بازار جا کر شاپنگ کروائی۔ پرانے دنوں کی یادوں کو تازہ کیا جب ہم یونہی اکٹھے گھوما کرتے تھے۔

کائنات ایک مرتبہ پھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد عجیب بے کلی سی تھی جس نے ہم دونوں کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ اگلی رات عجیب و غریب خواب ڈراتے رہے۔ ستارہ بھی پریشان تھی اور میرا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ جن کی بیٹیاں پڑھے لکھے جاہلوں کے ہتھے چڑھ جائیں، جو بلیک میلر بھی ہوں۔ ان کا ایسا ہی حال ہوا کرتا ہے۔

اگلے دن فون کی گھنٹی بجی اور ہم دونوں شہر کے بڑے اسپتال میں پہنچ گئے۔ ستارہ بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے اس وقت کس طرح سے خود کو سنبھال رکھا تھا یہ میں جانتا تھا۔ اور پھر ہم جہاں پہنچے وہاں ہر طرف جلے گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے اسٹریچر پر ایک وجود تھا۔ نجانے کسی عورت کا تھا یا مرد کا۔ بال جل کر چر مرا گئے تھے۔ شاید کوئی لڑکی رہی ہوگی۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آوازیں بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔

پھر مجھے لگا کہ وہ کائنات ہے۔ "مستغفر اللہ۔ اللہ

نہ کرے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں سامنے پڑے وجود کو ٹٹولنے لگا۔ جلا منہ سیاہ گوشت ... کچھ بھی تو نہ بچا تھا۔ آنکھ ناک، ہونٹ سب برابر ہو گئے تھے۔

میری کائنات درہم برہم ہو رہی تھی۔ کوئی اپنی بیٹی کو کیسے نہیں پہچان سکتا۔ وہ جس کو گود میں کھلایا ہو جس کے سنہری بالوں میں اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے کنگھی کر کے لال، پیلی، ہری پونیاں باندھی ہوں۔ جو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں پانی کا گلاس آپ کے لیے لائے۔ جس کے ساتھ آپ نے زندگی کے خوب صورت ترین رنگ محسوس کیے ہوں۔ اسے آپ کیسے بھول سکتے ہیں۔

وہ کچے پکے، گلے سڑے گوشت کا ڈھیر کائنات ہی تھی۔ ایک سیاہی تھی جس نے اس کے کنول ہونٹوں، روشن آنکھوں اور سپید رنگت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بچپن میں ایک دفعہ ستارہ کی غلطی سے کائنات کا ہاتھ جل گیا تھا تو وہ "ابو جی... ابو جی" کہتی روتے ہوئے میرے پاس آئی تھی اور میں نے کریم لگاتے لگاتے ستارہ کو کتنا ہی ڈانٹ دیا تھا۔ اب اس آگ میں جھلستے ہوئے اس نے نجانے کتنی مرتبہ مجھے پکارا ہوگا۔ کتنا روئی ہوگی... کچن میں کام کرتے ہوئے آگ بھڑکی اور بس وہ جل گئی۔ وہ باہر کیوں نہیں نکلی... اس کی مدد کرنے... آگ بجھانے کوئی اندر کیوں نہ گیا۔

اور میں کتنا بدنصیب باپ ہوں... اس کی "ابو جی... ابو جی" کی پکار میں نے کیوں نہ سنی، لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھے پکارتی اور میں اس کی پکار نہ سنتا اس کی انگلی نہ پکڑ لیتا۔ میں کس کا گریبان پکڑوں... کہاں سے اپنی بیٹی لے کر آؤں... اپنی بیٹی کا لہو کس کے ہاتھ پر تلاش کروں...

میں اسے گھر لے آیا۔ ایک مرتبہ پھر اسے سجا سنوار کر اس کی ڈولی کہاروں کے ہاتھ دوں گا اور ایک مرتبہ پھر وہ اپنے لکھی بابل کو چھوڑ کر بدیس سدھار جائے گی۔

اب تو آپ کو پتا چل گیا ہوگا بیٹیاں کیوں نہیں ہونی چاہئیں... وہ بے وفا ہوتی ہیں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ سارا غم اندر اندر رکھے جیے جاتی ہیں اور ماں باپ کو بھنک تک نہیں پڑنے دیتیں اور کبھی ان کے جسم پر لگنے والے زخموں کی تعداد ماں باپ کو پتا چل جائے تو ان کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ ان کی سسکیاں کانوں پر ہتھوڑے کی طرح برستی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ والدین بیٹیوں سے نہیں، ان کے نصیبوں سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے ان کی موت کا ماتم ان کی پیدائش پہ کر لیتے ہیں۔

اب میں اپنی کائنات کو اس دیس بھیجوں گا، جہاں اس کے لیے کوئی تکلیف ہوگی نہ جلن، صرف ٹھنڈک اور راحت ہوگی۔

اب مجھے دروازہ کھولنا ہے اور باہر موجود کائنات کو مٹی کے سپرد کرنا ہے۔

"سونا بھی دینا، روپا بھی دینا
ایک نہ دینی سنگ مورے کنگھی
ساس نندمارے بول رے لکھی بابل مورے
بھائیوں کو دیے بابل محلے دو محلے
ہم کو دیا پردیس رے لکھی بابل مورے
کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے..."

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
تم ہنستی اچھی لگتی ہو
فرحت اشتیاق
قیمت -/300 روپے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسلسل چالیس منٹ تک ٹریفک جام میں پھنسے رہنے کے بعد کسی قدر کھلی سڑک پر آکر میں نے ایک گہری سانس کے ذریعے پھیپھڑوں کو نسبتاً" صاف ہوا سے بھرنے کی کوشش کی اور گاڑی کا رخ گھر کی جانب کردیا جو اب قریب آچکا تھا اور جہاں پہنچنے کا خیال ہی راستے کی ساری کوفت اور تھکن دور کرنے کے لیے کافی تھا کیونکہ گھر پر زارا جیسی خوب صورت بیوی اپنی تمام تر شوخیوں سمیت میری منتظر تھی۔

ہماری شادی کو تین سال ہوچکے تھے اور ہمارا ایک دو سال کا بیٹا سنی تھا مگر زارا میں ان تین سالوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ نہ صرف ایک بچے کی ماں بننے کے بعد بھی پہلے کی طرح دبلی پتلی تھی بلکہ اس کے

ثریا انجم

دراوڈ دالور

مزاج میں شوخی اور شرارت بھی اسی طرح قائم تھی جیسی کہ ایک بیس بائیس برس کی لڑکی میں ہوتی ہے۔ وہ ہر شام اسی طرح سج سنور کر تیار ہوتی تھی جیسے شادی کے اولین دنوں میں لڑکیاں ہوتی ہیں حالانکہ میں اسے زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا کیونکہ آفس کی جاب کے بعد مجھے اپنے چھوٹے سے میڈیکل اسٹور پر جانا ہوتا تھا جسے دن میں احمد نامی لڑکا سنبھالتا تھا اور شام میں آفس سے آنے کے بعد گھر سے فریش ہوکر میں چلا جاتا تھا اور پھر رات گیارہ بجے اسٹور بند کرکے گھر آتا تو اس قدر تھک چکا ہوتا تھا کہ جلد از جلد کھانا کھا کر بیڈ پر دراز ہونے کی فکر رہتی تھی۔ ایسے میں جب تک زارا اپنے کاموں سے فارغ ہوتی، میں گہری نیند سو چکا ہوتا

اس کے باوجود زارا کبھی شکایت نہیں کرتی تھی کیونکہ اسے بھی پتا تھا کہ میں اتنی محنت صرف اسی لیے کررہا ہوں تاکہ جلد از جلد اپنے مرحوم والد کی طرف سے وراثت میں ملنے والے پلاٹ پر گھر تعمیر کرسکوں جو ہماری موجودہ رہائش سے بہت بہتر علاقے میں تھا اور جہاں مکان بنانے اور وہاں کا طرز زندگی اختیار کرنے کے لیے ہمیں کافی بڑی رقم کی ضرورت تھی اور میں اسی رقم کے حصول کی دھن میں دن اور رات لگا ہوا تھا۔

گاڑی کی رفتار بڑھانے سے پہلے میں نے سڑک پر ذرا دور تک نظر ڈالی۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے دس پندرہ لوگ اکٹھے کھڑے نظر آئے تو میں نے رفتار بڑھانے کے بجائے اور ہلکی کرلی اس خیال سے کہ شاید آگے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔

"کیا ہوگیا؟" میں نے قریب سے گزرتے چودہ پندرہ برس کے لڑکے سے پوچھا۔

"دو لڑکے آنٹی کا پرس چھین کر بھاگ گئے۔" اس لڑکے نے رکے بغیر جواب دیا۔ میں نے بھی ان لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا کیونکہ کراچی جیسے شہر میں یہ ایک معمول کا واقعہ تھا مگر پھر میرا پاؤں ایکسیلیٹر پر پڑنے کے بجائے بریک پر پڑا اور میں فوری طور پر گاڑی سے اتر کر ان خاتون کی طرف بڑھا جن کا پرس چھینا گیا تھا۔

وہ ایک پچیس چھبیس سال کی بھری بھری جسامت

WWW.PAKSOCIETY.COM

والی عورت تھی، جو اپنے دونوں بازوؤں کی مدد سے اپنے آپ کو ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

"وہ پرس کے ساتھ میرا دوپٹا بھی کھینچ کر لے گئے۔" میں جوں ہی اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے چارگی کے عالم میں میری طرف دیکھتے ہوئے بتایا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میرے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی اور ایک نفرت انگیز نظر خاموش کھڑے تماش بینوں پر ڈال کر میں اس عورت کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا تاکہ وہ میری آڑ میں آجائے۔

"بہن! اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دوں؟" میں نے نرمی سے پوچھا تو وہ ہچکچا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی مگر دوسرے ہی پل جب اس کی نظر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں پر پڑی تو وہ اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گئی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور کسی قدر تیز قدموں سے آگے بڑھا تو وہ بھی اسی رفتار سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ہمیں یوں ساتھ جاتے دیکھ کر کئی لوگوں نے جملے کسے مگر میں نے توجہ دیے بغیر گاڑی کی پچھلی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا لی لوگوں کی بے حسی پر میرا خون کھول رہا تھا۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ان سب کو کھری کھری سناؤں مگر اس بے چاری عورت کا مزید تماشا نہ بنے اس خیال سے خاموش رہ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد رفتار دھیمی کرتے ہوئے میں ذرا سی گردن موڑ کر اس سے مخاطب ہوا۔

"پلیز آپ مجھے اپنے گھر کا راستہ بتائیں۔"

اس نے اپنی ہتھیلیوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا اور گھٹی گھٹی آواز میں راستہ بتانے لگی۔ اس کا گھر نہ صرف یہ کہ وہاں سے زیادہ دور نہ تھا بلکہ میرے گھر سے بھی صرف دو گلیوں کے فاصلے پر تھا۔

میں نے جیسے ہی اس کے کہنے پر سفید رنگ کے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی، وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر تقریباً" بھاگتی ہوئی گیٹ تک گئی اور گھنٹی بجانے کے ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے گیٹ پیٹ ڈالا۔ میں اس پر ایک ترحم آمیز نظر ڈال کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ گیٹ کھل گیا اور ایک خوش شکل مرد نے باہر نکل کر غصے اور حیرت سے پہلے حواس باختگی کے عالم میں اندر جاتی ہوئی عورت کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف۔ اور میں کسی انجان کیفیت کے زیر اثر رکنے پر مجبور ہو گیا۔

ان صاحب نے جس انداز سے اندر جاتی ہوئی پریشان حال خاتون اور پھر مجھے سر تا پا جانچتی نظروں سے دیکھا تھا اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ان کے ذہن میں کوئی غلط سوچ ہی آئی ہو گی اس لیے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے میں گاڑی سے اتر کر ان کی جانب بڑھا اور سلام کر کے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جسے انہوں نے تھوڑے توقف کے بعد تھام لیا۔ ان کے چہرے پر ایک تذبذب سا طاری تھا وہ بار بار مڑ کر اندر کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے اس سارے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"مجھے اسد کہتے ہیں۔" میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تو ایک بار پھر ان کی مشکوک نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"دراصل جو خاتون میرے ساتھ آئی ہیں، کچھ لڑکوں نے ان کا پرس چھین لیا تھا تو میں۔۔۔"

"آپ پلیز اندر آجائیں۔" انہیں اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر تفصیل سننا مناسب نہیں لگا اسی لیے میری بات کاٹتے ہوئے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بے فکری سے سر جھٹک کر ان کے ساتھ

ہو لیا۔

کبھی کبھی تعلق جڑنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے اور کبھی اس قدر آسانی سے رشتے قائم ہو جاتے ہیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ماہین اور ظفر بھائی سے میرا تعلق تھوڑے ہی دنوں میں رشتہ داروں جیسا ہی ہو گیا۔ ماہین تو اس روز کے واقعے کی وجہ سے میری بہت احسان مند تھی۔

"اگر اسد بھائی نہ آتے تو نجانے میں اور کتنی دیر تک ان بے غیرتوں کے درمیان تماشا بنی رہتی۔" وہ اکثر یہ جملہ کہتی اور ایسی عقیدت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتی کہ میں شرمندہ ہو جاتا کیونکہ میرے نزدیک یہ کوئی اتنا بڑا کارنامہ نہیں تھا، جسے اس طرح بار بار سراہا جائے۔ ماہین کے برعکس ظفر بھائی کی نظر میں بھی یہ کوئی اتنا اہم واقعہ نہیں تھا، مگر چونکہ وہ اپنی ذات میں بہت جلد گھل مل جانے والے انسان تھے۔ لہٰذا ان کی طرف سے بھی اسی گرم جوشی کا مظاہرہ ہوتا جیسا کہ ماہین احسان مندی کے تحت کرتی تھی۔

ان کے گھر میں ان دونوں کے علاوہ ظفر بھائی کے والدین اور ماہین کا پانچ سال کا بیٹا فہد اور تین سال کی بیٹی اریبہ ہوتے تھے۔ گھر کا ماحول بہت سادہ تھا اور گھر والے بہت کشادہ دل۔۔۔ اتنے کہ کوئی بھی باہر کا فرد چند ہی دنوں میں کسی بھی وقت بے تکلفی سے ان کے گھر آجا سکتا تھا اور میں تو یوں بھی رشتوں کے لیے ترسا ہوا تھا۔

ہم بس دو ہی بھائی ہیں اور والدین کے انتقال کے بعد ہم میں اس قدر دوری آگئی تھی کہ مہینوں بعد ملاقات کی نوبت آتی تھی اور اس میں ہماری بھابھی کے مزاج کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ایک تو وہ اپنے آگے نہ کسی رشتے کو اہمیت دیتی تھیں اور نہ کسی کی بات سننے کی روادار تھیں اور دوسرے والد صاحب کا بنایا ہوا خوب صورت گھر حصے میں ملنے کے باوجود ان کی نظریں اس پلاٹ پر تھیں، جو میرے حصے میں آیا تھا۔ اسی وجہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر تلخیاں بڑھنے لگیں تو ہم دونوں بھائی غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے اور خاص خاص موقعوں کے علاوہ ہمارا ملنا تقریباً" ختم ہو چکا تھا۔

ایسے میں جب ظفر بھائی کے گھر میں مجھے اتنا خلوص اور اہمیت ملی تو خود بخود بے تکلفی اور اپنائیت بڑھتی گئی اور میرا ان کے گھر جانا تقریباً" روز جانا معمول بن گیا۔

صدیق انکل کا بلڈ پریشر ہائی رہتا تھا اور رابعہ آنٹی شوگر کی مریض تھیں۔ لہٰذا ان کی دواؤں کی ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی تھی۔ اپنا ذاتی میڈیکل اسٹور ہونے کی وجہ سے میں یہ دوائیں خاصی کم قیمت پہ لا کر دیتا تھا اور بدلے میں ان کی ڈھیروں دعائیں سمیٹتا تھا۔ انکل آنٹی کی دعائیں، ماہین کی چھوٹی بہنوں جیسی محبت اور عقیدت اور ظفر بھائی کی دوستی۔۔۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میری زندگی میں رہ جانے والی ہر کمی اس گھرانے نے پوری کر دی ہو اور میں کبھی کبھی دل ہی دل میں اس لڑکے کو دعائیں دیتا جو اس روز ماہین کا پرس چھین کر بھاگا تھا۔

☆ ☆ ☆

سنی کو دو روز سے بخار تھا اور وہ خاصا چڑچڑا ہو رہا تھا۔ زارا نے بڑی مشکل سے اسے سلایا اور پھر تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"آپ کیوں ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" اس نے خاصے بے زار لہجے میں سوال کیا۔

"اصل میں مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔" میں نے اس کی تھکن کا احساس کرتے ہوئے کسی قدر جھجکتے ہوئے اس بات کی تمہید باندھی جو کئی روز سے میرے ذہن میں کلبلا رہی تھی اور میں زارا سے نہیں کہہ پا رہا تھا کیونکہ مجھے اس کی تنہائی اور مصروفیت کا بخوبی اندازہ تھا۔

"ہاں! اب بتائیں ایسی کیا خاص بات ہے، جس کے لیے آپ کو اپنی نیند قربان کرنی پڑی؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

زارا کی بہت ساری خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بہت آسانی سے اپنے خراب موڈ پر قابو پا کر دوسرے کی بات پر پورے طور سے متوجہ ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا تو میں نے بے اختیار اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔

"اتنی خاص بات بھی نہیں مگر تم سے کچھ کہنے سننے کا موقع بھی کہاں ملتا ہے میں صبح نکلتا ہوں تو آدھی رات تک واپس آتا ہوں اور تم سنی اور گھر کے کاموں میں مصروف ہوتی ہو۔" میری بات سن کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ کر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اپنا مکان بنوانے کے شوق میں ہم اپنی زندگی کے بہترین دن کیسے روکھے پھیکے انداز میں بسر کر رہے ہیں۔" اس کے منہ سے ایسا یاس بھرا جملہ سن کر لمحہ بھر کو تو میں ساکت رہ گیا کیونکہ وہ ہر حال میں خوش اور بے فکر رہنے والوں میں سے تھی، مگر شاید اب یہ احساس کہ ہم بہت کم وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزار پاتے ہیں اسے بہت شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔

"اچھا! تو ایسا کرو کہ اس روکھی پھیکی زندگی میں تھوڑا سا رنگ بھرنے کے لیے ہم ایک چھوٹی سی گیدرنگ رکھ لیتے ہیں۔ تم اپنے گھر والوں کو بلا لینا اور میں ظفر بھائی فیملی کو انوائٹ کر لیتا ہوں۔" میں نے بات کا رخ بدلنے کے ساتھ ہی وہ بات بھی کہہ دی جو کئی دنوں سے میرے ذہن میں تھی۔

دراصل میں جب کبھی ظفر بھائی کے گھر آتا تھا وہ لوگ میری بہت خاطر مدارات کرتے تھے، چائے کے ساتھ دو تین طرح کے اسنیکس لازمی تھے اور کئی مرتبہ میں نے ان کے گھر کھانا بھی کھایا تھا۔ اس کے برعکس ظفر بھائی اور ماہین بس ایک مرتبہ ہی ہمارے گھر آئے تھے اور انکل صدیق اور رابعہ آنٹی نے تو ہمارا گھر دیکھا ہی نہیں تھا اسی خیال کے تحت میں چاہ رہا تھا کہ کم از کم ایک بار ان لوگوں کو باقاعدہ طور سے کھانے پر انوائٹ کر لوں۔

میری بات سن کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں تو خود آپ سے کہنے والی تھی کہ کسی دن ماہین کے گھر والوں کو بلا لیں، آپ خود تو اکثر ان کے گھر جاتے رہتے ہیں۔"

زارا نے جس طرح فوری طور پر آمادگی ظاہر کی میرے دل سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ہی میری ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کے آگے سر جھکا دیا کرتی تھی مگر ہر بار ہی میرا دل اس کی محبت کے ایک نئے احساس سے آشنا ہوتا تھا اور میں اپنی خوش بختی پر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ خونی رشتوں کی بے اعتنائی کے بعد اس نے مجھے ایسی محبت کرنے والی شریکِ زندگی عطا کی۔

☼ ☼ ☼

اتوار کے دن صبح میں میڈیکل اسٹور بند رہتا تھا اور شام میں حسب معمول میں اسٹور جاتا تھا۔ اس اتوار شام کے لیے بھی میں نے احمد سے کہہ دیا کہ اسے اسٹور کھولنے کی ڈیوٹی دینی ہوگی تاکہ میں پورے اطمینان کے ساتھ مہمانوں کو وقت دے سکوں۔

زارا نے ایک دن پہلے ہی سے دعوت کی تیاری کر لی تھی کچھ چیزیں بنا کر فریز کر دی تھیں اور اب باقی کی تیاری میں لگی ہوئی تھی، گھر بھی صاف ستھرا اور ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ ان سارے کاموں میں میرا حصہ بس اتنا ہی تھا کہ میں نے سنی کو سنبھالا ہوا تھا کہ اس کی طرف سے بے فکر ہو کر وہ سارا انتظام کر سکے۔

شام سے پہلے وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر اب خود تیار ہو رہی تھی، کمر تک آتے بالوں کی سادہ سی چوٹی بنا کر پشت پر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے چہرے کو آئینے میں ذرا غور سے دیکھا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی

میک اپ کی مختلف چیزوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یوں تو اسے ان مصنوعی لوازمات کی قطعاً" ضرورت نہیں تھی۔ وہ ان کے بغیر بھی اتنی ہی خوب صورت تھی مگر اسے نہ صرف یہ کہ میک اپ کرنے کا شوق تھا بلکہ وہ اس قدر ماہرانہ انداز میں میک اپ کرتی تھی جیسے کسی بیوٹی سیلون سے تیار ہو کر آئی ہو۔

اس وقت بھی وہ اپنے لباس کے رنگ سے میچ کرتے آئی شیڈو اور لپ اسٹک میں بے پناہ خوب صورت لگ رہی تھی اور میں غیر شعوری طور پر ان لمحوں کے انتظار میں تھا کہ جب سب کی سراہتی نظریں میرے سجے سجائے گھر، میری حسین ترین بیوی اور گول مٹول سے بچے کا طواف کریں اور میرا دل فخر اور شکر گزاری سے بھر جائے۔

شام ڈھلتے ہی زارا کے بھائی بھابھی اور امی اور ظفر بھائی کی فیملی کے آمد نے گھر میں ہلچل سی مچا دی۔

زارا کی بھابھی اور ماہین تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسرے سے بے تکلف ہو کر خواتین کے پسندیدہ ترین ٹاپک کپڑوں کے بدلتے فیشن اور مارننگ شوز کی خواتین ہوسٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں مصروف ہو چکی تھیں اور مردوں میں سیاست زیر بحث تھی۔

باتوں کے دوران میں نے نوٹ کیا کہ ظفر بھائی کی نظریں بار بار ہمارے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے دونوں بچے بے حد شریر تھے جس کی وجہ سے ان کا گھر ہر وقت بے ترتیبی کا شکار رہتا تھا۔ ہر جگہ کھلونے بکھرے نظر آتے۔ کشن صوفوں کے بجائے زمین پر پڑے ہوتے اور جگہ جگہ پھٹے ہوئے اخبار کے ٹکڑے اور ٹافیوں کے ریپر گندگی میں اضافہ کر رہے ہوتے تھے۔ عموماً" ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کئی دنوں سے گھر کی صفائی نہ ہوئی ہو۔ اس کے برعکس ہمارے گھر کی سجاوٹ یقیناً" ان کے لیے حیرانی کا باعث بن رہی ہوگی کیونکہ یہ تو وہ جانتے ہی تھے کہ زارا چھوٹے بچے کے ساتھ اکیلے ہی گھر سنبھالتی ہے۔

کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا اور تین چار گھنٹوں بعد ہم سے اپنے گھر جلد آنے کا وعدہ لے کر مہمان رخصت ہو گئے۔ انہیں خدا حافظ کہہ کر ہم واپس اندر آئے تو احساس ہوا کہ جہاں مہمانوں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا، وہیں ان کے بچوں نے بھی جی بھر کے انجوائے کیا تھا جس کا اندازہ ہمارے گھر کی حالت سے بخوبی ہو رہا تھا اور جس کو واپس اپنی اصلی حالت میں لانے کے لیے مجھے اور زارا کو مزید دو گھنٹے جاگنا تھا۔

☼ ☼ ☼

کہتے ہیں رشتے دار خدا کا عطیہ ہوتے ہیں اور دوست ہم خود اپنی مرضی اور پسند سے بناتے ہیں۔ سچے اور پر خلوص لوگ اپنے دوستوں کے لیے اپنے دل کے ہی نہیں، اپنے گھر کے دروازے بھی وا کر دیتے ہیں۔

میرا ظفر بھائی اور ماہین کے گھر بے تکلفی سے آنا جانا تو تھا ہی مگر اس روز کی دعوت کے بعد وہ لوگ بھی اکثر ہمارے گھر آنے لگے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ظفر بھائی اکثر ہمارے گھر آنے لگے۔ دراصل ان کی گورنمنٹ جاب تھی۔ جہاں سے وہ شام سے پہلے ہی گھر آجاتے تھے اور گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کرنے کے بعد کہیں نہ کہیں نکل جاتے اور یہ وہ وقت ہوتا تھا، جب میں اپنے آفس کی ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد اپنے میڈیکل اسٹور پر بیٹھتا تھا۔ ایسے میں اگر ظفر بھائی آجاتے تو میرا وقت اچھا گزر جاتا تھا اور دن بھر آفس میں سر کھپانے سے طاری ہونے والی کوفت زائل ہو جاتی تھی۔ ظفر بھائی کو گفتگو کا فن آتا تھا۔ وہ ہر موضوع پر اس قدر آسانی سے بات کر لیتے تھے کہ سننے والے کو محسوس ہوتا کہ شاید وہ اسی شعبے سے منسلک ہوں، سنجیدہ باتوں کے علاوہ ہلکی پھلکی مزاح سے بھرپور گفتگو بھی ایسے دلچسپ انداز میں کرتے کہ خراب سے خراب موڈ بھی پل بھر میں خوشگوار ہو جاتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ میرا میڈیکل اسٹور بند کرنے کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

وقت ہو جاتا اور وہ میرے پاس بیٹھے ہوتے تو میں انہیں اپنے ساتھ گھر چلنے کی آفر کر دیتا اور وہ بھی بخوشی ساتھ ہو لیتے۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا کہ جب زارا سنی کو سلانے کے بعد کھانے پر میری منتظر ہوتی۔ اور باتوں کے علاوہ اس کی یہ عادت بھی میرے دل میں اس کی محبت کو بڑھانے کا سبب تھی کہ چاہے میری واپسی میں کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے وہ کھانا ہمیشہ میرے ساتھ ہی کھاتی تھی حالانکہ میں نے کئی بار کہا ہے کہ وہ اتنی رات تک بھوکی نہ رہا کرے مگر وہ ہر بار یہ کہہ کر کہ "آپ بھی تو ہمارے لیے اتنی محنت کرتے ہیں تو کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتی" بات ٹال دیتی۔

ظفر بھائی کے میرے ساتھ آنے کی وجہ سے ہمارے معمول میں خاصا بدلاؤ آ گیا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی کھانا کھاتے تو لازماً" ان سے بھی کہتے اور وہ بھی اکثر تھوڑے سے تکلف کے بعد یہ کہہ کر ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتے کہ "بھئی اب آپ لوگ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو میں بھی کہاں تک انکار کروں ویسے بھی گھر کا کھانا کھائے تو اب کئی گھنٹے گزر گئے وہ تو اب تک ہضم بھی ہو چکا ہو گا۔"

اس طرح کھانے کے بعد چائے کا دور چلنا بھی لازمی تھا۔ لہٰذا ان کی ہمارے گھر سے واپسی آدھی رات گزرنے کے بعد ہی ہوتی، کبھی زارا ہمیں چائے دینے کے بعد بیڈ روم میں چلی جاتی اور کبھی ظفر بھائی کی دلچسپ باتوں کی وجہ سے ہمارے ساتھ ہی بیٹھی رہتی۔ حالانکہ اس سے پہلے نہ تو میرا کوئی دوست اس قدر بے تکلفی سے میرے گھر آیا تھا اور نہ ہی زارا میرے کسی دوست کے آنے پر ہمارے درمیان آ کر بیٹھی تھی۔ ظفر بھائی کی بے تکلف طبیعت اور پھر خود میرے ان کے گھر بلا روک ٹوک آنے جانے کی وجہ سے ہمارے درمیان سے تکلف کی تمام دیواریں ہٹ گئیں اور وہ ہمارے گھر کے فرد کی سی حیثیت اختیار کر گئے۔

☆ ☆ ☆

آفس کولیگز کی دور خی سیاست کی وجہ سے ذہنی جھلاہٹ اور پر شور ٹریفک میں ڈرائیونگ کی تھکاوٹ کے بعد جب میں گھر پہنچا تو خلاف توقع میرے ہارن دینے سے پہلے ہی گیٹ کھل گیا اور میں نے آہستہ روی سے گاڑی اندر لے جا کر کھڑی کر دی۔ گاڑی سے اتر کر ہمیشہ کی طرح ایک خوشگوار کیفیت فوری طور پر تھکن کے احساس پر غالب آ گئی۔

آج زارا کچھ زیادہ ہی اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ کھلتے ہوئے رنگوں کی لانگ شرٹ اس کے لمبے قد پر خوب جچ رہی تھی۔ میک اپ بھی روز مرہ سے ذرا زیادہ اور بدلے ہوئے انداز میں کیا ہوا تھا۔ میرا موڈ پل بھر میں بدل گیا اور میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"آج کیا ارادے ہیں؟"

میرا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا کر کوئی خوب صورت سا جملہ کہے گی مگر اس نے تھوڑا سا کسمسا کر خود کو میری گرفت سے آزاد کیا اور کسی قدر عجلت بھرے انداز میں بولی۔

"آپ جلدی سے فریش ہو جائیں میں جب تک چائے لے کر آتی ہوں۔"

مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی مگر دن بھر کی کثافت سے چھٹکارہ پانے کی خواہش میں مزید کچھ کہے بنا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ نہا کر نکلا تو وہ گرم چائے اور دیگر لوازمات جو کہ وہ گھر میں ہی تیار کرتی تھی، کے ساتھ میری منتظر تھی۔ سنی قریب ہی بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ اپنا بچہ تو سب کو ہی خوب صورت لگتا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ سنی بہت خوب صورت بچہ تھا اس کے چہرے کا بھولپن راہ چلتے لوگوں کو بھی پل بھر کے لیے متوجہ کر لیتا تھا۔

"ماہین بھابھی کا فون آیا تھا۔" زارا نے سموسوں کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو میں بے توجہی سے اس کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ ظفر بھائی بچوں کو لے کر پلے

لینڈ جا رہے ہیں تو میں بھی سنی کو لے کر آ جاؤں، میں نے کہا ٹھیک ہے اسد آ جائیں تو وہ میڈیکل اسٹور جاتے ہوئے مجھے اور سنی کو آپ کے گھر ڈراپ کر دیں گے اور رات تک تو ہم لوگ واپس آ ہی جائیں گے تو آپ اسٹور بند کرنے کے بعد ہمیں ماہین بھابھی کے گھر سے پک کر لیجیے گا۔"

اس نے سارا پروگرام اس یقین کے ساتھ مجھے بتایا جیسے اسے پورا بھروسا ہو کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا، مجھے حیرت بھی ہوئی اور کسی حد تک ناگوار بھی گزرا کہ زارا نے اس طرح بغیر میری مرضی جانے اپنے طور پر پروگرام سیٹ کر لیا مگر زارا کا کھلا کھلا چہرہ دیکھ کر میں خود کو کچھ کہنے سے بمشکل روک سکا اور پھر انہیں ظفر بھائی کے گھر لے جاتے ہوئے راستے میں تھوڑا سا شرمندہ بھی ہوا کہ میں نے اپنی دن رات کی مصروفیت میں اپنی بیوی اور بچے کو بالکل گھر تک محدود کر دیا تھا تو پھر اگر انہیں گھر سے نکلنے کا ایک موقع ملا تھا تو مجھے ہرگز برا نہیں ماننا چاہیے۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے بعد جب میں اسٹور بند کر کے ظفر بھائی کے گھر سے انہیں لینے گیا تو رہا سہا گلہ بھی جاتا رہا۔ وہ لوگ کچھ دیر پہلے ہی واپس آئے تھے، بچے سب تھک کر سو چکے تھے اور بڑے کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے جو سارا کا سارا بازار سے منگوایا گیا تھا اور ایسا ان کے گھر اکثر ہوتا تھا۔ کھانے کے دوران ظفر بھائی اور زارا مسلسل یہی بتاتے رہے کہ بچوں نے کس قدر انجوائے کیا اور خاص طور سے سنی کیسے حیرت اور خوشی سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

ہمیں گھر واپس آتے آتے رات کے ڈیڑھ بج گئے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اگلے دن اتوار تھا ورنہ صبح جلدی اٹھنے کے خیال سے میرا موڈ خراب ہونا لازمی تھا۔

"اب سنی بڑا ہو رہا ہے۔ ہمیں اسے ایسی جگہوں پر اکثر لے کر جانا چاہیے۔" گھر آنے کے بعد زارا نے مختلف انداز میں کئی بار یہ بات کہی۔

مجھے اس کی بات سے اختلاف نہیں تھا مگر میری مجبوری وقت کا نہ ہونا تھا، میں پورے ہفتے صبح آٹھ بجے سے لے کر رات بارہ بجے تک کی ڈیوٹی دیتا تھا اور اتوار کے دن بھی صرف صبح دیر تک سونے کی عیاشی کے بعد ہفتے بھر کی گروسری لانا اور پھر شام کو حسب معمول میڈیکل اسٹور پر بیٹھنا۔ میں بھلا اس معمول سے باہر نکل کر کسی اور کام یا تفریح کے لیے وقت کیسے نکالتا۔

☆ ☆ ☆

احمد مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر خیر مقدمی انداز میں مسکرایا۔ مجھے اس کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ میرے آنے سے پہلے دن بھر کی سیل کا حساب کتاب تیار کر لیتا تھا اور میرے پہنچتے ہی سارا کچھ میرے حوالے کر کے بڑی عجلت میں اپنے گھر کے لیے روانہ ہو جاتا تھا کیونکہ اس کے بعد اسے ایوننگ کلاس لینے کے لیے جانا ہوتا تھا۔ وہ ڈیڑھ سال سے میرے اسٹور پر کام کر رہا تھا اور اس عرصے میں مجھے اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی حالانکہ اس سے پہلے جو لڑکا کام کرتا تھا، اس کے بارے میں کئی لوگوں نے شکایت کی تھی کہ وہ انہیں دواؤں پر مروجہ ڈسکاؤنٹ نہیں دیتا جبکہ جو رقم وہ میرے حوالے کرتا تھا وہ ڈسکاؤنٹ شدہ ہی ہوتی تھی۔ احمد ایماندار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوش اخلاق اور مہذب لڑکا تھا۔ دو سال پہلے اس کے والد کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد گھریلو اخراجات میں تنگی کی وجہ سے وہ جاب کرنے پر مجبور ہو گیا تھا مگر اپنی تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دے رہا تھا اور اسٹور پر جب کوئی کسٹمر نہیں ہوتا تھا تو وہ عام لڑکوں کی طرح موبائل پر فضول وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی کوئی کتاب کھول لیتا۔

آج جب وہ حسب معمول سارے دن کا حساب دینے کے بعد الوداعی کلمات کہنے کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"احمد! اگر تم تھوڑی دیر رک سکو تو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

اس کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے تذبذب کے آثار جھلکے پھر وہ اپنی عادت کے مطابق خوش دلی سے مسکرا کر بولا۔

"جی سر! آپ کہیں کیا کہنا ہے۔"

"میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اتوار کے دن تمہاری کیا مصروفیت ہوتی ہے؟" میں نے سوال کرتے ہوئے گہری نظروں سے اس کی جانب دیکھا تاکہ اس کے ردعمل کا فوری اندازہ کرسکوں' میری امید کے عین مطابق وہ تھوڑی دیر کے لیے تو خاموش ہوگیا پھر جیسے کچھ سوچ کر بولا۔

"اتوار کا دن تو اور دنوں سے زیادہ مصروفیت میں گزرتا ہے۔ پورے ہفتے میں گھر کے بہت سے چھوٹے موٹے کام اکٹھے ہوجاتے ہیں اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ایک دن ملنے والی چھٹی میں حامد بھائی ان کاموں کی وجہ سے آرام نہ کرسکیں۔" اس نے اپنے بڑے بھائی کا نام لیا اور میرے چہرے پر پھیلتی مایوسی کو بھانپ کر فوراً" ہی بولا۔

"مگر سر! آپ بتائیں اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے تو میں اسے کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔" وہ حقیقتاً" پرخلوص اور محنتی لڑکا تھا اور اس کی ان ہی خوبیوں کے پیش نظر میں اسے ایک نئی آفر کرنا چاہ رہا تھا جس میں میرا بھی فائدہ تھا اور اس کا بھی۔

"دراصل میں چاہ رہا ہوں کہ اتوار کی شام اسٹور تم ہی سنبھال لیا کرو اور اس کے لیے میں تمہیں ایکسٹرا پے کروں گا۔" وہ ایک بار پھر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔

"دیکھو احمد! یہ میری تم سے ریکویسٹ ہے اگر تم منع بھی کردو گے تو مجھے برا نہیں لگے گا۔" میں نے شعوری طور پر اسے جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور وہ سادہ دل لڑکا سٹپٹا کر رہ گیا۔

"سر! میں آپ سے کمٹمنٹ کرلوں اور پھر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکوں۔"

"تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ اگر تم مجھے پہلے سے بتادیا کرو گے تو میں بھی اسی حساب سے مینج کرلیا کروں گا۔" میں نے جلدی سے بات سمیٹ کر اس کے لیے کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تو وہ تائید میں سر ہلا کر رہ گیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر ہوگیا ہو۔

اس روز مجھے زارا کا ظفر بھائی کی فیملی کے ساتھ آؤٹنگ پر جانا اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا مجھے اس بات کا رنج ہوا تھا کہ میں اپنی بیوی اور بچے کو بالکل وقت نہیں دے پارہا۔ ہماری شادی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے اور میں ان سے اس حد تک لاتعلق ہوتا جارہا تھا کہ زارا کو یہ کہنا پڑا کہ ہماری زندگی کے بہترین دن بے رنگ اور بے کیف انداز میں بسر ہورہے ہیں۔

احمد سے معاملہ طے کرلینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میرے ذہن پر چھائی احساس جرم کی دھند چھٹ گئی ہو۔ میں خوشگوار موڈ کے ساتھ کسٹمرز سے ڈیل کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

اس نئے سیٹ اپ کے بارے میں' میں نے گھر میں کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

اتوار کے دن معمولات سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے زارا سے کہا کہ وہ جلدی سے تیار ہوجائے ہم لوگ کہیں گھومنے جارہے ہیں تو اس کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ حیرانی اور خوشی کے ملے جلے رنگوں نے اس کی آنکھوں کی چمکاہٹ اور گالوں کی سرخی میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔

"مگر آپ کو تو۔۔۔"

"کوئی سوال نہیں۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جملہ مکمل کرنے سے روکا۔ "پہلے ہم سی ویو جائیں گے اور پھر کھانا بھی کہیں باہر کھائیں گے' باہر

کا مطلب فائیو اسٹار ہوٹل نہیں' بلکہ کوئی روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ ہے' آخر بچت بھی تو کرنی ہے۔" میں نے ہنس کر جتایا تو وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"بس آپ مجھے سی ویو پر ایک بھٹہ کھلا دیجیے گا' میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس کے لہجے کی شرارت آمیز سچائی مجھے اندر تک پرسکون کرگئی۔

زارا حقیقی معنوں میں شریک زندگی تھی۔ ہر ارادے' ہر پریشانی میں ساتھ نبھانے کے لیے تیار اور ہر خوشی میں دل سے خوش۔۔۔

سی ویو پر لوگوں کا ہجوم تھا۔

ہم جیسے مڈل کلاس لوگوں کے لیے یہ وہ واحد تفریح ہے جس پر بہت کم خرچ کرکے بہت زیادہ لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ اسی لیے سال کے بارہ مہینے یہاں لوگوں کا رش رہتا ہے' حد تو یہ ہے کہ سردی کے شدید موسم میں بھی کچھ منچلے یہاں آنے سے باز نہیں آتے۔

سنی سمندر کی لہروں کو دیکھ کر تو بہت خوش تھا مگر خود پانی میں قدم رکھنے کے لیے کسی حال میں تیار نہیں ہوا' میں نے اور زارا نے بہت چاہا کہ وہ تھوڑے تھوڑے پانی میں کھڑا ہوجائے مگر وہ اس بری طرح خوف زدہ ہوا کہ پھر باقی وقت ہم نے اسے گود میں ہی اٹھائے رکھا۔

زارا نے بھٹہ بھی کھایا اور وہیں پر بنے کیبن سے لے کر برگر اور کولڈ ڈرنک بھی پی حالانکہ قریب ہی سکڈونلڈ بھی تھا مگر ہم اسی میں خوش تھے۔ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے' سمندر کی جھاگ اڑاتی لہروں سے لطف اندوز ہوتے وقت کیسے گزرا ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ سنی جب نیند سے بے حال ہونے لگا تو ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔

رات کو سونے سے پہلے جب زارا نے لگاوٹ بھرے انداز میں کہا کہ اسے کہیں آؤٹنگ پر جانے سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ اب چھٹی کا پورا دن میں اس کے ساتھ رہوں گا تو میں بھی اس سے یہ کہے بنا نہ رہ سکا کہ اس کے ساتھ بے فکری سے وقت گزارتے' اپنے بچے کو تو تلے انداز میں باتیں کرتے سن کر میں خود بھی کتنا خوش تھا۔

محبت کا اظہار کتنا ضروری ہے اور اس اظہار کے لیے وقت بھی درکار ہوتا ہے یہ میں نے اس روز جانا۔

اگلے دن ابھی مجھے اسٹور پر آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ظفر بھائی آگئے۔

"یار! تم لوگ کل کہاں چلے گئے تھے' خیریت تو ہے' ہم سب تو پریشان ہوگئے' میں یہاں آیا تو احمد بیٹھا ہوا تھا اور گھر گیا تو تالا لگا دیکھ کر حیران رہ گیا' تم لوگ تو کبھی اس طرح کہیں نہیں جاتے۔" وہ ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہنے کے بعد خاموش ہوئے تو میں نے انہیں اصل بات بتائی جسے سن کر انہوں نے نہ صرف اطمینان بھرا سانس لیا بلکہ بے انتہا خوشی کا اظہار بھی کیا۔

"یار! یہ تم نے بہت اچھا کیا' انسان کو کام کے ساتھ آرام اور تفریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کیا کہ ہفتے کے سات دن اور سال کے بارہ مہینے بس مشین کی طرح کام کیے جائے اور ایک وقت آئے کہ نہ گھر والے اس سے خوش رہیں اور نہ ہی ملنے جلنے والے۔"

میں ان کی رائے سے اگر پہلے نہیں تو اب سو فیصد متفق تھا' گزشتہ روز زارا اور سنی کے ساتھ گزارے ہوئے وقت نے جیسے میرے اندر ایک نئی توانائی بھر دی تھی اور یہ خیال بھی خوش کن تھا کہ اب آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا۔

ظفر بھائی نے حسب عادت ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا اور میں ان کی باتوں کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ گاہکوں کو بھی نمٹاتا رہا۔ اکثر یوں بھی ہوتا تھا کہ کوئی صاحب میڈیسن لینے کے بعد ظفر بھائی کی گفتگو میں شریک ہوجاتے اور کافی دیر تک اسٹور پر کھڑے رہتے بلکہ کئی لوگ تو ان کی دلچسپ باتوں کے چکر میں ہی اکثر بلا ضرورت شاپ پر آنے لگے تھے یوں میرے میڈیکل اسٹور پر ہر وقت رش رہنے کا تاثر رہتا جو کہ کاروباری لحاظ سے میرے لیے خاصا سود مند تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

☼ ☼ ☼

وقت یکساں رفتار سے گزر رہا تھا۔

دھیرے دھیرے مکان بنانے کے لیے جمع ہونے والے سرمائے میں اضافہ ہو تا جارہا تھا جو کہ دلی طمانیت کا باعث تھا۔ دو گلی چھوڑ کر رہنے والے دوست اب خونی رشتوں سے بڑھ کر ہو گئے تھے۔ ہر خوشی' ہر پریشانی میں ایک دوسرے کے ساتھ یوں جڑے ہوئے جیسے یہ سال ڈیڑھ سال کا نہیں' برسہابرس کا ساتھ ہو۔

اس روز میں دفتر سے واپس آیا تو برابر میں رہنے والے شیخ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک لیا۔ میں نے دل ہی دل میں تلملاتے ہوئے گاڑی سے اتر کر ان سے علیک سلیک کی کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اب وہ مجھے آدھے پون گھنٹے سے پہلے بخشنے والے نہیں اور یہی ہوا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ آج کل گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں جس گھر میں کام کرتی تھیں' اس کا کوڑا دوسرے گھر کے آگے پھینک دیتی تھیں' جس کی وجہ سے آئے دن محلے والوں میں جھگڑا ہونے لگا تھا۔ اب شیخ صاحب کو مسئلے کے حل سے زیادہ آپس میں لڑنے والوں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنا تھا لہٰذا میں بمشکل تمام ان سے جان چھڑا کر دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر کے اپنے گھر تک آیا اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں خاصی دیر تک ہارن پر ہاتھ رکھے رہا۔

گیٹ فوراً" ہی کھل گیا اور زارا نے کسی قدر حیرت اور گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے ہٹتے ہوئے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔

اندر داخل ہوا تو ظفر بھائی جو بڑے ریلیکس انداز میں ٹانگیں پھیلائے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے' مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"آج تم نے آنے میں بڑی دیر کردی؟" میرے سلام کا جواب دے کر انہوں نے سوال کیا تو میں جو پہلے ہی چڑچڑا ہو رہا تھا کافی روکھے انداز میں بولا۔

"کیوں' کیا آپ بہت دیر سے میرا انتظار کر رہے ہیں؟"

"نہیں بھئی میں تو بس ابھی دو منٹ پہلے ہی آیا ہوں۔"

وہ تو میرے لہجے کو نظر انداز کر گئے مگر میں ان کی غلط بیانی پر ٹھٹک کر رہ گیا' آدھے گھنٹے سے تو میں اپنے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا شیخ صاحب کی لایعنی گفتگو کا عذاب جھیل رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت آئے ہوتے تو ان کا میری نظروں میں آئے بغیر میرے گھر تک آنا ناممکن تھا۔

دن بھر کی تھکن' شیخ صاحب کی وجہ سے ہونے والی کوفت اور اسٹور جلد پہنچنے کی فکر نے مجھے زیادہ دیر تک کچھ سوچنے کی مہلت نہیں دی اور میں فریش ہونے کے بعد زارا کی بنائی ہوئی چائے کے گرم گرم گھونٹ حلق میں انڈیل کر ظفر بھائی کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔

میڈیکل اسٹور پر بھی اس روز معمول سے بڑھ کر مصروفیت رہی مگر رات کو سونے سے پہلے میں زارا سے سرسری طور پر یہ پوچھے بنا نہیں رہ سکا کہ ظفر بھائی میرے آفس سے آنے سے کتنی دیر پہلے آئے تھے۔

"بہت دیر پہلے بلکہ وہ تو آپ کی واپسی کے وقت سے بھی پہلے آگئے تھے' میں سمجھی شاید کوئی بہت ضروری کام ہوگا' ان کو کمپنی دینے کے چکر میں' میں آپ کے لیے کچھ بنا بھی نہیں سکی اور آپ کو خالی چائے پینی پڑی۔"

اس کا سادگی سے صفائی پیش کرنے کا انداز مجھے پرسکون کر گیا اور میں اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے نیند کی پرسکون وادی میں اتر گیا۔

☼ ☼ ☼

میں ویسے بھی ہر واقعے کا مثبت پہلو دیکھنے کا عادی ہوں اور یہ کوئی اتنی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی' بعض اوقات انسان بلاسبب ہی غلط بیانی کر جاتا ہے مگر جب صرف چار دنوں کے وقفے سے ظفر بھائی نے میری آنکھوں کے سامنے انتہائی بے تکلفی سے میری

بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا تو تمام تر مثبت سوچ رکھنے کے باوجود میرا خون کھول اٹھا۔

☼ ☼ ☼

ہمارے ملک میں سرکاری اور عوامی سطح پر تعطیلات منانے کا اس قدر رواج ہے کہ کوئی موقع ہو' عام تعطیل کا اعلان کرنے میں دیر نہیں کی جاتی۔

ایسا ہی ایک دن تھا۔ میں دن بھر چھٹی کے مزے لینے کے بعد اب اسٹور جانے کی تیاری کر رہا تھا حالانکہ دل تو بالکل آمادہ نہیں تھا۔ ایک طرف سنی کی معصوم باتیں اور شرارتیں قدم روک رہی تھیں تو دوسری جانب زارا کا گلابی کپڑوں میں پھولوں کی طرح کھلتا سراپا بے ایمانی پر اکسا رہا تھا۔ وہ بھی میری نظروں کے ارتکاز سے انجان نہ تھی لہٰذا آنکھوں میں مجھے چیلنج کرنے کے درپے تھی۔

ڈور بیل مخصوص انداز میں بجی تو میں سمجھ گیا کہ ظفر بھائی کی آمد ہوئی ہے' گیٹ کھولنے پر حسب توقع ظفر بھائی کا وجیہہ چہرہ میرے سامنے تھا' وہ بلاشبہ مردانہ وجاہت سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔

ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے' ہم نے اندر کی جانب قدم بڑھائے تو انہوں نے بلا تکلف ہمارے ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا۔ ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی طرح بیٹھنے کا سلسلہ تو بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اب تو وہ براہ راست ٹی وی لاؤنج میں ہی آکر بیٹھتے تھے جہاں سے ہمارا بیڈ روم اور کچن بخوبی نظر آتا تھا۔

ظفر بھائی حسب عادت صوفے پر ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھ گئے اور اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز درمیانی ٹیبل پر رکھ دی۔ چند لمحوں بعد زارا مسکراتی ہوئی کچن سے نکلی اور چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر میرے برابر میں بیٹھ گئی۔

"دیکھیں بھابھی! میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔" ظفر بھائی نے اخباری کاغذ کے پیکٹ پر لپٹے ہوئے دھاگے کھولتے ہوئے کہا۔

موتیے کے پھولوں کی خوشبو سے ہمیں بھی اندازہ تو ہو ہی گیا تھا' مگر پھر بھی سفید پھولوں کے موٹے موٹے گجرے دیکھ کر زارا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے پھول بہت پسند تھے' اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر گجرے ان سے لے لیے اور انہیں اپنے ہاتھ میں پہننے کی کوشش کرنے لگی۔ دراصل گجرے بہت قریب قریب پھول پرو کر بنائے گئے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے خاص آرڈر دے کر بنوائے گئے ہوں' اسی لیے زارا کو انہیں پہننے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اچانک ظفر بھائی اپنی جگہ سے اٹھے اور آگے بڑھ کر زارا کی کلائی پکڑ لی' ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑے پکڑے دوسرے ہاتھ سے اسے گجرا پہنانے لگے۔ زارا نے گھبرا کر ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا

کا نیا ایڈیشن قیمت -/750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا خزانہ

قیمت -/225 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی -/800 روپے کا منی آرڈر ارسال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ارے! میں پہنا دیتا ہوں۔" ظفر بھائی اپنی ہی دھن میں تھے اور خون میری رگوں میں پوری شدت سے گردش کر رہا تھا۔ انہوں نے گجرا زارا کی کلائی میں ڈالنے کے بعد ہی اس کا ہاتھ چھوڑا اور مسکراتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے' ان کی نظریں بدستور زارا کے سراپے پر مرکوز تھیں' جس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ وہ اپنے سیاہ چمکیلے بالوں کو ہر وقت باندھے رکھتی تھی مگر چونکہ کچھ دیر پہلے ہی نہا کر نکلی تھی لہٰذا اس وقت کھلے ہوئے تھے اور گلابی کپڑوں اور خفت سے گلابی پڑتے چہرے کے امتزاج میں کچھ اور سیاہ لگ رہے تھے' ظفر بھائی کی نظریں اس پر سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ مجھے ہی زور دار طریقے سے کھنکار کر انہیں ہوش میں لانا پڑا۔

وہ کسی قدر سٹپٹا کر میری طرف متوجہ ہوئے جیسے اب تک میری موجودگی کو بھولے ہوئے تھے' دوسرے ہی پل ان کی زیرک نگاہیں ہم دونوں کی ناگواری کو بھانپ گئیں۔

"دراصل میں آفس سے واپس آرہا تھا تو سگنل پر ایک بے حد غریب لڑکا گجرے بیچ رہا تھا۔ اس نے کچھ اس قدر منت بھرے انداز میں مجھ سے گجرے خریدنے کو کہا کہ میں نے ترس کھا کر اس کے سارے ہی گجرے خرید لیے اور اماں اور ماہین کے پہننے کے بعد بھی جب بچ گئے تو میں بھابھی کے لیے لے آیا۔" انہوں نے وضاحت پیش کی جس کے جواب میں' میں خاموش ہی رہا۔

زارا اٹھ کر جا چکی تھی۔ ایک گجرا ابھی بھی ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔

"چلیں۔" میں نے کھڑے ہو کر باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

"ہاں ہاں چلو۔" ظفر بھائی کی آواز میں کھسیاہٹ تھی۔

ہم باہر نکلے تو چند قدم چلنے کے بعد وہ رک کر بولے۔

"اسد یار! تم جاؤ مجھے ذرا آج گھر پر کچھ کام ہے۔"

"ہاں چلیں! میں بھی چلتا ہوں کئی دنوں سے انکل سے ملاقات نہیں ہوئی' ان سے مل لوں گا۔ ویسے بھی ابھی میرے اسٹور جانے کے وقت میں کچھ دیر باقی ہے۔" میں ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے بولا تو وہ خاصے مطمئن نظر آنے لگے۔

چند منٹ کا فاصلہ طے کر کے ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔

صدیق انکل اور رابعہ آنٹی ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے اور ماہین قریب ہی بیٹھی بچوں کو ہوم ورک کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر رابعہ آنٹی اور ماہین کی کلائیوں کی طرف دیکھا جبکہ گھر میں بھی موتیے کے پھولوں کی خوشبو کا ذرا سا بھی احساس نہیں جاگا۔

میرا ظفر بھائی کے گھر آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

ہر گھر میں داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ ہوتا ہے' مگر ہر در کے آگے کچھ دیواریں بھی ہوتی ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ دروازے سے گزر کر اندر جانے والا ہر دیوار بھی پار کر لے۔

دوست بہت اچھے ہوتے ہیں۔

شرم آنکھ میں ہی ہوتی ہے مگر کوئی آنکھ کب بے حجاب ہو جائے' اس کا پتا نہیں چلتا جیسے کہ مجھے خبر نہ ہو سکی۔ اسی لیے اللہ نے محرم نامحرم کی حد بندی قائم کی ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو سب سے بہتر جانتا ہے۔

تعلقات کے بلند ترین گراف کو نیچے لانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ایک جھٹکے میں یا رفتہ رفتہ... مگر بہرحال مجھے یہ کام لازمی کرنا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

صبا سید

اسلامی سبق آموز لطیفے

سستا طریقہ

ایک شخص نے اپنے پڑوسی سے پوچھا۔
"زلزلہ زدگان کی مدد کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟"
"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔۔۔ رضائیاں، کمبل، گوشت، مرغی، دالیں، آٹا، چاول، دودھ، ہر چیز اتنی مہنگی ہے کہ خرید کر دینے کی ہمت نہیں۔۔۔ ہمارے مالی حالات بھی اتنے اچھے نہیں ہیں۔"
"میرے خیال میں سب سستا طریقہ یہ ہے کہ نقد رقم دے دی جائے۔" پڑوسی نے سوچ کر جواب دیا۔
(مسرت الطاف احمد۔ کراچی)

سزا

ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر اسکول کا معائنہ کرنے آیا تو ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے برابر والی کلاس سے شور و غل کی آوازیں سن کر پریشان ہو گیا۔ غصے میں بھرا وہ کلاس میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا جو دوسروں سے قدو قامت میں قدرے بڑا تھا۔ میز کے پاس کھڑا ہوا سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔ جب کہ باقی لڑکے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ ایجوکیشن آفیسر نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے پکڑ لیا اور اپنے ساتھ کھینچتا ہوا ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں لے آیا۔ ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں اس لڑکے کو کونے میں کھڑا کر کے ایجوکیشن آفیسر نے کہا۔
"تمہاری یہی سزا ہے۔ تم اس وقت تک یہاں کھڑے رہو گے۔ جب تک میں رجسٹروں کے معائنے سے فارغ نہیں ہو جاتا۔"
تقریباً" پندرہ منٹ بعد ایک چھوٹے سے بچے نے دروازے سے جھانک کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "سر ——"
"کیا ہے؟" ایجوکیشن آفیسر نے پوچھا۔
"سر! کیا آپ ہمارے ماسٹر صاحب کو دن بھر یونہی کھڑا رکھیں گے؟" بچے نے کہا۔
(مسرت الطاف احمد، کراچی)

کرکٹ

"عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے تو اعتبار میں"
استاد نے کلاس روم میں شعر پڑھنے کے بعد طالب علموں سے پوچھا "اس شعر کی اصلاح کرو۔ اس میں ایک غلطی ہے۔" طالب علم کھڑا ہو کر بولا۔
"سر! میرے خیال میں عمر دراز چار کے بجائے پانچ دن مانگ کے لائے ہوں گے۔ تاکہ دنیا میں آکر کم از کم ایک کرکٹ ٹیسٹ میچ تو ملاحظہ کر سکیں۔"

بااصول

ایک ادبی رسالے کا اصول تھا کہ اس میں جس قلم کار کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ انہیں باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ایک قلم کار نے اس رسالے کو اپنے بہت سے افسانے بھیجے۔ مگر اس کی کوئی بھی کہانی رسالے کی زینت نہ بن سکی۔ اس صورت حال سے ادیب بہت افسردہ ہوا اور تنگ آکر ایک دن رسالے کے دفتر جا پہنچا۔ رسالے کے ایڈیٹر نے اسے ایک افسانے کے مساوی معاوضہ پیش کر دیا۔
ادیب بہت خوش ہوا۔ اس نے ایڈیٹر سے پوچھا "کیا میرا کوئی افسانہ شائع ہونے کے لیے منتخب ہو گیا ہے؟"
ایڈیٹر نے جواب دیا۔ "نہیں! آپ کا کوئی بھی افسانہ قابل اشاعت نہیں ہے۔ یہ رقم تو وہ ہے، جو ردی میں آپ کے افسانے فروخت کر کے حاصل ہوئی ہے۔"

حسنِ بے پروا

نیویارک میں ایک نوجوان عورت خاصا "جدید" تراش خراش والا لباس لے کر آئی اور اپنا کمرہ بند کر کے اس کو جانچنے لگی۔ لباس پہننے کے بعد دفعتاً" اس کی نگاہ ایک پینٹر پر پڑی، جو کھڑکی پر رنگ کر رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ لباس کس حد تک لوگوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ پینٹر بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔
اس عورت نے پینٹر کے متوجہ کرنے کے لیے دو چار لایعنی آوازیں نکالیں۔ بلند آواز میں گانا گایا۔ دو چار چیزیں فرش پر پٹخیں۔ مگر پینٹر بدستور کھڑکی رنگنے میں مصروف رہا۔
جھلا کر اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی اور ایک خاص ادا سے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
دفعتاً" پینٹر نے اپنا ہاتھ روکا اور حیرانی سے کہا۔
"محترمہ! کیا آپ نے اس سے پہلے کبھی پینٹر نہیں دیکھا؟"

خوفناک خواب

ایک صاحب نفسیاتی معالج کے پاس پہنچے اور انہیں اپنی پریشانی بتائی۔ "ڈاکٹر صاحب! میں گزشتہ کئی راتوں سے ایک ہی خواب دیکھتا رہا ہوں۔ جس میں میری ساس ایک ہیبت ناک چڑیل کے ہمراہ میرے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی لال لال آنکھیں، الجھے بال، لمبی زبان، بڑے بڑے ناخن۔۔۔"
نفسیاتی معالج نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اف! واقعی نہایت خوفناک خواب ہے۔"
مریض نے ناگواری سے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب! ابھی آپ نے پورا خواب سنا ہی کب ہے۔۔۔ چڑیل کے بارے میں میں نے ابھی آپ کو کہاں بتایا ہے۔"

کارگر نسخہ

نیویارک کے ایک پارک میں ایک معمر شخص کی ادھیڑ عمر بیوہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ اور پھر پہلے دوستی اور پھر رومان کی صورت اختیار کر گیا۔ کچھ دنوں بعد معمر شخص نے خاتون سے شادی کی درخواست کی۔ جو فوراً" منظور ہو گئی۔ اس شخص نے منگنی کی انگوٹھی بھی پہنا دی۔ پھر انہوں نے ایک مکان کی تلاش شروع کی۔ کیونکہ بڑے میاں ایک ہوٹل میں رہتے تھے۔
بیوہ نے ایک مکان پسند کیا اور اس کے ہونے والے شوہر نے منہ مانگی قیمت دے کر مکان خرید لیا۔ لیکن دوسرے روز خاتون مقررہ وقت پر پارک میں نہیں پہنچی۔ بڑے میاں نے بہت انتظار کیا۔ پھر کئی روز گزر گئے۔ مگر خاتون کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی۔ خاتون نے بڑے میاں کو جو اپنے گھر کا پتا بتایا تھا۔ وہ اس پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ خاتون وہاں سے جا چکی ہے۔ یہ مکان وہی تھا، جو بڑے میاں نے ایجنٹ کی معرفت خریدا تھا اور ان کی ہونے والی دلہن نے بے حد پسند کیا تھا۔ ایجنٹ سے دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ خاتون اس مکان کی مالکہ تھی اور ایک عرصے سے اسے فروخت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کی مناسب قیمت نہیں ملتی تھی۔

خیریت

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد دو دوست تارا سنگھ اور بادل سنگھ ایک دوسرے سے ملحقہ گاؤں میں زندگی کے دن گزارنے لگے۔ ایک روز تارا سنگھ نے بادل سنگھ کو رات کے کھانے پر بلایا۔ بادل سنگھ نے رات کا خیال کرتے ہوئے لالٹین اپنے ہمراہ لے لی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دعوت رات گئے تک جاری رہی۔ جس کے بعد بادل سنگھ نشے کی حالت میں لالٹین وہیں بھول کر اپنے گھر چلے گئے۔

اگلی صبح ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ بادل سنگھ نے دیکھا تو تارا سنگھ کا ملازم کھڑا تھا۔ "اس نے کہا۔ "سردار جی نے مجھے یہ پتا کرنے بھیجا ہے کہ آپ اپنے گھر خیر خیریت سے پہنچ گئے تھے۔"

بادل سنگھ نے خوش ہو کر بتایا کہ وہ بڑے اچھے طریقے سے گھر پہنچ گئے تھے۔

"مگر آپ کی لالٹین تو ہمارے گھر ہی رہ گئی تھی۔ وہ میں واپس کرنے آیا ہوں..... "ملازم نے بتایا۔

"تو پھر میں رات کو لالٹین کی جگہ کیا اٹھا لایا تھا؟" بادل سنگھ نے حیرت زدہ ہو کر ملازم سے پوچھا۔

ملازم نے اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے توتے کا خالی پنجرہ۔"

ثبوت

علاقے کے ایک نامی گرامی پہلوان تیسری منزل سے گرنے کے بعد اسپتال میں تھے۔ ان کا ایک پڑوسی عیادت کے لیے ان کے پاس پہنچا۔ انہیں سر سے پاؤں تک پٹیوں میں لپٹا اور بے حس و حرکت لیٹا دیکھ کر پڑوسی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "پہلوان جی! کیا آپ مر چکے ہیں؟"

"ہاں۔" پٹیوں میں سے ہلکی سی آواز آئی۔

پڑوسی گہرا سانس لے کر بولا "واہ پہلوان جی! آپ تو بڑے جھوٹے آدمی ہیں..... بول رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ مر چکا ہوں۔"

"میرے مرنے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔ اگر میں زندہ ہوتا تو کیا تم میرے منہ پر مجھے جھوٹا کہہ سکتے تھے؟" پہلوان جی کی درد میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

لڑائی

ایک تنظیم سے تعلق رکھنے والی لڑکی کی شادی ہو گئی۔ شادی کے پانچ دن بعد اس نے اپنی ماں کو فون کر کے بتایا۔

"امی! آج میری ان سے لڑائی ہو گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! شادی کے بعد میاں بیوی کے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے امی! لیکن اب لاش کا کیا کروں؟" لڑکی نے لاپروائی سے جواب دیا۔

انتقام

ایک دن آلو نے بھنڈی کے موبائل فون پر اسے "آئی لو یو" کا میسج کیا۔ بھنڈی نے جواباً کہا۔ "شٹ اپ! تو اتنا موٹا اور میں اتنی اسمارٹ۔ تیرا میرا کیا جوڑ۔"

آلو کو بہت دکھ ہوا۔ اس کے بعد آلو نے اتنی سبزیاں پھنسائیں کہ ہر سبزی کے ساتھ اس کا جوڑ بن گیا۔ یعنی آلو گوبھی، آلو گاجر، آلو پالک، آلو بینگن، آلو میتھی وغیرہ۔ جب کہ بھنڈی آج تک اکیلی ہے۔ اسے کہتے ہیں غرور کا انجام۔

عشق کہیں جسے

ایک شخص نے بس میں بیٹھے ہوئے مایوس اور افسردہ شخص کو دیکھ کر باتوں باتوں میں کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جیسے آپ نے زندگی میں عشق کیا اور ناکام ہو گئے۔"

وہ صاحب جھلا کر بولے۔ "میں نے زندگی میں ایک ہی بار عشق کیا تھا اور بد قسمتی سے کامیاب بھی ہو گیا۔"

☆

شگفتہ جاہ

جب آسمان سے فرشتے اترے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے پاس قبیلہ عبدالقیس کا وفد آگیا ہے۔"

اس وقت ہم میں سے کسی کا یہ خیال نہیں تھا (کہ وہ پہنچ گئے ہیں) اچانک وہ لوگ آئے اور سواریوں سے اتر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے (ان کے سردار) حضرت اشج (مالک بن منذر) بصریؓ باقی رہ گئے۔ وہ بعد میں حاضر ہوئے۔ وہ قیام گاہ پر اترے، سواری کو بٹھایا، (سفر کے) کپڑے ایک طرف رکھے اور دوسرے پہنے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔

"اشج! تمہارے اندر دو ایسی عادتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ بردباری سے اور سمجھ میں کام کرنا۔"

انہوں نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ چیز میرے اندر فطری طور پر موجود ہے یا بعد میں پیدا ہوئی؟"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بلکہ یہ چیز تمہارے اندر فطری طور پر موجود ہے۔"

(حدیث نمبر 4187، ابن ماجہ)

مسلمان کے عیب چھپانا،

حضرت عقبہ بن عامرؓ کے منشی حضرت دخین ابوالہیثمؒ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت عقبہ بن عامر سے عرض کیا۔ "ہمارے چند پڑوسی شراب پیتے ہیں۔ میں ان کے لیے پولیس بلانا چاہتا ہوں تاکہ وہ ان کو پکڑ لیں۔"

حضرت عقبہؓ نے کہا۔ "ایسے نہ کرو بلکہ ان کو وعظ و نصیحت کرو اور ان کو ڈراؤ۔"

میں نے کہا۔ "میں نے ان کو روکا تھا مگر وہ نہ ملنے اس لیے میں پولیس بلوانا چاہتا ہوں۔"

حضرت عقبہؓ نے کہا۔ "تمہارا ناس ہو! ایسے نہ کرو کیونکہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔

"جس نے کسی مسلمان کے عیب کو چھپایا تو اس نے زندہ درگور لڑکی کو زندہ کیا۔"

صحابی کو گالی دینا،

حضرت بہیؒ کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت مقدادؓ کے درمیان ذرا بات بڑھ گئی اور حضرت عبداللہ نے حضرت مقدادؓ کو گالی دے دی۔

حضرت مقداد نے حضرت عبداللہ کی ان کے والد حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے نذر مان لی کہ وہ حضرت عبداللہ کی زبان ضرور کاٹیں گے۔

جب حضرت عبداللہ کو اپنے والد سے خطرہ ہوا تو انہوں نے کچھ لوگوں کو سفارش کے لیے اپنے والد کے پاس بھیجا۔ ان کی بات سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"مجھے اس کی زبان کاٹنے دو تاکہ یہ مستقل قانون بن جائے اور اس پر میرے بعد بھی عمل ہوتا رہے کہ جو آدمی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کو گالی دیتا ہوا پایا جائے گا اس کی زبان ضرور کاٹی جائے گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچھے اخلاق،

حضرت انس بن مالک ایک دفعہ بیمار ہوئے تو کچھ لوگ ان کی عیادت کرنے آئے۔ انہوں نے اپنی باندی سے کہا۔

"اے باندی! ہمارے ساتھیوں کے لیے کچھ لاؤ، چاہے روٹی کے ٹکڑے ہی ہوں کیونکہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اچھے اخلاق جنت کے اعمال میں سے ہیں۔"

ہر لفظ ہے خوشبو،

- دو طرح کے لوگوں کو ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔ ایک وہ جنہیں ہم یاد رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جنہیں ہم بھول جانا چاہتے ہیں۔
- بلندی پر اڑنے والوں کو پستیاں بھی اتنی ہی گہری ملتی ہیں۔
- میں نے دو طرح کے لوگوں سے دھوکا کھایا ہے۔ ایک وہ جو میرے اپنے نہیں تھے اور دوسرے وہ جو میرے بہت اپنے تھے۔
- ہر انسان کی خوشی کی وجہ بنیں، خوشی کا حصہ نہیں اور ہر انسان کے دکھ کا حصہ بنیں دکھ کی وجہ نہیں۔
- اپنے آپ کو "زیر" سمجھیں "زبر" نہیں۔ کیونکہ ایک دن پیش بھی ہونا ہے۔
- معاف کر دیں انہیں جنہیں آپ بھول نہیں سکتے یا پھر بھول جائیں انہیں جنہیں آپ معاف نہیں کر سکتے۔
- کتنے دکھ کی بات ہوتی ہے نا کہ جب ہم کسی پر اندھوں کی طرح اعتماد کریں اور وہ ثابت کر دے کہ ہم واقعی اندھے ہیں۔
- کچھ لوگ اتنے بہادر ہوتے ہیں کہ اگر ان کی زندگی میں غم بڑھ جائیں تو ان کے قہقہوں میں شدت آجاتی ہے۔
- رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی بہتر ہے خواہ وقتی ہی سہی۔
- ہم جن سے پیار کرتے ہیں انہیں کبھی نہیں بھلا سکتے مگر جن سے ہم نفرت کرتے ہیں، وہ تو بالکل ہی ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں۔
- انسان کو لفظ نہیں، رویے مارتے ہیں۔

صدف مختار۔ بوسال مصور

نکل جاؤ کام سے،

والاس جانسن نامی ایک امریکی نوجوان نے اپنی زندگی کے حسین ترین ایام ایک ورکشاپ میں لکڑیاں چیرنے میں گزار دیے۔ اس کی جوانی کی بے مہار طاقت پر مشقت اور سخت ترین کام کر کے کچھ زیادہ ہی تسکین پاتی تھی اور آرے پر لکڑیاں چیرتے چیرتے اس کی زندگی کے چالیس سال گزر گئے۔

یہ مشقت والا کام کرتے ہوئے والاس جانسن ہمیشہ اپنے آپ کو اس آرے کی مشین پر بہت اہم فرد محسوس کرتا تھا کہ ایک دن آرے کے مالک نے اسے بلا کر ایک تشویشناک خبر دیتے ہوئے کہا "میں تمہیں ابھی اور اسی وقت کام سے نکال رہا ہوں اور کل سے اِدھر مت آنا۔"

والاس کے لیے یہ خبر کسی مصیبت سے کم نہ تھی۔ وہ وہاں سے نکل کر خالی الذہن اور پریشان حال سڑکوں پر نکل پڑا۔

یہ چیز اُسے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی کہ وہ کس منہ سے جا کر اپنی بیوی کو بتائے گا کہ اس کے پاس گھر کے گزارے کے لیے جو نوکری تھی وہ جاتی رہی تھی مگر ناچار شام کو لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اُسے گھر لوٹنا ہی پڑا۔

والاس کی بیوی نے والاس کے برعکس نوکری چھوٹنے کی خبر نہایت تحمل سے سنی اور والاس جانسن کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ ہم اپنے گھر کو رہن رکھ کر قرضہ اٹھائیں اور تعمیرات کا کام شروع کریں۔"

اور اُس نے واقعی ایسا ہی کیا، اپنے گھر کو رہن رکھ کر کچھ قرضہ اُٹھایا اور اُس پیسے سے دو چھوٹے گھر بنائے۔ اس پہلے تعمیراتی کام میں اُس کی اپنی محنت اور مشقت

زیادہ شامل تھی۔ یہ دو گھر اچھے پیسوں میں فروخت ہوئے — تو اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اور پھر تو چھوٹے گھروں کے پروجیکٹ اس کی پہچان بن گئے۔ اور اپنی محنت اور قسمت کے بل بوتے پر صرف پانچ سال کے مختصر عرصے میں ہی والاس ایک مشہور کروڑ پتی والاس جانسن بن چکا تھا۔ جس نے دُنیا کے مشہور ترین ہوٹلوں کے سلسلے ہالی ڈے اِن کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا اور ہالی ڈے اِن ہوٹل دُنیا کے کونے کونے میں چھا گئے۔

یہ شخص اپنی ڈائری میں یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اگر آج مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اُس آرا ورکشاپ کا مالک جس نے مجھے کام سے نکالا تھا، کہاں رہتا ہے تو میں جا کر اُس کا اپنے دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کروں، کیونکہ اُس نے میرے لیے ایسی صورت حال پیدا کر کے بظاہر تو ایسی دردناک کیفیت پیدا کر دی تھی جس نے میرے ہوش و حواس ہی چھین لیے تھے مگر آج میں نے یہ جانا ہے کہ اگر اللہ نے مجھ پر ایک دروازہ بند کیا تھا تو اس کے بدلے ایک نیا راستہ بھی تو کھول دیا تھا جو کہ میرے اور میرے خاندان کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوا۔

جب کبھی بھی ناکامی کا سامنا ہو جائے تو اُسے اپنا اختتام نہ سمجھ لو۔ بس ذرا ہمت اور حوصلے کے ساتھ زندگی کی عطا کردہ دوسری خوشیوں کے ساتھ سوچو اور ایک نئی ابتدا کر لو۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے۔

"مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو، اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لیے مُضر ہو۔ اور ان باتوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

(سورۃ البقرہ ۱- 216)

حج کا حق دار،

ایک روز ایک آدمی حضرت شقیق بلخیؒ کے پاس آیا اور کہا۔ "میں حج کرنا چاہتا ہوں۔"

حضرت نے سُن کر فرمایا۔ "تیرے پاس راستے کا توشہ ہے؟"

وہ بولا۔ "ہاں چار چیزیں رکھتا ہوں۔

1- کسی شخص کو اپنی روزی سے زیادہ دینے والا نہیں پاتا ہوں۔

2- جس جگہ ہوں، اللہ کو دیکھتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ہے۔

3- کسی شخص کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنے نزدیک روزی دینے والا نہیں پاتا ہوں۔

4- جس حال میں ہوں جانتا ہوں کہ مجھے حق تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا دوسرا نہیں۔"

حضرت شقیق بلخی بولے۔ "آفرین ہے تجھ پر تو حج کر سکتا ہے۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

مدلل مذہب، مکمل رہنما،

میں نے ویدوں کے تراجم لفظ بہ لفظ پڑھے۔ گیتا لفظ بہ لفظ پڑھی۔ ہندو مذہب کے فلسفے اور ہندو مذہب کی تاریخ اور ہندو شاستروں کو پڑھا۔ بدھ مت کی کتابوں کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ بائبل پوری کی پوری پڑھی اور پادری ڈومیلو کی تفسیر کی مدد سے پڑھی۔ میں نے دہریوں، ملحدوں اور مادہ پرستوں کے فلسفے پڑھے۔ میں نے اپنے دماغ سے ہر تعصب کو نکال کر ان چیزوں کو پڑھا تاکہ تحقیق کروں کہ حق کیا ہے۔

اس سارے مطالعہ کے بعد میں نے پھر قرآن مجید کو بغور پڑھا کیونکہ بچپن سے میری تعلیم عربی کی تھی۔ اس وجہ سے مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی کہ میں ترجموں کی مدد سے پڑھتا۔ اس تفصیلی مطالعہ اور غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے زیادہ مدلل مذہب کوئی نہیں جسے قرآن مجید پیش کرتا ہے۔

"اور اس سے زیادہ مکمل رہنما کوئی نہیں جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"

(مولانا مودودی کے انٹرویو سے اقتباس)

روزنامہ جسارت

WWW.PAKSOCIETY.COM

خالدہ جیلانی

ہُلستا کی کیوں سیدھی دل کا معاملہ

نوال افضل گجرات ——— گجرات
عید آئی ہے مسرت کی پیامی بن کر
وہ مسرت جو تیری دید سے وابستہ ہے

انعم مشتاق ——— کراچی
کتنی مشکلوں سے فلک پر نظر آتا ہے
عید کے چاند نے بھی انداز تمہارے سیکھے

فرح امتیاز ——— حیدرآباد
کیسے نہ رہے چاند گریزاں میرے گھر سے
زنجیر فاصلوں کی ابھی قد پہ پڑی ہے

شاہین افضل ——— کراچی
وہ آئے نہ آئے یہ اس کی رضا ٹھہری
جشن عید ہے ہم گھر کو سجا کر دیکھیں

زیبا وسیم ——— گھوٹکی
نگاہوں میں شوخی، لبوں پر تبسم
وہ چوڑی کھنکتی تو جب عید ہوتی
وہ آنچل میں چہرہ چھپا کے جو چلتے
تو شرم و حیا کے سبب عید ہوتی

ثمرین ——— راولپنڈی
شام تک ان کے لیے دروازہ کھلا رکھا
شاید وہ کہنے آجائیں عید مبارک

مونا وحید ——— صوابی
جگمگاتی غم فرقت کی سیاہی کے لیے
میرے ہونٹوں پہ تبسم کی ضیا عید کے دن
پھر تصور میں دریچے تیری یادوں کے کھلے
پھر تیرے درد کا احساس ہوا عید کے دن

بدخشی سلطان ——— اسلام آباد
عید کا دن بھی شب ہجر کی صورت گزرا
دوست آیا نہ کوئی اور نہ تم ہی آئے

بشریٰ متین ——— میاں چنوں
دور دیس میں مورا چھپ گیا چاند
اس کو ڈھونڈ کے لاؤ کہ عید آجائے
مورے آنچل میں بھی ستارے جھلملائیں
مورے آنگن میں بھی کہکشاں اتر آئے

صائمہ بتول ——— گوجرانوالہ
عید اور سجاوٹ کے لیے پلکوں پر
ہم سلگتے ہوئے اشکوں کو سجا لیتے ہیں
تیری تصویر پہ لب رکھ کے میری جان جگر
گونگے بہروں کی طرح عید منا لیتے ہیں

رضوانہ بیگم ——— ڈہرکی
اداسیوں کی شام اور یادوں کا یہ سماں
اپنی پلکوں پہ ہرگز ستارے نہ لائیں گے
رکھنا سنبھال کے چند خوشیاں میرے لیے
میں لوٹ آؤں گا تو پھر عید منائیں گے

زبیدہ بھٹی ——— بیلہ
مکاں کے سارے دریچے کھلے رکھو محسن
نہ جانے کون سی جانب سے روشنی آئے

درخشندہ اویس ——— گھارو (سندھ)
دور تک وادیاں ہیں پھولوں کی
میری آنکھوں میں عکس تیرا ہے
چاند نکلنے لگا ہے پانی سے
ہر طرف سانولا سویرا ہے

ثریا فاروق ——— کوٹ ادو
تم نے دو چار گھڑی بیٹھ کے سکھ دکھ بانٹے
مجھ پہ احسان تمہارا یہ سدا رہنا ہے
تم زمانے کی اسی بھیڑ میں کھو جاؤ گے
مجھ کو بھی وقت کی لہروں میں کہیں بہنا ہے

سمیرا اقبال ——— کراچی
اے محبت تیرا بخت کہ تجھے بن مول ملے
ہم سے انمول جو ہیروں میں تلا کرتے تھے
اے محبت تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے
ہم سے دانا جو کمالات کیا کرتے تھے

نیلم شہزادی ——— کوٹ مومن
دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

سیدہ صائمہ سرفراز ——— کراچی
عجب اعتبار و بے اعتباری کے درمیان ہے زندگی
میں قریب ہوں کسی اور کے، مجھے جانتا کوئی اور ہے
تیری روشنی تیرے خدوخال سے مختلف تو نہیں
تو قریب آ تجھے دیکھ لوں، تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

کوثر ——— میاں چنوں
سردیوں کا موسم ہے برفیلی ہوائیں ہیں
سال نو آچکا ہے، جنوری کی شامیں ہیں
اداسیوں میں لپٹے ہوئے ماہ و سال گزرتے ہیں
چلے آؤ کہ صدیوں سے ترستی ہوئی نگاہیں ہیں

رضیہ مجید ——— اٹک
میں خود زمیں ہوں مگر ظرف آسمان کا ہے
کہ لوٹ کر بھی میرا حوصلہ چٹان کا ہے
برا نہ مان میرا حرف حرف زہر سہی
میں کیا کروں کہ یہی ذائقہ زبان کا ہے

نازلی ——— بھائی پھیرو
اس عید پر پھر ساتھ ہیں میرے
دوری، تنہائی اور تیری یادیں

نمرہ، اقرا ——— کراچی
ہمیں خبر ہے کہ وہ آج رات روتے ہیں
کہ ان کے شہر سے جھونکے ہوا کے نم آئے

دانیہ عقیل ——— کراچی
جگمگ کرتی آنکھیں مجھ کو اچھی لگتی ہیں
قصہ لمبا کر دیتا ہوں بچوں کی حیرانی پر

ندا شاہد ——— لاہور
تیرے نام کی جو روشنی تھی، اسے خود ہی تو نے بجھا دیا
نہ جلا سکی جسے دھوپ بھی اسے چاندنی نے جلا دیا
میں ہوں گردشوں میں گھرا ہوا، مجھے آپ اپنی خبر نہیں
وہ جو شخص تھا مرا رہنما، اسے راستوں میں گنوا دیا

ہنیا ناصر ——— کراچی
وہ اک شخص کہ جس سے محبتیں تھیں بہت
خفا ہوئے تو اس سے شکایتیں تھیں بہت
بہت عزیز تھے اپنے اصول اس کو بھی
ہمیں بھی اپنی انا کی ضرورتیں تھیں بہت

سونیا رباب ——— قاضی بالا
کچھ دیر چمکتا مرے گھر میں وہ کیسے
وہ تو میری پلکوں کا ستارہ بھی نہیں تھا
کہنے کی ہے یہ بات کہ وہ چھوڑتا دنیا
سچا تھا وہ عادل مگر اتنا بھی نہیں تھا

سجل باجوہ ——— چک نمبر ۱۵۶ شمالی سرگودھا
ہے شاعری روز اول سے ہوئی تخلیق ندیم
شعر سے کم نہیں، انسان کا پیدا ہونا

راحیلہ منظر ——— جھمرہ سٹی
پورا دکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور آدھا چاند
میری کروٹ پر جاگ اٹھا
نیند کا کتنا کچا چاند

فرحت سجل ——— رکن سٹی منڈی بہاؤالدین
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

نوال افضل گھمن ——— گجرات
چلو کائنات بانٹ لیتے ہیں
تم میرے باقی سب کچھ تمہارا ✡

WWW.PAKSOCIETY.COM

یاد آگیا وہ شخص تو یاد آئے جائے گا
رُلوائے جائے گا ہمیں تڑپائے جائے گا

تعبیر سے کبھی تو نوازے گا آسمان
کب تک ہمارے خواب محل ڈھائے جائے گا

سر عشق کی مہم نہیں ہوتی دماغ سے
جو سوچتا رہے گا، وہ گھبرائے جائے گا

اتنا بھی صبر و شکر کا قائل نہیں کہ دل
ہر کیفیت میں آپ کے گُن گائے جائے گا

آتا ہے رحم ناصحِ مشفق کے حال پر
بیچارہ عمر بھر ہمیں سمجھائے جائے گا

نظریں ہٹا ہٹا کے نہ کیوں گفتگو کریں
ہم دیکھیں جائیں گے تو وہ شرمائے جائے گا

تھوڑی شعور اور چڑھا لے تو ہر طرف
ساغر نچائے جائے گا، چھلکائے جائے گا

انور شعور

چلنے کا حوصلہ نہیں، رُکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا

اے مری گل زمیں تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہلِ کتاب نے مگر کیا تیرا حال کر دیا

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اس نے کمال کر دیا

میرے لبوں پہ مُہر تھی، پر شیشہ رونے تو
شہر کے شہر کو مرا واقفِ حال کر دیا

چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آسکے
وقت نے کس شبیہہ کو خواب و خیال کر دیا

مدتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گِلہ کیا
منصبِ دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

پروین شاکر

بادبان کھُلتے ہیں،

ہم دھویں کے چشموں سے
اپنے پیالے بھرتے ہیں
پیالے خالی رہتے ہیں
سایہ سایہ بستی میں
اک چراغ کی لَو پر
کتنی پوریں جلتی ہیں
کتنی راتیں ڈھلتی ہیں
رات کی سیہ بیلیں
روشنی سے لپٹی ہیں
رات اک پہیلی ہے
روشنی اکیلی ہے
اور ہوا کے نیزے پر
زخم زخم بانہوں میں
بادبان کھُلتے ہیں
آسمان کھلتے ہیں

نذیر قیصر

عشق کا تیر کماں سے باہر ہے
دل کی حالت بیاں سے باہر ہے

جو کمایا تھا باندھ رکھا ہے
تیری تصویر ساماں سے باہر ہے

دیارِ عشق کا تو کچھ پتا نہیں ملتا
میری منزل نشاں سے باہر ہے

کُن کہا اور عدم، وجود کیا
کیا ہے جو اس کی شاں سے باہر ہے

لامکاں کا سفر غزال کرے
گھر جو اس کا مکاں سے باہر ہے

عظمیٰ افتخار غزال

WWW.PAKSOCIETY.COM

شعاع کے ساتھ

ادارہ

رابعہ بصری..... ہری پور ہزارہ

(1) شعاع سے تعلق کچھ اتنا پرانا تو نہیں۔ مگر مضبوط اور گہرا ضرور ہے۔ نویں جماعت کے ایگزام کے بعد ہم فری تھے۔ لہٰذا ہم نے اپنی دوست کی مدد سے ایک عدد ڈائجسٹ حاصل کیا۔ شعاع کے خوب صورت لفظوں نے ہم کو اپنا اسیر کرلیا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں جب سب گھر والے سوئے ہوئے تھے تو ہم چارپائی کے نیچے گھس کر شعاع میں مگن ہوتے تھے اور سردیوں کی راتوں میں رضائی میں گھس کر ایمرجنسی لائٹ میں شعاع پڑھنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ پہلا ناول جو ہم نے پڑھا۔ وہ رخسانہ نگار عدنان کا تھا۔ نام یاد نہیں۔ مگر کہانی یاد ہے۔ مرکزی کردار نائلہ' اس کی بہن مہرین اور شوہر منصور کا ہے۔ جس میں منصور نائلہ کو طلاق دے کر مہرین سے شادی کرلیتا ہے۔ ہر چند کہ یہ عام سی اسٹوری تھی۔ مگر چونکہ ہم نے پہلی دفعہ اس طرح کی کہانی پڑھی تو ہمیں بہت اچھی لگی۔ پھر ہم اپنی پڑوسن سے بہت سے ڈائجسٹ منگوانے اور پڑھنے لگے اور میٹرک کی کلاسز شروع ہونے تک ہم پور پور اس نشے میں ڈوب چکے تھے۔ چونکہ ہمارا ڈائجسٹ سے پہلا تعارف شعاع بنا تو پھر کوئی دوسرا ڈائجسٹ دل کو نہ بھایا۔ "عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں" ابتدا میں لاعلمی کے باعث دوسرے ڈائجسٹ بھی پڑھے ـــ مگر ان میں وہ بات نظر نہ آئی' جو شعاع اور خواتین میں ہے اور اب تو یہ حال ہے "بس تو ہی ملے' تجھ جیسا بھی نہیں۔"

(2) دن کا آغاز امی کی آواز کے ساتھ ہوتا ہے' جو ہمیں نماز کے لیے جگا رہی ہوتی ہیں۔ نماز اور تلاوت کے بعد ناشتا کیا جاتا ہے۔ پھر افراتفری میں کالج کی تیاری' جہاں ہمارے پہنچنے تک پہلا پیریڈ آدھا ضرور گزر چکا ہوتا ہے۔ مگر بھلا ہو ہماری میم کا۔ کبھی ڈانٹا نہیں۔ ایک بجے کالج سے واپسی اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد تین بجے اکیڈمی جانا اور پانچ بجے وہاں سے واپسی پر گھر کے چھوٹے موٹے کام اور مغرب کی نماز کے بعد سب کامل بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا۔ بہت سے گھروں میں اب اس طرح باجماعت ٹی وی نہیں دیکھا جاتا۔ مگر ہم سارے دن کے بچھڑے ہوئے اسی ٹائم ملتے ہیں اور اپنے دن کی روداد بیان کرتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ کوئی سنتا نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی سنا رہا ہوتا ہے۔ پھر نیوز سن کر سب اپنے بستروں کی راہ لیتے ہیں ـــ ارے نہیں' سوتے نہیں ـــ بلکہ اپنے اپنے بستر پر بیٹھ کر اپنی مرضی کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ آج کل پیپرز کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے اردگرد کتابوں اور نوٹس کا ڈھیر لگا ہوتا ہے اور ان کے نیچے شعاع پڑا ہوتا ہے۔ جوں ہی امی کے سونے کا یقین ہوتا ہے تو نوٹس کے نیچے رکھا شعاع اوپر اور نوٹس نیچے ـــ

اور جو کبھی امی کی آنکھ کھل جائے تو جلدی سے لائٹ آف کر کے موبائل کی ٹارچ سے رضائی میں گھس کر شعاع پڑھا جاتا ہے۔ یوں تو امی کوئی خاص روک ٹوک نہیں کرتیں۔ مگر پیپرز کے دنوں میں سختی کرتی ہیں۔ ویسے دن میں بھی وقتاً فوقتاً شعاع ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔

(3) واہ! میرا پسندیدہ سوال ـــ (ایک راز کی بات بتاؤں! میں نے اس سلسلے میں شرکت بھی اس سوال کی وجہ سے کی ہے) سمجھ میں نہیں آرہا۔ کہاں سے شروع کروں۔ ساری رائٹرز میری پسندیدہ ہیں۔ راحت جبیں کا نام لیتے ہی بہار' پھول' خوشبو' چاند' ہوا' موسم ذہن میں آجاتے ہیں۔ "سبز رتوں کا پہلا پھول' زرد موسم' سرخ گلابوں کا موسم' ویری فنٹاسٹک ـــ فاخرہ جبیں کا "میرے گمشدہ" بہت بار پڑھا اور ہر بار نیا احساس

ـــ ثمرہ بخاری کا ہر ناول' ناولٹ یا افسانہ مجھے حقیقت سے قریب تر لگتا ہے۔ بلکہ بہت سے کردار پڑھتے ہوئے مجھے کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور یاد آتا ہے' جو بالکل وہی ہوتا ہے۔ "نین اور نیر" زبردست ناول تھا۔ فائزہ افتخار روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا جانتی ہیں "مان جاؤ' داسی ڈھولن یار دی' بھول بھلیاں تیری گلیاں' اک نئی سنڈریلا" ہر ناول دوسرے سے مختلف۔ نگہت سیما کا "بار وفا' زرگزیدہ' راہ جنوں" یادگار تحریریں ہیں۔ تنزیلہ ریاض نے جتنا لکھا بیسٹ لکھا "مرگ برگ" جیسا ناول پھر نہیں پڑھا۔ انیسہ سلیم کا "ہمارا کیش ہے ترک رسوم" ہر بار نئے انداز میں دل کو اچھا لگتا ہے ـــ فارحہ ارشد کا ایک ناولٹ پڑھا تھا۔ نام یاد نہیں۔ مگر بہت اچھا لگا۔

بشریٰ سعید کا "سفال گر" پڑھنے کے بعد بہت دنوں تک دماغ کچھ اور سوچنے کے قابل نہ رہا۔ رخسانہ نگار عدنان کا "محبت خواب سفر' میرے چارہ گر' کوئی دیپک ہو" یادگار ہیں اور "دل آئینوں کا شہر" متعدد بار پڑھا ـــ نہ جانے کیوں؟ عالیہ بخاری کے بھی سنجیدہ سے ناول ہمارے دل کو بہت بھاتے ہیں۔ مختصراً "شعاع یا خواتین کی ہر تحریر میرے دل پر نقش ہیں۔ بہت سے کردار ہمیں بھلائے نہیں بھولتے اور جہاں تک بات ہے دل الجھنے کی تو نایاب جیلانی کے بہت سے ناول پڑھ کر دل الجھا ـــ خیر چھوڑیے۔ عنیزہ سید کا "شہر آرزو کا عالم" پرسوں پڑھا اور بہت اچھا لگا ـــ شازیہ چوہدری کا "تیرے نام کی شہرت" بھی بہت زبردست تھا۔ ایک مزے کی بات بتاؤں میں ٹی وی پر بھی وہی ڈرامے دیکھتی ہوں' جو ناول میں نے پڑھے ہوتے ہیں یا میری فیورٹ رائٹرز نے لکھے ہوں ـــ اور کوئی بھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آئی نا یہ بات ـــ مجھے بھی نہیں آئی۔

اور کسی کردار میں اپنی جھلک کی بات ہے تو چند ماہ پہلے نعیمہ ناز کی تحریر "رابعہ کی کہانی" میں مجھے رابعہ میں اپنی بہت مشابہت نظر آئی۔ نام سے لے کر سوچ تک ـــ ماہا ملک کا "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" اور میرے خواب ریزہ ریزہ" بہت پسند ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہر ناول' ناولٹ' افسانہ ہمارا فیورٹ ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ شعاع میں ہو۔

(4) ارے چھوڑیے کیا پوچھا ـــ اپنی خوبیاں' خامیاں جاننے کے لیے کسی دوست یا کزن وغیرہ سے رابطہ نہیں کیا۔ کیونکہ میرے خیال میں ہم جتنا خود اپنے بارے میں جانتے ہیں۔ دوسرے نہیں جانتے۔ ویسے بھی "جہان" کے مطابق ہم دوسروں کو اپنا وہ ہی روپ دکھاتے ہیں' جو ہم دکھانا چاہتے ہیں ـــ اور بہت سوچ بچار کے بعد ہمارے ذہن میں خوبی تو کوئی نہیں آئی۔ البتہ خامی یاد آئی ـــ اور بس خامی یہ ہی ہے کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔

پسندیدہ شعرا تو بہت سارے ہیں۔ مگر ایک کی شرط نے مشکل میں ڈال دیا اور سوچنا پڑ رہا ہے۔

"مسلسل ہوں ملاقاتیں تو دلچسپی نہیں رہتی
بے ترتیب یارانے بڑے رنگین ہوتے ہیں۔"

پسندیدہ کتابوں میں "شہاب نامہ" آل ٹائم فیورٹ ہے۔ ہر روز ایک آدھ صفحہ تو ضرور پڑھتی ہوں۔ اس کے علاوہ "زاویہ' عشق کا قاف' توجہ کے طالب' چلتا مسافر" بھی بہت پسند ہیں۔ نسیم حجازی کے سارے ناول بہت پسند ہیں۔ قمر اجنالوی کا "شمشیر" بہت اچھا لگا۔ مستنصر حسین تارڑ میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ اس کے علاوہ حسن نثار' جاوید چوہدری' رؤف کلاسرا' یاسر پیرزادہ کے کالم بہت پسند ہیں۔ فیورٹ رائٹرز میں ممتاز مفتی' ابن انشاء' اشفاق احمد' منشی پریم چند' علیم الحق حقی قابل ذکر ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دستک دستک دستک

شاہین رشید

اسماء عباس

"کیسی ہیں اسماء۔۔۔ آج کل آپ کا سیریل "ساری بھول ہماری تھی" اور "من کے موتی" دیکھ رہے ہیں۔ دونوں ہی بہت اچھے ہیں اور آپ کے رول بھی۔"

"شکریہ۔۔۔ ہاں لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔"

"من کے موتی میں آپ چھوٹے بچوں کی دادی کا رول کر رہی ہیں۔ ایسی دادی تو ہم نے کبھی نہ دیکھی نہ سنی۔ وہ بھی یتیم بچوں کی؟"

"ارے نہیں بھئی۔۔۔ بہت سی دادیاں ایسی ہی ظالم ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں تو جو نہ ہو وہ کم ہے بہت انوکھی ہے یہ دنیا۔"

"آج کل جو کام آپ کر رہی ہیں اس میں رول آپ کے تقریباً" ایک جیسے ہی ہیں۔ آپ نے خود محسوس کیا؟"

"جی بالکل کیا ہے۔۔۔ اور اسی لیے آپ کچھ عرصہ مجھے اسکرین سے غائب بھی دیکھیں گی کیونکہ اب میں ایک جیسے رول نہیں کرنا چاہتی بلکہ مجھے انتظار ہے کسی اچھے رول کا۔ کیونکہ میں ایک جیسے رول کر کر کے بور ہو گئی ہوں اور ننھی کے رول کے بعد تو اب میرا دل ہی نہیں کرتا عام رول کرنے کو۔"

"ماں کے جو رول آج کل دکھائے جاتے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟"

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ ان میں حقیقت نہیں ہوتی، ہوتی ہے مگر کم، کچھ عرصہ قبل میں نے ڈرامہ سیریل "گھاؤ" میں جس طرح کی ماں کا رول کیا تھا وہ بہت ہی خوب صورت تھا ایسی ماں کا رول کیا تھا جو بہت ہی محبت کرنے والی اور قربانیاں دینے والی ماں ہے۔ جس کو صحیح معنوں میں ماں کہتے ہیں۔ جس کی شکل میں ایک پاکیزگی ایک ٹھنڈک اور نور ہے۔ ایسی ماں کے رول مجھے بہت پسند ہیں۔"

"بُری مائیں بھی ہوتی ہیں مگر اچھی کا تناسب زیادہ ہے۔"

"بالکل ہم بہت کچھ غلط دکھا رہے ہیں اپنے ڈراموں میں اور چلو مان لیتے ہیں کہ معاشرے میں ایسا ہوتا ہے مگر پھر وہی تمہاری والی بات کہ آپ اچھائی کا تناسب زیادہ رکھیں۔ مزے کی بات یہ کہ گزشتہ دنوں میں نے تین سیریلز کیے اور تینوں ایک جیسے ہیں اور میں اکثر بھول جاتی تھی کہ کون سے کپڑے میں نے کس سیریل میں پہنے ہیں۔ ایک ڈرامے میں لڑکی گھر سے

فرار ہوئی تو پکڑی گئی خیال آیا کہ یہ سین تو میرے کسی اور ڈرامے میں بھی تھا۔ ایک لڑکی موٹر سائیکل پہ گئی تھی تو یہ سین تو کسی اور میں بھی ہو چکے ہیں۔ تو میں کہتی ہوں کہ ان چیزوں کو بدلنا چاہیے ورنہ ڈراموں کا حشر بہت خراب ہو جائے گا۔"

"تو ڈراموں کا معیار گرا ہے نا؟"

"میں یہ نہیں کہتی کہ بالکل ہی معیار گر گیا ہے۔ بہت اچھے اچھے ڈرامے بھی ہو رہے ہیں اور ہوتے ہیں، لیکن اکثریت میں دکھاتے ہیں کہ عورت کو مار مار کر اس کا حشر کر دو اس کے بچوں کو مارو میں نے دیکھا ہے کہ اب تو ہر ڈرامے میں چار بچے کھڑے ہوتے ہیں بغاوت کرنے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایسی کہانیوں سے چینل کی ریٹنگ بڑھتی ہے۔"

"جی ریٹنگ کے چکر میں تو ہر چینل رہتا ہے۔ آپ ٹاک شو دیکھ لیں اینکر سیاست دانوں کو "چٹکی" بھرتے ہیں اور بس لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔"

"دیکھیں ٹاپک تو بڑے اچھے اچھے لیے جا سکتے ہیں ترکش ڈراموں میں ——— "فاطمہ گل" یہ، ہم سب پاگل ہو گئے بس اتنی سی بات دکھائی گئی کہ لڑکی کا زیپ ہوا ہے اس کا عذاب کتنا دکھایا گیا ہے۔ اس کو انہوں نے چھوڑا نہیں تو آپ اس طرح کے ایشو دکھائیں۔ مگر ہمارے ڈراموں میں تو باقاعدہ ریپ ہوتا ہوا دکھایا جاتا ہے جو ایک شرمناک بات ہے۔"

"گھاؤ کے علاوہ کس رول کو بہت اچھا کہیں گی؟"

"ننھی کا رول بہت اچھا تھا۔ ننھی کے اسکرپٹ کا باقاعدہ مطالعہ کیا مگر یہ نہیں سوچا کہ اس کی ریہرسل کروں گی بلکہ یہ سوچا کہ ایسا ہونا چاہیے یا ویسا ہونا چاہیے۔ لیکن جب میں سیٹ پہ آئی اور گیٹ اپ کیا تو پتا نہیں پھر کیسے میرے اندر "شمو دائی" گھس گئی۔ اور جب تک یہ سیریل ریکارڈ نہیں ہو گیا میں نے بھی کچھ اور نہیں کیا کیونکہ میں نے اس کردار کو اپنے اوپر طاری کر لیا تھا۔"

"آج کل ڈائجسٹ کی رائٹرز بہت ڈرامے لکھ رہی ہیں ایک سینئر رائٹر نے کہا کہ میں ان کو لکھاری نہیں مانتا تو آپ کچھ کہیں گی اس بارے میں؟"

"اس میں کوئی برائی نہیں کہ اگر ڈائجسٹ کی لڑکیاں ڈرامے لکھ رہی ہیں دیکھیں ہم بچپن میں ڈائجسٹ پڑھتے تھے اور بچپن میں ہمارے ذہن میں ہیرو کا جو امیج بن چکا تھا وہ ڈائجسٹ کی رائٹرز نے ہی بنایا کہ سنہری فریم کی عینک لگا کر وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا اور پھر وہ سیم سوٹ کا بریف کیس لے کر اپنی کار سے اترا اور پھر وہ جو شرماتا لجاتا اور گھبراتا اور کزنز کے ساتھ بیٹھنا" تو ایسا لگتا تھا کہ اگر ایسا شخص ہمارے گھر آجائے گا تو ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا پھر تنگ چوڑی دار پاجامہ اور چکن کا سفید کرتا تو ہم سب ابھی تک ان ہی خیالوں میں ہیں۔ تو میں نہیں سمجھتی کہ اس میں کوئی برائی ہے ہر لڑکی ایسے سپنے دیکھتی ہے اور سپنے دیکھنا اس کا حق ہے تو میں تو یہ کہوں گی کہ ہماری ڈائجسٹ کی رائٹرز بہت اچھی ہیں۔ بس بات اسٹرونگ ہونی چاہیے، خواہ وہ ڈائجسٹ کی رائٹرز ہوں یا کوئی اور۔۔۔"

"جونیئرز کے دلوں میں آپ سینئرز کے لیے احترام ہے؟"

"میں تو بہت ہنستی ہوں اور کہتی ہوں کہ کراچی میں تو میرے اتنے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہو چکی ہیں کہ کیا بتاؤں ہر بچہ اور ہر بچی کو میں پیار کرتی ہوں۔ میں بچوں کو ڈانٹتی بھی ہوں مگر ڈکٹیٹر نہیں ہوں کہ رعب ڈالوں۔ کئی بچے بچیاں الگ بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگتے ہیں جبکہ میں چاہتی ہوں کہ ہمارے درمیان بیٹھیں اور بڑے بچے اور بچیوں سے میری دوستی ہے۔ بڑا پیار کرتے ہیں مجھ سے آپا آپا کر رہے ہوتے ہیں گانے کی فرمائش کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھ سے گائیڈنس لے رہے ہوتے ہیں کچھ بچے اپنے آپ کو سمجھتے ہیں تو میں کہتی ہوں کہ چلو کوئی بات نہیں۔ کچھ تو ایک ڈرامے کے بعد ہی اپنے آپ کو ٹاپ اسٹار

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمجھنے لگتے ہیں اور اس فیلڈ میں سب سے زیادہ پیار مجھے "سجل" سے ہے۔ بہت پیاری بچی ہے اور اس کے لیے اسی طرح سوچتی ہوں، جس طرح میں اپنی بیٹی کے لیے سوچتی ہوں وہ بڑے بے تکلف انداز میں مجھ سے کہتی ہے کہ "اسماعباس" کیسی ہو تم؟"

"اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں اور کتنے گیپ سے آپ آئی ہیں؟"

"بہت کم، لیکن جن میں میرے رول بہت اچھے ہوتے ہیں ان کو تو میں آدھی رات کو بھی اٹھ کر دیکھ لیتی ہوں..... اور میں 20 سال کے گیپ سے آئی ہوں۔ کیونکہ شادی کے بعد تو میں نے کام ہی نہیں کیا کیونکہ بچوں کی اور دیگر گھریلو ذمہ داریاں بہت تھیں۔"

"آپ لاہور سے آتی ہیں تو ضرورت لے کر آتی ہے آپ کو یا شوق؟"

"میں شوقیہ کرتی ہوں۔ پیسہ میرا پرابلم نہیں۔ میں لاہور سے کراچی آتی ہوں اور عام سا رول کروں یہ مجھے گوارا نہیں۔ تو جب میں نے اپنا شوق پورا کرنا ہوتا ہے تو پھر میں اپنی جوائس کا رول کیوں نہ کروں۔ مگر افسوس کہ جوائس کے رول ملتے بہت کم ہیں..... اسی لیے ایک آدھ رول ایسا بھی کر لیتی ہوں جو سب کر رہے ہوتے ہیں۔"

"بشریٰ اور آپ میں بہت مماثلت ہے۔ اس حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ ہے؟"

"لوگ تو اکثر بھول جاتے ہیں کہ کون بشریٰ ہے اور کون اسماء ہے۔ بشریٰ آپا بھی جب کبھی مصروف ہوتی ہیں اور اتفاق سے میں ان کے پاس ہوں اور کوئی آٹوگراف لینے آجائے تو کہتی ہیں کہ جاؤ تم دے آؤ میں ذرا مصروف ہوں اور میں جا کر دے بھی آتی ہوں، کسی کو پتا ہی نہیں چلتا۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"بہت کچھ کہہ دیا۔ بس لڑکیوں سے یہ کہنا چاہوں گی کہ اس فیلڈ میں رہیں لیکن اپنا گھر بھی ضرور بسائیں کہ یہ بہت ضروری ہے۔"

☆ ☆ ☆

اکبر شہباز ایف ایم۔100

"سر کیسے ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"کیسا چل رہا ہے آپ کا اسکول اور آپ کا ریڈیو ایف ایم 100؟"

"بہت اچھا چل رہا ہے ماشاء اللہ سے اب تو چار سال ہو گئے ہیں اور کافی لڑکے اور لڑکیاں ٹریننگ لے کر جا چکے ہیں اور ایف ایم بھی خوب چل رہا ہے۔"

"ایف ایم میں کتنے سال ہو گئے؟"

"یہی کوئی تقریباً" 17 سال ہو گئے ہیں۔ اب تو ریڈیو اور میرا اسکول میرا دوسرا گھر ہو گیا ہے جہاں جائے بنا چین ہی نہیں آتا۔"

"ریڈیو ایم ایف کے آغاز کے ساتھ ہی ہیں یا بہت بعد میں آئے آپ؟ اور کیا کشش لے کر آئی اس فیلڈ میں؟"

"ایف ایم ریڈیو کا آغاز 1995ء میں ہوا اور پہلا ایف ایم 'ایف ایم 100 تھا اور آصف غزالی مجھے اس فیلڈ میں لائے تھے اور کیا کشش لے کر آئی تو میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی کام کا جذبہ یا شوق خدا ہی ڈالتا ہے وہ ہی راستے دکھاتا ہے میں جب چھوٹا تھا تو مجھے ٹی وی پہ نیوز پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر یہ شوق تو شوق ہی رہا کیونکہ کبھی نیوز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"کیوں نہیں ملا..... کیا کوشش نہیں کی آپ نے؟"

"ہوا یہ کہ جب میں امریکہ ماس کمیونیکیشن کو پڑھنے گیا۔ تو مجھے براڈ کاسٹنگ کو پڑھنے کا بھی موقعہ ملا اور مجھے اس میں زیادہ مزہ آیا۔ تو جس کام میں زیادہ مزہ آتا ہے پھر اسی کو اپنانے کو بھی دل چاہتا ہے۔ تو بس ٹی وی کا خیال دل سے نکال کر ریڈیو کو جوائن کر لیا اور آج تک ریڈیو سے وابستہ ہوں۔"

"ایف ایم 100 تو 1995ء میں آیا اس سے پہلے کیا کرتے تھے آپ؟"

"ریڈیو سے تو میں بہت زمانے سے وابستہ ہوں۔ پہلے میں ریڈیو سے انگریزی میں پروگرام کیا کرتا تھا۔ ساتھ ہی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں بھی کام کیا اور کافی عرصہ کام کیا۔ ساتھ ہی روزانہ ایف ایم 100 پہ دو گھنٹے کام کرتا تھا۔ تقریباً" پندرہ سال میں نے یہ کام کیا۔"

"آپ نے ریڈیو کو بہت ٹائم دے دیا۔ اب خیال آتا ہے ٹی وی پہ جانے کا؟"

"بالکل خیال آتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں بہت جلد سوشل ایشوز پہ کوئی پروگرام کروں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک سوشل ایشوز پہ کوئی پروگرام نہیں ہوا۔"

"ہوں..... گڈ ان شاء اللہ آپ ٹی وی پہ آئیں گے تو آپ سے ایک اور اچھا سا انٹرویو کریں گے۔"

"کیوں نہیں انشاء اللہ۔"

جاناں ملک

"ہیلو کیسی ہیں؟"

"جی ٹھیک....."

"ڈراموں میں کم کم کیوں نظر آتی ہیں؟"

"نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی ڈرامہ اسکرین پہ آن ایر ہوتا ہی ہے۔ اور اچھا کردار ملتا ہے تو ضرور کرتی ہوں۔ اگر کبھی گیپ آتا بھی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ کردار میری پسند کا نہیں ہوتا۔"

"سنا ہے کہ آپ کو لاہور سے کراچی آنا بھی ایک مسئلہ لگتا ہے کیونکہ کراچی میں آپ کا دل نہیں لگتا؟"

"جی بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ واقعی کراچی میں میرا دل نہیں لگتا' میں ہمیشہ سے لاہور میں رہی ہوں۔ وہیں تعلیم بھی حاصل کی تو بس وہاں ہی میرا دل لگتا ہے۔ پھر کراچی کے حالات بھی ایسے ہیں کہ یہاں دل لگانا بہت مشکل ہے۔"

"فیملی لاہور میں ہی ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ کرن

اکتوبر 2013 کا شمارہ شائع ہوگیا

- "بیاہ محمود بابر فیصل"
- "جنید خان نیازی" سے شامین رشید کی باتیں
- "میری بھی سنئے" میں نور حسن کی گفتگو
- "مقابل ہے آئینہ" میں نمینہ اکرم کے دلچسپ جوابات
- نیا سلسلہ "باتیں ڈراموں کی"
- "مقابلہ ہے آئینہ" میں ایقہ انار دیرو
- فوزیہ یاسمین اور نبیلہ عزیز اپنی اقساط کے ساتھ
- اور بشریٰ سیال کے مکمل ناولز
- رخشندہ کوکب، لبنیٰ طاہر، صائمہ نصیر، ریحانہ احمد بخاری
- فرحت عمران، نفیسہ سعید کے ناولٹ
- مصباح نوشین، فرحین اظفر، سیدہ شازیہ فیاض، دیبا زسحر سلیم،
- حمیرا خان، ہمیرا غزل صدیقی، غل ہما، ۔۔۔۔ نیم کے افسانے
- اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

عید الاضحی کے پرمسرت موقع پر قاری بہنوں کے لیے گوشت کی تراکیب سے مزین کرن کتاب "عید الاضحی اسپیشل"

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ کرن کتاب علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

"جی بالکل..... میری ممالاہور میں ہی ہوتی ہیں اور ان کے بغیر زیادہ عرصہ کہیں رہنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اور جب شادی ہوگی تب؟"

"تب کی تب دیکھی جائے گی' ابھی تو فی الحال شادی کا بھی ارادہ نہیں ہے اور میرے ارادے سے تو کچھ ہوتا بھی نہیں' جب قسمت میں ہوگا ہو ہی جائے گی۔"

"کچھ ہی عرصہ قبل ختم ہونے والے ڈرامہ "اک تمنا لاحاصل سی" میں آپ کا کردار نگیٹو تھا۔ ایسے رول کر کے امیج خراب ہونے کا ڈر نہیں ہوتا کیا؟"

"نہیں کیوں امیج خراب ہوگا۔ میں کوئی سچ مچ تو ایسی ہوں نہیں' یہ تو ایک کردار تھا جو میں نے کیا اور آئندہ بھی اگر اچھے پاور فل رول ملے تو ضرور کروں گی۔"

"آج کل ترکی کے ڈرامے ہر چینل سے بڑے تواتر کے ساتھ دکھائے جا رہے ہیں۔ کیا یہ ہمارے ڈراموں کی جگہ لے سکتے ہیں؟"

"بالکل بھی نہیں لے سکتے۔ یہ تو وقتی ہے سب کچھ' آپ دیکھ لیجئے گا جس طرح بھارتی ڈراموں کا سحر ختم ہوا ہے یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ہمیشہ سے اپنے ڈرامے پسند کیے ہیں لوگوں نے اور ہمیشہ پسند کریں گے۔ چونکہ ترکی کے ڈرامے ذرا نئی بات ہے لوگوں کے لیے تو دیکھ لیتے ہیں۔ مگر ایک وقت آئے گا کہ لوگ ان ڈراموں کو رد کر دیں گے۔"

"فلم میں بھی کام کیا اور ٹی وی پہ بھی' دل چاہتا ہے کہ فلمی آرٹسٹ کہلاؤں؟"

"نہیں نہیں..... ایسا کچھ دل نہیں چاہتا..... فلمیں اچھی بنیں گی تو فلموں میں بھی کام کروں گی اور ڈراموں میں تو کر ہی رہی ہوں اور ٹی وی کو چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"کوئی ایسا سیریل جس کو چھوڑنے کا افسوس ہوا"

"ہاں تھوڑا افسوس ہے۔ سرمد سلطان نے "دل محلے کی حویلی" میں کام کرنے کی آفر دی تھی مگر میں مصروف تھی اس لیے نہ کر سکی۔"

آئینے کے سامنے

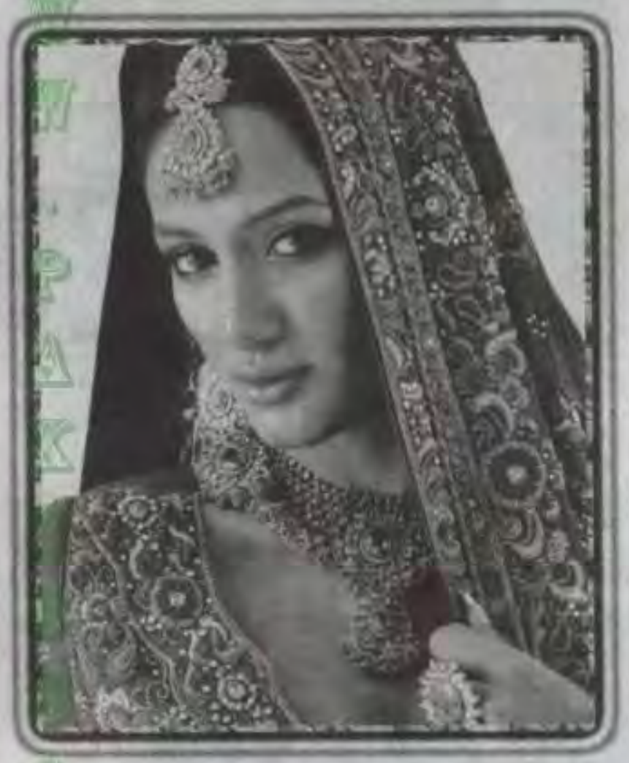

الٹا چور.....

فلم "میں ہوں شاہد آفریدی" نے جہاں اور بہت سے لوگوں کو فلم اشتہار ہونے کا ٹھپہ لگوایا ہے۔ وہیں کچھ لوگوں کی شخصیت کو متنازعہ بھی بنا دیا ہے۔ مثلاً" ماہ نور بلوچ۔ انہوں نے فلم میں اداکاری کے ساتھ ساتھ ایک آئٹم نمبر بھی کیا ہے۔ فلم کی ریلیز کے بعد اس آئٹم نمبر نے ماہ نور کے نمبر بڑھائے نہیں۔ بلکہ کم ہی کیے ہیں۔ ہر طرف سے ان پر تنقید شروع ہو گئی۔ شاہد آفریدی نے تو ایک ٹی وی شو میں برملا اعتراض جڑ دیا کہ ان کے نام پر بننے والی فلم میں ایک "بزرگ اداکارہ" سے آئٹم نمبر نہیں کرانا چاہیے تھا۔ (گویا شاہد آفریدی کو آئٹم نمبر پر اعتراض نہیں۔ بلکہ "بزرگ اداکارہ" پر اعتراض تھا۔) اس فلم میں متیرا نے بھی آئٹم نمبر کیا ہے۔ وہی متیرا جو اپنے کام سے نہیں۔ بلکہ اپنی بے باکی کی وجہ سے زیادہ پہچانی جاتی ہیں۔ تاہم اس فلم میں متیرا پر کسی نے توجہ نہ دی۔ کیونکہ ساری توجہ تو ماہ نور بلوچ سمیٹ لے گئیں۔ یہاں تک کہ وہ ہالی ووڈ بھی جا پہنچیں۔ متیرا نے جب دیکھا کہ ان پر کوئی توجہ ہی نہیں دے رہا تو انہوں نے دینا اور میرا کی پالیسی اپنائی۔ ارے! وہی معروف "جھٹ بے تکا بیان دو پالیسی۔" اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے متیرا نے جھٹ ایک عدد بے تکا بیان دے ڈالا کہ

"شاہد آفریدی فلم سے آئٹم سانگ نکلوانا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اپنا آئٹم سانگ ختم نہیں ہونے دوں گی۔"

بلکہ متیرا تو شاہد آفریدی کے اعتراض پر اتنی چراغ پا ہوئیں کہ انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ

"شاہد آفریدی کے اس مطالبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دماغ میں خلل ہے۔"

(لو کر لو گل۔ اسے کہتے ہیں۔ "الٹا چور" کوتوال کو ڈانٹے۔ اور ویسے بھی متیرا بی بی! شاہد آفریدی نے اصل اعتراض تو آئٹم سانگ ایک "بزرگ خاتون" سے کرانے پر اعتراض کیا تھا۔ آپ پر اعتراض کون کرے گا۔ سانپ کے کاٹنے پر اعتراض کون کرتا ہے بھلا۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ یہ اس کا کام ہے۔ ہاں! اس سے بچاؤ کی تدابیر سب ہی کرتے ہیں۔ سو جس کو اس زہر سے بچنا ہے۔ وہ بچاؤ کی کوئی تدبیر خود ہی اختیار کر لے گا۔ تینوں کی متیرا جی! تسی اپنا کام رج کے کیے جاؤ۔)

WWW.PAKSOCIETY.COM

فراغت

آج کل اتنی دوڑتی بھاگتی مصروف زندگی ہے کہ ہر شخص کسی مشین کی مانند زندگی گزار رہا ہے۔ ایک شاعر صاحب تو اس مصروفیت سے اس قدر جھلائے کہ اپنے محبوب تک سے کہہ اٹھے۔

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

اب یہ نہیں معلوم کہ محبوب پر ان کی دھمکی کا اثر ہوا یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا کہ لوگوں کے پاس فراغت کی کس قدر کمی ہے۔

معروف اداکار علی ظفر نے جب سے شوبز کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ کبھی فارغ بیٹھنے کا نام نہیں لیا۔ ٹی وی ڈراموں سے کیریر کا آغاز کیا۔ وہاں سے تھوڑا نام ملا تو گلوکاری کرنے لگے۔ مصوری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ قدرت نے اس فن میں صلاحیتیں بھی دے رکھی تھیں۔ سو گلوکاری کرکے بھی کچھ وقت بچ گیا تو مصوری کرنے لگے اور اتنے کامیاب ہوئے کہ ایک معروف فائیو اسٹار ہوٹل میں آنے والے لوگوں کے پورٹریٹ بنا بنا کر خاصے پیسے اکٹھے کرلیے۔ پھر ان ہی پیسوں سے اپنی پہلی میوزک البم بھی بنا ڈالی۔ پاکستان میں کام تھوڑا مندا ہوا تو موصوف بالی ووڈ جا پہنچے۔ بھارت میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ فلموں میں کام بھی مل گیا۔ پہلی فلم کی کامیابی کے بعد مزید فلمیں بھی مل گئیں۔ اب تو علی ظفر گوڈے گوڈے کام میں مصروف ہوگئے۔ اتنے کہ پاکستان آنے اور جانے میں بھی وقت ضایع کرنے کے روادار نہ تھے۔ سو ممبئی میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ اور وہیں کے ہو رہے۔

مگر اب وہی علی ظفر جو وقت ضایع کرنے کو زندگی ضایع کرنے کے برابر سمجھتے تھے۔ ایک سماجی ویب سائٹ "ٹوئٹر" پر ہر آن اپنے مداحوں کو دست یاب ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے مداحوں سے باتیں ہی کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے ٹوئٹر پر براہ راست فرمائشی پروگرام بھی شروع کر رکھا ہے۔ علی ظفر کے مداح ان سے گانوں کی فرمائش کرتے ہیں اور علی ظفر انہیں وہ گانے اسی وقت خود گا کے سناتے ہیں۔ (ایں! یہ فرمائشی پروگرام ہے یا کوئی سزا؟)

علی ظفر کے اس اقدام سے لوگ تشویش میں مبتلا ہوگئے ہیں (حسب عادت) کہ علی ظفر کے پاس اتنا وقت کہاں سے آگیا۔ انہیں شوبز میں کام ملنا بند ہوگیا ہے یا پھر انہوں نے شہرت کی چھنو کی آنکھ کا نشہ خود پر سوار نہیں ہونے دیا اور وہ اپنے مداحوں سے براہ راست رابطہ کرکے ان سے جڑے رہنا چاہتے ہیں۔

(بھئی علی! تشویش میں مبتلا ان پڑوسنوں کو اپنے گھر کا راز دے ہی دیں اب۔ آخر کب تک انہیں تشویش میں مبتلا کیے رکھیں گے۔)

ملکۂ حسن

ایک بہت پرانی اور مشہور کہاوت ہے کہ "اندھا بانٹے ریوڑیاں" وہ بھی اپنوں اپنوں کو۔" اس کا عملی مظاہرہ گزشتہ دنوں دیکھنے میں آیا۔ جب کراچی کے ایک مقامی ہال میں فلم اور ٹی وی سے تعلق رکھنے والی فنکاراؤں میں انوکھے ایوارڈز تقسیم کیے گئے۔ انوکھے

اس لحاظ سے کہ یہ ایوارڈ ان فنکاراؤں کو ان کے فن کے حوالے سے نہیں۔ بلکہ ان کی خوب صورتی پر دیے گئے۔ کسی کو بہترین جلد پر تو کسی کو دلکش مسکراہٹ پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بہترین انداز پر بھی ایوارڈ تھا۔

تاہم ان ایوارڈز میں اخلاق اور عقل نام کی کوئی کٹیگریز نہ تھیں۔ (یہ چیزیں ہوتیں تو ہی کٹیگریز ہوتیں نا۔۔۔ نہ فنکاراؤں میں نہ ہی منتظمین میں۔)

عمیمہ ملک نے جب سے فلم "بول" کی ہے۔ تب سے ہر طرف ان کا بول بالا ہی ہوگیا ہے۔ اور آمنہ شیخ کے تمام ارمان ری میک فلم "ارمان" کرنے کے بعد پورے ہو رہے ہیں۔ شاید اسی لیے آمنہ شیخ کو بہترین فوٹو جینک ماڈل قرار دیا گیا۔ (منتظمین نے غلطی سے "فوٹو جن" کو فوٹو جینک اور "ماں ڈل" کو ماڈل کہہ دیا ہوگیا۔ آخر کو انسان ہی تو ہیں بے چارے۔) عمیمہ ملک سب پر سبقت لے گئیں۔ یعنی اس شو کا سب سے اہم ایوارڈ وہ لے اڑیں۔ جی ہاں! عمیمہ کو "ملکۂ حسن" قرار دے دیا گیا۔

(شکر ہے کہ یہ مقابلہ صرف فنکاراؤں ہی کے درمیان تھا۔ ورنہ ہم تو صدمے کے مارے کوچ کر گئے ہوتے۔ ویسے ہم نے بزرگوں سے سنا تھا کہ حسن تو دیکھنے والی آنکھ میں ہوتا ہے۔ مگر جناب! بزرگ گئے تو شاید اپنا زمانہ بھی ساتھ ہی لے گئے۔ اسی لیے اب حسن نہ تو چہرے پر ہوتا ہے اور نہ ہی دیکھنے والی آنکھ میں کہ یہ تو اب صرف اور صرف "پی آر" ہی میں ہوتا ہے۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ کراچی میں ایکسپریس ٹی وی پر فائرنگ کی گئی تو سی پی این ای کے احتجاجی اجلاس میں جرأت کے ایڈیٹر مختار عاقل نے اخبارات کے مدیروں اور مالکان کے رویے پر کہا۔

"میں ایک اخبار شائع کر رہا ہوں۔ اس کا نام "مقامی اخبار" ہوگا اور ایک چینل شروع کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا نام نجی ٹی وی ہوگا۔ اس کے بعد کسی حادثے کی صورت میں اخبارات متاثرہ اخبار یا چینل کا نام لکھیں گے۔ "نجی ٹی وی" اور "مقامی اخبار" لکھنا چھوڑ دیں گے۔"

(مظفر اعجاز۔۔۔ قلم رو)

☆ اس عمر میں اپنے آبائی وطن اور اپنے گھر سے بچھڑنا دنیا کی بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ بے شک آپ لوڈشیڈنگ کے باعث تاریکی میں حیات کریں۔ باہر نکلیں تو کسی بم دھماکے میں پرخچے اڑ جائیں۔ مہنگائی جان لیوا ہو، پھر بھی فلوریڈا کی جنت اور نیویارک کے گلزار سے اپنا جہنم اچھا ہے۔ یہ ہمارا اپنا پرائیویٹ جہنم تو ہے۔

(مستنصر حسین تارڑ۔۔۔ کارواں سرائے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

سنجوگتا' پرتھوی راج

دلی کی حکومت 8ء خاندان ترنور سے خاندان چوہان میں منتقل ہوئی۔ خاندان چوہان کے ساتویں بادشاہ کا نام رائے پتھورایا پرتھوی راج تھا۔ وہ ہندوستان کا آخری ہندو بادشاہ ٹھہرا اور اس کی بیوی سنجوگتا ہندوستان کی آخری ہندو ملکہ بنی۔

سنجوگتا دلی کی ہمسایہ ریاست قنوج کے راجہ جے چند راٹھور کی بیٹی تھی۔ جے چند کی پرتھوی سے سخت دشمنی چلی آرہی تھی۔ باپ پرتھوی کا سخت دشمن تھا اور سنجوگتا پرتھوی پر جان دیتی تھی۔ لیکن سنجوگتا نے پرتھوی کو دیکھا نہیں تھا' البتہ اس کی شجاعت و بہادری کے بہت سے کارنامے سن رکھے تھے۔ ان ہی کارناموں نے سنجوگتا کو پرتھوی کا دیوانہ بنا رکھا تھا' لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ اسے کبھی نہیں پاسکے گی۔

سنجوگتا کو اپنے باپ سے بات کرنے کی ہمت تو نہ ہوئی' لیکن اس نے اپنی ان دیکھی چاہت کی بابت اپنی ماں کو آگاہ کیا اور ان سے مدد کی درخواست کی۔ قنوج کی مہارانی ہونے کے ناتے وہ بھی پرتھوی کو اپنا دشمن سمجھتی تھی' لیکن ماں ہونے کے ناتے اس نے راجہ سے پرتھوی اور سنجوگتا کے رشتے کی بات کی۔ راجہ بات سنتے ہی بھڑک اٹھا اور کہا۔

"بھگوان کی سوگند' میں سنجو کو اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں گا' مگر پرتھوی سے اس کی شادی نہیں کروں گا۔"

لیکن مہارانی نے پھر ہمت کرکے کہا۔ "ایک نہ ایک دن ہم نے سنجوگتا کو اپنی دہلیز سے رخصت کرنا ہی ہے۔ رہ گئی دشمنی کی بات تو پرکھوں سے روایت چلی آرہی ہے کہ بیٹیاں لے کر یا دے کر دشمنیاں ختم کی جاتی رہی ہیں۔ اگر ہم بھی ایسا کرلیں گے تو کوئی انہونی نہیں ہوگی۔"

راجہ نے جواب میں کہا کہ "اگر تم میری بیوی نہ ہوتیں تو تمہیں بتا دیتا کہ ہونی اور انہونی میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

مہارانی نے اپنی بیٹی کو اس کے باپ کے ردعمل سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ پرتھوی کا خیال دل سے نکال دے۔ جب پرتھوی کو سنجوگتا کی محبت کی خبر ملی تو اس نے اس کی محبت کی قدر کی اور اس سے بالواسطہ رابطہ کیا اور اسے یقین دلایا کہ اس کی آن کی سوگند' وہ اسے اپنی رانی بنا کر چھوڑے گا۔

راجہ جے چند ان معاملات سے بے خبر ہونے کے باوجود بحیثیت باپ فکرمند ضرور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سنجوگتا ایک ضدی اور ہٹ دھرم لڑکی ہے اور اگر اس نے پرتھوی کو حاصل کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ لیا تو کسی نہ کسی طور پر عمل بھی کر گزرے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے طور پر اس معاملے سے نمٹنے کی تدابیر شروع کردیں۔

اتفاق کی بات یہ تھی کہ قنوج کے راجہ کی حیثیت سے اس نے اکثر ہمسایہ ریاستوں کے راجاؤں کو شکست دے کر انہیں اپنے زیر اثر کرلیا۔ اس خوشی میں اس نے ایک جشن عظیم کا اہتمام کیا۔ جسے ہندو "راج سوجگ" کا نام دیتے ہیں۔ اس جشن میں دور اور نزدیک کے راجاؤں کو دعوت عام دی جاتی۔ اس دعوت میں میزبان مہمانوں کی خدمت خود اپنے ہاتھوں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرتا اور جواب میں وہ راجہ کی اطاعت قبول کر لیتے۔
جشن کے ایک حصے کے طور پر سنجوگتا کے لیے سوئمبر یعنی دولہا چننے کے مقابلے کا بھی اہتمام کر ڈالا۔ تاکہ ایک طرف تو دنیا کا سب سے بڑا راجہ بن جائے گا اور دوسری طرف سنجوگتا اور پرتھوی کی محبت کی صورت میں لاحق خطرے سے نجات حاصل کر لے گا۔ لیکن سنجوگتا نے جشن میں اعلان کیا کہ وہ پرتھوی کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ راجہ کو بیٹی کی وجہ سے بہت شرمندگی ہوئی۔ اس نے بیٹی کو محل سے نکال کر ایک حویلی میں بند کر دیا۔ جب پرتھوی کو اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے سنجوگتا کو قید سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے درباری چندر بھاٹ نے منصوبے کے تحت جے چند کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ یہاں تک کہ اسے سنجوگتا سے ملنے کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس نے راج کماری کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ قنوج کے چند فوجیوں کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور راج کماری کو لے اڑا۔ جے چند نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن اس وقت تک پرتھوی بھی قنوج کی سرحد تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے سنجوگتا کا والہانہ استقبال کیا۔

جے چند اور پرتھوی کے درمیان جنگ ہوئی۔ سنجوگتا نے پرتھوی کا پورا پورا ساتھ دیا اور باپ کے خلاف تلوار سونت کر مقابلہ کیا۔ فتح سنجوگتا اور پرتھوی کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی۔ سنجوگتا اب گھوڑے پر پرتھوی کے ساتھ سوار تھی۔ راجہ کی فوج نے اس کا برا پیچھا کیا۔ مگر محبت کی رفتار فوجوں کی رفتار سے کہیں زیادہ تھی۔ جے چند نے کچھ دور تک تعاقب کیا۔ مگر حوصلہ ہار گیا۔ پرتھوی سنجوگتا کو محل میں لا کر اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ دلی پہنچ کر پرتھوی راج نے سنجوگتا کے ساتھ سات پھیرے لیے اور اسے اپنی ملکہ بنا کر عیش و عشرت میں ایسا مشغول ہوا کہ نظام سلطنت سے غافل ہو گیا۔ سنجوگتا بھی پرتھوی کو پا کر دنیا بھلا بیٹھی۔

پرتھوی کی سلطنت سے غفلت کی خبریں شہاب الدین غوری تک بھی پہنچ گئیں۔ جو اس وقت غزنی کا بادشاہ تھا۔ ادھر جے چند نے بھی اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ پرتھوی کا یہ حال تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی بھی اس کی اور سنجوگتا کی خلوت میں دخل نہ دے اور نہ ہی کوئی ناخوش گوار خبر اس کی رانی کے گوش گزار کی جائے۔ لیکن غوری کی سیاہ سلطنت کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ پرتھوی کے درباری چندر بھاٹ نے جو پرتھوی کا ہمراز و ہم نیاز بھی تھا اور سنجوگتا کا بھی مزاج آشنا تھا۔ سنجوگتا کو حالات سے خبردار کیا۔ اس نے چندر بھاٹ کو ملنے کی اجازت دے دی۔ سنجوگتا نے وقت کی نزاکت کو سمجھا اور پرتھوی کو غوری کی صورت میں آنے والے طوفان سے باخبر کیا۔ لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا۔
غوری نے گزشتہ شکستوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نئی حکمت عملی مرتب کی۔ اختلاف رائے کے مطابق یہ غوری کا آٹھواں حملہ تھا۔ پرتھوی کو امید تھی کہ وہ اس بار بھی غوری کو شکست دے گا اور وہ تھوڑا سا لشکر لے کر تراوڑی یا ترائن کے مقام پر پہنچ گیا۔ راجہ جے چند ہر جنگ میں اس سے پہلے غوری کے خلاف پرتھوی کا حلیف تھا۔ لیکن اب وہ غوری کے ساتھ تھا۔ پرتھوی اس جنگ میں مارا گیا۔ اس طرح پرتھوی ہندوستان کا آخری ہندو حکمران ثابت ہوا اور اس کی بیوی سنجوگتا ہندوستان کی آخری ہندو ملکہ بنی۔
پاکستان کے نامور ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اس بارے میں تحقیق کی اور شہاب الدین غوری کی قبر تلاش کر کے اس کا مقبرہ بنوایا۔ پاکستان کے پہلے ایٹمی میزائل کا نام غوری رکھ کر بھارت پر ثابت کر دیا کہ جنگ ترائن دوبارہ بھی دہرائی جا سکتی ہے۔

آسیہ نورین۔۔۔ صادق آباد

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کچے گوشت کی بریانی

اجزا :

گائے کا گوشت (بغیر ہڈی)	1/2 کلو
باسمتی چاول	1/2 کلو
نمک	حسب ذائقہ
لیموں (رس نکال لیں)	4 عدد
لہسن ادرک پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی)	7 عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	1 گٹھی
تیزپات	1 عدد
پودینہ (باریک کٹا ہوا)	1 گٹھی
سیاہ زیرہ	1/2 چائے کا چمچہ
ٹماٹر	5 عدد
دہی	2 کپ
ثابت گرم مسالا	1 کھانے کا چمچہ
پیپتا پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
گرم مسالا یا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
کیوڑہ	حسب پسند
زردے کا رنگ	1 چٹکی
سفید زیرہ	1 چائے کا چمچہ
پیاز (سلائس کاٹ کر براؤن کر لیں)	5 عدد درمیانہ

ترکیب :

ایک برتن میں گوشت، دہی، نمک، لیموں کا رس، ہری مرچیں، گرم مسالا پاؤڈر، چھوٹی الائچی پاؤڈر، زیرہ براؤن کی ہوئی پیاز، ہرا دھنیا، پیپتا پیسٹ، پودینہ، ٹماٹر، ادرک، لہسن پیسٹ ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔
ایک الگ دیگچی میں پانی میں نمک، گرم مسالا ثابت، تیزپات، سیاہ زیرہ اور چاول ڈال دیں۔ دو کنی رکھ کر پانی نتھار لیں۔
اب ایک بڑی دیگچی میں تیل گرم کریں اور مسالا لگا ہوا گوشت ڈال کر 5 منٹ پکائیں۔ پھر ابلے ہوئے چاول اوپر سے پھیلا دیں۔ پھر زردے کا رنگ دودھ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

مکس کرکے اوپر سے ڈال دیں۔ آخر میں کیوڑہ چھڑک کر اس طرح ڈھانپ کر دم پر رکھیں کہ بھاپ باہر نہ نکلنے پائے۔ آدھا گھنٹے بعد پلیٹ سے مکس کرکے اتار لیں۔ لذیذ کچے گوشت کی بریانی تیار ہے۔

مٹن ہرا مسالا

اجزا :

بکرے کا گوشت	1کلو
تیل	1پیالی
دہی	1پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن ادرک پیسٹ	2چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	1چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	1گٹھی
ہری مرچ	6عدد
پیاز (درمیانہ سائز)	1عدد
ادرک	سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

سب سے پہلے ایک دیگچی میں تیل گرم کریں۔ اب اس میں پیاز ڈال کر ہلکا براؤن کرلیں۔ پھر پیاز نکال کر ایک طرف اخبار کے اوپر رکھ دیں تاکہ زائد تیل جذب ہو جائے۔ اب بچے ہوئے تیل میں گوشت اور ادرک لہسن پیسٹ اور نمک ڈال کر اچھی طرح بھون لیں پھر تھوڑا پانی ڈال کر گلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ اب ہرا دھنیا اور ہری مرچ کو دہی کے ساتھ گرائنڈ کرلیں۔ جب گوشت آدھا گل جائے تو اس آمیزے کو گوشت میں شامل کردیں۔ گوشت گلنے سے تھوڑا پہلے تلی ہوئی پیاز چورا کرکے اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ جب تیل چھوڑ دے تو تیار ہے۔ ڈش میں نکال کر باریک کٹی ہوئی ادرک سے سجادیں۔

بیف پسندے کباب

اجزا :

پسندے	1کلو
دہی	1کپ
لیموں کا رس	1کھانے کا چمچہ
کباب چینی (پسی ہوئی)	1کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسی ہوئی لال مرچ	1چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	1/2چائے کا چمچہ
پپیتا (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ پاؤڈر	1چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا (کٹا ہوا)	1کھانے کا چمچہ

ترکیب :

پسندوں میں تمام مسالے اچھی طرح مکس کرکے تین سے چار گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد سیخوں میں پرو کر کوئلے پر سینک لیں۔ اس دوران پسندوں پر برش کی مدد سے تیل لگاتی جائیں۔ اچھی طرح سرخ ہونے پر ڈش میں نکال لیں۔ مزید اریف پسندے کباب تیار ہیں۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ گرما گرم سرو کرکے عید کا مزہ دوبالا کریں۔

مایونیز قیمہ

اجزا :

مایونیز	آدھا کپ
قیمہ (باریک)	آدھا کلو (بکرے یا گائے کا)
دہی	4کھانے کے چمچ
لہسن کا پیسٹ	1کھانے کا چمچ
ادرک کا پیسٹ	1کھانے کا چمچ
چھوٹی الائچی	6دانے
تیزپات کا پتہ	2عدد
لونگ	4عدد
کالی مرچ (ثابت)	4دانے
دار چینی	1ٹکڑا
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
گرم مسالا (پاؤڈر)	آدھا چائے کا چمچ
ہری مرچ	4عدد (درمیانہ سائز)
پیاز	2عدد (درمیانہ سائز، باریک
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
کوکنگ آئل	آدھا کپ

ترکیب :

کڑاہی میں تیل گرم کرکے لہسن ادرک کے پیسٹ کو اچھی طرح بھون لیں۔ اب اس میں قیمہ ڈال کر مزید 5منٹ بھونیں۔ اس کے بعد باقی تمام خشک مسالا جات شامل کرکے 10منٹ تک بھونیں۔ اب دہی اور تمام ہرا مسالا (ہری مرچ، پیاز اور ہرا دھنیا) ڈال کر 5منٹ تک مزید پکائیں۔ آخر میں مایونیز شامل کرکے 5منٹ تک بھون کر کچھ دیر دم پر رکھ دیں، لیجیے مایونیز قیمہ تیار ہے۔

(ثوبیہ کوثر)

کیریمل فیرنی

اجزا :

دودھ	2کلو
چینی	1پاؤ
کارن فلور	2کھانے کے چمچے
کھویا	1/2پاؤ
عرق گلاب	1کھانے کا چمچہ
بادام پستہ	سجاوٹ کے لیے
چاندی کے ورق	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک ساس پین میں دودھ ڈال کر اتنا پکائیں کہ وہ ایک کلو رہ جائے۔ تین کھانے کے چمچے چینی علیحدہ نکال لیں۔ باقی چینی دودھ میں شامل کرکے پکائیں۔ ایک فرائنگ پان میں ہلکا سا گھی لگا کر علیحدہ نکالی گئی چینی کو ہلکی آنچ پر پکالیں۔ جب براؤن رنگ کی شکل ہو جائے تو کیریمل تیار ہے اس کو دودھ میں شامل کردیں اس کے بعد کھویا اور تھوڑے سے دودھ میں کارن فلور مکس کرکے ڈالیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو عرق گلاب شامل کرکے اتار لیں۔ بادام پستے اور چاندی کے ورق سے سجا کر مہمانوں کو پیش کریں۔

خوبانی کا میٹھا

اجزا :

خوبانی	ایک پاؤ
کریم	1کپ
کنڈینسڈ ملک	1کپ
چینی	1کپ
جیلاٹن	1 1/2کھانے کا چمچہ
پانی	1/4کپ

ترکیب :

خوبانی کو پانی اور چینی میں شامل کرکے پکالیں پھر اس کے بیج نکال کر گرائنڈ کرلیں۔ جیلاٹن کو گرم پانی میں حل کرلیں۔ اب ایک باؤل میں کنڈینسڈ ملک کو بیٹر سے اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر اس میں خوبانی پیوری ڈالیں اور دوبارہ پھینٹیں پھر کریم بھی شامل کریں اور خوب پھینٹیں۔ آخر میں جیلاٹن ڈال کر پھینٹ لیں۔ پھر سرونگ باؤل میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ سرو کرنے سے پہلے چیری اور کریم سے سجادیں۔

*

WWW.PAKSOCIETY.COM

ادگرد

عید کے موقع پر نیل آرٹ سے ناخن سجائیں

عید کا موقع ہو اور خواتین کی سج دھج نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لباس، میک اپ اور ہیئر اسٹائل کے ساتھ ساتھ اگر ناخنوں کی سجاوٹ پر بھی توجہ دے دی جائے تو سج دھج نرالی ہو جاتی ہے۔ ماضی میں ناخنوں کو لباس کی ہم رنگ نیل پالش سے رنگ کے ان کا سنگھار مکمل سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج کل ناخنوں پر مختلف دیدہ زیب ڈیزائن بنا کر انہیں سجایا جا رہا ہے۔ اس طریقہ کو "نیل آرٹ" کا نام دیا گیا ہے۔ آج ہم آپ کو نیل آرٹ کا سادہ اور آسان ترین طریقہ بتا رہے ہیں۔ جس کے ذریعے آپ اپنے ناخنوں کو سجا کر اس بقر عید پر سب سے نمایاں نظر آسکتی ہیں۔

☆ سب سے پہلے لباس کے رنگ کی مناسبت سے دو یا تین رنگوں کی نیل پالش منتخب کریں۔

☆ ناخنوں کو چھوڑ کر اپنی تمام انگلیوں پر وسلین لگا لیں۔ ناخنوں کے اردگرد ذرا زیادہ لگائیں۔ تاکہ اس جگہ نیل پالش نہ لگ سکے۔

☆ پھر ناخنوں پر ہلکے رنگ کی نیل پالش لگائیں۔ ہلکے سلور رنگ کا شائننو لگا لیں تو زیادہ بہتر ہے۔

☆ اب ایک نیل پالش کے چند قطرے پانی کی سطح پر ٹپکا دیں۔ پھر دوسرے رنگ کی نیل پالش کے چند قطرے اسی نیل پالش کے قطروں کے اوپر یا برابر میں ٹپکا دیں۔ تیسرا رنگ بھی شامل کرنا چاہیں تو تیسرے رنگ کی نیل پالش کے قطرے بھی ٹپکا دیں۔ نیل پالش کے قطرے ٹپکاتے وقت خیال رہے کہ قطرے پانی پر قریب سے اور آہستہ سے ٹپکائیں۔ کیونکہ اگر آپ نے قطرے پانی کی سطح سے دور سے اور زور سے ٹپکائے تو وہ قطرے پانی کی تہہ میں چلے جائیں گے۔ جبکہ آپ کو نیل پالش کو پانی کی سطح پر ہی رکھنا ہے۔

☆ اب ٹوتھ پکس (خلال)، موٹی سوئی یا کسی تنکے کی مدد سے نیل پالش کے قطروں کو احتیاط سے کسی ڈیزائن کی شکل دے لیں۔ آپ جو ڈیزائن بنانا چاہیں، بنا سکتی ہیں۔ ڈیزائن بناتے وقت یہ خیال رکھیں کہ تمام رنگوں کی نیل پالش اپنے الگ الگ رنگ میں نمایاں نظر آئیں۔

☆ اب ایک انگلی کے ناخن کو پانی کی سطح پر رکھ دیں۔ خیال رہے کہ ناخن ڈیزائن پر بالکل سیدھے رکھیں۔ تاکہ آپ کا ڈیزائن ناخن پر اسی طرح آئے۔ جس طرح آپ چاہتی ہیں۔ چند سیکنڈ بعد انگلی سیدھی رکھتے ہوئے احتیاط سے اٹھا لیں۔ یہی عمل ہاتھ کی بقیہ انگلیوں کے ساتھ بھی کریں۔ یہاں تک کہ آپ تمام انگلیوں کے ناخنوں پر "نیل آرٹ" بنا لیں۔ آپ کو ہر مرتبہ ڈیزائن نئے سرے سے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بار ڈیزائن بنانے کے بعد یہ تمام انگلیوں کے لیے کافی رہے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM